زن، زر اور زمین کے تنازعوں میں جنم لینے والے
پھندہ
مرزا امجد بیگ (ایڈووکیٹ)

جب بھی شارع فیصل کی طرف جانا ہوتا، میں اپنے ایک دیرینہ دوست سے ملنے کے لئے ڈیوٹی فری شاپ میں ضرور جھانک لیتا۔ اجمل بٹ میرا انتہائی بے تکلف دوست تھا اور ان دنوں وہ ڈیوٹی فری شاپ میں بطور سپروائزر کام کر رہا تھا۔ میل ملاقات کے اسی بہانے اگر شاپ میں رکھی کوئی ضرورت کی من پسند چیز مجھے نظر آ جاتی تو اجمل کی مہربانی سے انتہائی ڈسکاؤنٹ پر میں اسے خرید لیتا۔ اوپن مارکیٹ میں اول تو ایسے منفرد آئٹمز دستیاب نہیں ہوتے اور اگر اکا دکا کہیں دکھائی بھی دیں تو دکان دار گاہک کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے منہ مانگے دام وصول کرنے کے چکر میں رہتا ہے۔

اس روز میں شاپ میں داخل ہوا تو پہلی نظر اجمل پر ہی پڑی۔ وہ اپنے عملے کے ایک فرد کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھ سے نگاہ ملی تو وہ اس شخص کو نمٹا کر میری طرف مڑا۔

''آؤ بیگ.... آؤ یار! اس وقت اگر میں اللہ سے کچھ اور بھی مانگتا تو مجھے ضرور مل جاتا۔''

ان الفاظ کے ساتھ اس نے بڑی گرم جوشی سے مجھ سے مصافحہ کیا۔ میں نے بھی جواباً بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یار بٹ! اللہ سے مانگنے کا تمہارا انداز بڑا عجیب و غریب ہے۔''

''کیا مطلب؟'' اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

میں نے مذاق کی بات کو سنجیدگی کا لبادہ اوڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یار بٹ! میں نے تو تمہیں ایک ملازم کو ڈانٹ پھٹکار کرتے دیکھا اور تم کہہ رہے ہو، اللہ سے کوئی خاص شے مانگ رہے تھے۔ یہ کیا ماجرا ہے؟'' ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ بھی بتاؤ، تم ان لمحات میں اللہ سے کیا مانگ رہے تھے؟''

وہ مجھے، اپنے لئے مخصوص جگہ پر لے آیا جہاں اس کی کرسی، میز لگی ہوئی تھی۔ وہ اپنی سیٹ پر بیٹھا اور مجھے بھی اپنے سامنے بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا پھر بولا۔ ''یار بیگ! مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔ پہلے یہ بتاؤ، ٹھنڈا چلے گا یا گرم؟''

ان دنوں جنوری اپنے اختتام پر تھا۔ میں نے کہا۔ ''موسم ٹھنڈا ہے اس لئے گرم چلے گا۔''

اس نے ایک ملازم کو اچھی سی چائے بنانے کے لئے کہا پھر میری طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کے بولنے سے پہلے ہی میں نے کہا۔ ''یار بٹ! تم نے میرے سوالوں کا جواب نہیں دیا؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''میں اکثر بھول جاتا ہوں کہ تم میرے بے تکلف دوست ہونے کے علاوہ ایک کامیاب وکیل بھی ہو۔ جب تک میں تمہاری بات کا جواب نہیں دوں گا، تم سنجیدگی سے میری ایک نہیں سنو گے۔''

''سمجھ دار کے لئے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔'' میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اور بٹ! تم تو ماشاء اللہ! اتنے سمجھدار ہو کہ تمہیں کسی اشارے کی بھی ضرورت نہیں۔''

اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور بولا۔ ''شیراز کو چند دن پہلے شاپ پر رکھا ہے۔ پتہ نہیں قدرت نے اس کی کھوپڑی میں کیسا دماغ رکھا ہے۔'' اس کا اشارہ غالباً اس شخص کی طرف تھا جسے میری آمد سے قبل وہ ڈانٹ ڈپٹ کر کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا۔ ''میں اس وقت تمہیں بڑی شدت سے یاد کر رہا تھا اور تم آ گئے۔ اسی لئے میں نے کہا، اگر میں اللہ سے کچھ اور بھی مانگتا تو ......''

''یار بٹ! مجھ پر اب اتنا برا وقت بھی نہیں ہے۔'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''آخر تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔ میں وکیل ہوں، کوئی گھسیارا نہیں۔''

میں نے یہ مکالمے اتنی سنجیدگی اور سختی سے ادا کئے تھے کہ وہ ہکا بکا میری صورت دیکھتا رہ گیا۔ ایک لمحے کے توقف سے اس نے حیرانی سے استفسار کیا۔ ''یار بیگ! میں نے تمہیں ایسا کیا کہہ دیا جس پر اس قدر خفا ہو رہے ہو؟''

''تم نے بات ہی ایسی کی ہے بٹ!'' میں نے اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اپنی شاپ کے ایک گھامڑ ملازم کو ڈانٹ پھٹکار کرتے ہوئے مجھے یاد کیا۔ کیا تمہاری نظر میں اب یہی میری اوقات رہ گئی ہے کہ میں ڈیوٹی فری شاپ میں ایسی معمولی سی ملازمت کروں گا؟''

میرے ڈرامے کی تہ تک پہنچنے کے بعد اس کے ہونٹوں پر ہنسی آ گئی۔ ''بس بیگ بس! کچھ اداکاری عدالت کے لئے بھی بچا کر رکھو۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے کہا۔ ''میں نے تمہیں جس خاص مقصد سے یاد کیا تھا، اب وہ بھی سن لو۔''

میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

بٹ نے کہا۔ ''تم نے مجھے جس ملازم کو ڈانٹتے ہوئے دیکھا ہے نا، اس کی جگہ پہلے ریاست علی کام کرتا تھا۔ ریاست علی نہایت ہی محنتی اور تجربہ کار شخص تھا لیکن ایک نادانی نے اس کی زندگی کی بساط کو اس طرح الٹ دیا کہ وہ بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔ اسے اس عذاب سے نکالنے کے لئے ایک قابل وکیل کی ضرورت ہے، اسی حوالے سے میں تمہیں شدت سے یاد کر رہا تھا اور تم آ گئے۔''

''اوہ! تو یہ بات ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ''ریاست علی کس قسم کی مصیبت میں پھنس گیا ہے؟''

''اس پر ایک شخص کے قتل کا الزام ہے۔'' اجمل بٹ نے بتایا۔ ''لیکن مجھے ایک سو ایک فیصد یقین ہے، ریاست نے کوئی قتل وتل نہیں کیا۔''

اجمل بٹ مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا لیکن اس نے ملزم ریاست کے بے گناہ ہونے کے بارے میں اپنے جن جذبات و احساسات کا اظہار کیا، میں آنکھیں بند کر کے ان پر ایمان نہیں لا سکتا تھا لہٰذا اپنی تسلی کی خاطر میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''واقعے کی تفصیل کیا ہے؟''

اس نے بتایا۔ ''ریاست علی آسان شرائط پر قرضہ دینے والی ایک کمپنی کے چکر میں پھنس گیا تھا۔ اس قسم کا کاروبار کرنے والی بہت ہی کم کمپنیاں قابل بھروسا ہوتی ہیں۔ ان کی ایک ساکھ ہوتی ہے اور وہ لوگ سالہا سال سے ایمانداری کی بنیاد پر کاروبار چلا رہے ہوتے ہیں لیکن زیادہ تر کمپنیاں دھوکے اور فراڈ سے کام لے کر معصوم اور سادہ لوح افراد کو بے وقوف بناتی ہیں۔ اس طرح وہ اپنے پاس پھنسے ہوئے بے بس لوگوں کو کسی بھی اندھے گڑھے میں پھینک کر اپنا الو سیدھا کر لیتی ہیں۔ بہرحال، ریاست علی ایک فراڈ کمپنی ''ایزی لائف ٹریڈرز'' کے جال میں جا پھنسا تھا۔ ایک لاکھ قرضہ حاصل کرنے کی امید میں اس نے تین چار ماہ تک کمپنی کے چکر تو لگائے سو لگائے، اس کے ساتھ ہی وہ اپنی جیب سے بھی لگ بھگ چار ہزار روپے انہیں دے چکا۔'' اجمل بٹ سانس لینے کے لئے متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''بیگ یار! چار ہزار روپے کم رقم نہیں ہوتی۔ ریاست کو یہاں سے دو ہزار روپے تنخواہ ملتی تھی۔ یہ ایک طرح سے اس کی دو ماہ کی تنخواہ ہے جو اس نے ایک لاکھ روپے کے حصول کے لالچ میں گنوا دیئے۔ ایک لاکھ تو ملنے ہی نہیں تھے، اس بے وقوف کے چار ہزار بھی گئے

اور قتل کا الزام بھی اس کے سر آ گیا۔'' اس نے افسوس ناک انداز میں سر ہلایا اور بولا۔

''کاش ریاست اس میدان میں کودنے سے پہلے مجھ سے مشورہ کر لیتا تو آج اسے یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ وہ خود تو مصیبت میں پھنس ہی چکا ہے، بیوی بچے الگ پریشان ہیں۔''

اسی دوران میں بھاپ اُڑاتی گرما گرم چائے آ گئی۔ میں نے چائے کی پیالی میں سے ایک ہلکا سا سِپ لیا اور اجمل بٹ سے پوچھا۔

''ریاست علی پر کس شخص کے قتل کا الزام ہے؟''

''عاصم۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''کیا مقتول کا تعلق ایزی لائف ٹریڈرز ہی سے تھا؟''

''عاصم اس کمپنی میں جنرل منیجر تھا۔'' بٹ نے بتایا۔

''ریاست علی اس وقت کہاں ہے؟''

''وہ پولیس ریمانڈ پر تھانے میں بند ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''دو دن کے بعد پولیس چالان کے ساتھ اسے عدالت میں پیش کرے گی۔''

''کیا ریاست کے لئے کسی وکیل کا بندوبست کر دیا گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے، میں اس وقت اسی بندوبست میں لگا ہوا ہوں۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔ ''تم اس کیس کے بارے میں جو کچھ بھی جانتے ہو، مجھے بریف کر دو۔''

''تمہارا یہ جملہ ظاہر کرتا ہے، میں ریاست کے لئے ایک تجربہ کار وکیل مقرر کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں؟'' اجمل بٹ نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تصدیق چاہی۔

میں نے کہا۔ ''ایک حد تک تم ایسا سمجھ سکتے ہو۔''

''اور دوسری حد تک پہنچنے کے لئے مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''اس حد تک رسائی کے لئے میری فیس کی چوکی سے این او سی لینا پڑتا ہے!''

''اوہ!'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''میں جانتا ہوں بیگ! تم ایک پروفیشنل ہو اور میں تمہاری اس عادت کو پسند کرتا ہوں اور یہ بھی امید کرتا ہوں، تم میری خاطر ریاست علی کے معاملے میں خصوصی رعایت سے کام لو گے۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یار بٹ! تم سفارش کر رہے ہو اور ملزم سے تمہیں خاصی ہمدردی بھی محسوس ہو رہی ہے اس لئے مجھے کچھ سوچنا پڑے گا۔'' میں ایک لمحے کے لئے رکا

پھر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''تم دونوں کا تعلق چونکہ ڈیوٹی فری شاپ سے ہے اس لئے میں بھی ڈیوٹی فری فیس ہی وصول کروں گا۔ اب تو خوش ہو نا؟'' میری ڈیوٹی فری فیس سے میری مراد اسپیشل ڈسکاؤنٹ تھی۔

آئندہ پندرہ منٹ میں اجمل بٹ نے مجھے، ریاست کو پیش آنے والے واقعے کے بارے میں مختصراً بتایا اور اپنی بات کے اختتام پر کہا۔

''بیگ! تم تھانے جا کر ریاست سے مل لو تو اچھا ہے۔ ممکن ہے اس کی زبان سے کچھ ایسے پوائنٹ تمہارے ہاتھ لگ جائیں جو اس کیس کے سلسلے میں مفید ثابت ہو سکیں۔''

''ہاں، ایسا ممکن ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور چائے کی پیالی کو خالی کر کے میز پر رکھ دیا۔

اس نے مجھے متعلقہ تھانے کا نام بتایا۔ ہمارے درمیان چند اور باتیں ہوئیں پھر میں اس سے مصافحہ کر کے ڈیوٹی فری شاپ سے نکل آیا۔

اس روز میں نے ڈیوٹی فری شاپ سے کوئی آئٹم پرچیز نہیں کیا۔ البتہ قتل کے ملزم کا ایک سنسنی خیز کیس اٹھا لایا تھا۔

❋❋❋

ریاست علی کی عمر چالیس کے قریب رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد اور مائل بہ فربہی جسم کا مالک تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی جن میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے جیسے وہ ایک دو راتوں کا جاگا ہوا ہو۔ اس نے گرے کلر کی شلوار قمیض پر دھاری دار سوئٹر پہن رکھا تھا۔ ریاست نے مناسب سائز کی داڑھی بھی رکھ چھوڑی تھی جو اس کی شخصیت سے پوری طرح لگا کھاتی تھی۔ وہ صورت سے ایک سیدھا سادہ اور امن پسند شخص دکھائی دیتا تھا تاہم میں جب اس سے ملا تو فکر و پریشانی نے اسے بڑی مضبوطی سے اپنے سفاک جبڑوں میں دبوچ رکھا تھا۔

اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ میں نے اس حوالاتی تک رسائی حاصل کرنے کے لئے کون کون سے پاپڑ بیلے۔ اس طریقہ کار کو میں کئی مرتبہ بیان کر چکا ہوں۔ اگر کوئی ملزم ریمانڈ پر ہو تو پولیس والے کسی کو اس سے ملاقات کی اجازت نہیں دیتے، وکیل حضرات کو تو ملزم سے کوسوں دور رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ میں ایسے مواقع پر ڈبے میں سے گھی نکالنے کے لئے کس طرح انگلی کو ٹیڑھا کر لیا کرتا ہوں، قارئین اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں۔

میں ریاست علی کے پاس پہنچا۔ بہ غور اس کا جائزہ لیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔''

''اوہ، تو آپ وکیل صاحب ہیں۔'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور ہر ممکنہ حد تک مصافحہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ خاصا نروس ہو رہا تھا۔

میں نے اس کے ہاتھ کو تھام لیا اور تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''تم فکر نہ کرو۔ انشاء اللہ! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اجمل بٹ نے مجھے تمہارا وکیل مقرر کیا ہے۔''

اس نے ممنونیت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔ مجھے یہ جانچنے میں قطعی کسی دقت سے نہیں گزرنا پڑا کہ وہ ممنونیت مجھ سے زیادہ بٹ کے لئے تھی۔ پھر اس کے الفاظ نے میری جانچ کی تصدیق بھی کر دی۔

''بٹ صاحب بہت ہی مہربان اور خدا ترس انسان ہیں۔ تمام ملازمین کے ساتھ ان کا رویہ دوستانہ ہے۔ بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے، وہ نہیں بلکہ ہم اس شاپ کے سپروائزر ہوں!'' وہ چند لمحات کے لئے خیالوں کی دنیا میں کھو گیا پھر بولا۔ ''مجھے یقین تھا، بٹ صاحب مجھے اس مصیبت سے نکالنے کے لئے کوئی نہ کوئی بندوبست ضرور کریں گے۔''

''صرف اجمل بٹ کے بندوبست سے کام نہیں چلے گا ریاست!'' میں نے اس کی کشادہ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں بھی تھوڑے ہاتھ پاؤں اور زبان ہلانا ہوگی۔''

اس نے تعجب خیز نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''میں کیا کر سکتا ہوں وکیل صاحب! میں تو اس وقت پولیس والوں کے رحم و کرم پر ہوں۔''

''تم نے شاید میرے الفاظ پر غور نہیں کیا۔'' میں نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''پولیس کسٹڈی میں ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہاتھ پاؤں نہ سہی مگر تم اپنی زبان کو بہت بہتر انداز میں استعمال کر سکتے ہو۔''

میں نے لمحے بھر کو رک کر اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ اس جائزے سے یہ نتیجہ نکلا کہ وہ میری بات کو سمجھ نہیں سکا تھا۔ میں نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے دو ٹوک انداز میں کہا۔

''ریاست! تم صرف اتنا کرو کہ مجھے اس کیس کے بارے میں تفصیلاً بتا دو۔ جو بھی ضروری اور غیر ضروری، اہم اور غیر اہم بات تمہارے علم میں ہے، میں اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

ایک لمحے کے تامل کے بعد اس نے ٹھہر ٹھہر کر بولنا شروع کیا۔ شروع میں اس کا بیان بے ربط سا تھا لیکن میری تسلی اور دلاسے نے اس کا اعتماد بحال کر دیا۔ آئندہ آدھے گھنٹے

میں اس نے مجھے اپنے کیس کی تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ اس کے بعد میں نے ریاست سے ضروری سوالات کئے اور مطمئن ہونے کے بعد وکالت نامے پر اس کے دستخط لے لئے۔ ایک طرح سے یہ اس امر کا ثبوت تھا کہ میں نے ریاست کا کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔

میں نے اسے چند اہم باتیں سمجھائیں، مختلف امور کے بارے میں ضروری ہدایات دیں اور اس کی باعزت بریت کا یقین دلانے کے بعد وہاں سے واپس آ گیا۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں ریاست کی بپتا کی تفصیل آپ کی خدمت میں پیش کرتا چلوں تاکہ آپ اس کیس کے پس منظر سے واقف ہو جائیں۔ خلاصے کی بجائے تفصیل اس لئے کہ اس داستان میں دلچسپی کے علاوہ عبرت کا بھی پہلو نمایاں ہے۔ ہو سکتا ہے اس کے مطالعے کے بعد کسی کی بند آنکھیں کھل جائیں اور وہ تباہ و برباد ہونے سے بچ جائے۔ ازیں علاوہ اس طرح عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار ہونے سے محفوظ رہے گا۔ کسی بھی پیش منظر کو سمجھنے کے لئے پس منظر سے آگاہ ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی مریض کا علاج شروع کرنے سے پہلے مرض کی تشخیص!

ریاست علی ملیر کا رہنے والا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور تین بچوں کے ساتھ نارمل زندگی گزار رہا تھا۔ ڈیوٹی فری شاپ سے جو تنخواہ ملتی وہ مناسب گزارے کے لئے کافی نہیں تھی۔ اس لئے وہ پارٹ ٹائم میں بھی کچھ نہ کچھ کرتا رہتا تھا۔ ڈیوٹی فری شاپ پر وہ پانچ سال سے ملازم تھا اور وہ سینئرز کی اچھی نظروں میں تھا۔ ڈیوٹی فری شاپ پر ہی اس نے اپنے کچھ لنکس بنا لئے تھے کہ تھوڑی بہت اوپر کی آمدنی بھی ہو جاتی۔ تاہم یہ آمدنی انتہائی جائز اور اس کی محنت کے صلے میں شمار ہوتی تھی جس پر اس کا ضمیر اور دل انتہائی مطمئن تھا۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ ایک روز ایک انتہائی پُرکشش اشتہار اس کی نگاہ سے گزرا۔ یہ اشتہار ''ایزی لائف ٹریڈرز'' والوں کی طرف سے تھا جو آسان شرائط پر لوگوں کو قرضہ فراہم کرتی تھی۔ ریاست علی کی بیوی کی خواہش تھی کہ وہ نوکری چھوڑ کر اپنا کوئی جنرل اسٹور کھول لے۔ لیکن ظاہر ہے جنرل اسٹور کھولنے کے لئے جتنے سرمائے کی ضرورت تھی وہ ان لوگوں کے پاس نہیں تھا۔ جب ایزی لائف ٹریڈنگ کمپنی کا اشتہار اس نے پڑھا تو رات بیوی سے اس کا تذکرہ کیا۔

بیوی نے پوچھا۔ ''وہ لوگ کن شرائط پر قرض دیں گے؟''

''یہ تو مجھے نہیں معلوم۔'' ریاست نے کہا۔ ''نہ ہی اشتہار میں اس کی کوئی وضاحت کی گئی ہے۔ بس، آسان شرائط کا ذکر ہے۔ تفصیل جاننے کے لئے تو کمپنی کے دفتر کا چکر لگانا پڑے

گا۔"

"دفتر کا ایڈریس کہاں کا لکھا ہے؟" بیوی نے سوال کیا۔

"ایڈریس تو شارع فیصل ہی کا ہے۔" ریاست نے جواب دیا۔

بیوی نے تجویز پیش کی۔"تو تم کل ہی اس کمپنی کے دفتر جا کر معلومات حاصل کر لو۔"

"ٹھیک ہے، میں دیکھتا ہوں۔"

"ریاست! یہ لوگ قرض کی واپسی میں، دی ہوئی رقم سے کچھ زیادہ ہی وصول کرتے ہوں گے۔" بیوی نے ایک اہم نکتہ اٹھایا۔

ریاست نے کہا۔"ظاہری سی بات ہے۔ وہ ہمارے کوئی چاچے، مامے تو ہیں نہیں جو ہمدردی میں یوں ایک بڑی رقم اٹھا کر ہمارے حوالے کر دیں گے۔ انہوں نے اپنے فائدے کے لئے کمپنی کھولی ہے۔"

"کیا بات کرتے ہو ریاست!" بیوی نے ایک تلخ سچائی بیان کرتے ہوئے کہا۔"آج کل تو چاچے مامے بھی پلٹ کر نہیں دیکھتے کہ کون کس حال میں ہے۔ کیا میرے اور تمہارے چاچے، مامے نہیں ہیں؟" وہ سوالیہ انداز میں بات ادھوری چھوڑ کر لمحے بھر کو متوقف ہوئی پھر کڑوے لہجے میں بولی۔"ہیں...... اور بڑے آسودہ بھی ہیں لیکن......"

اس نے ایک مرتبہ پھر بڑے خطرناک انداز میں جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ ریاست ایک صابر اور صلح جو شخص تھا۔ اس نے اس ترش موضوع کو دراز کرنا مناسب نہ سمجھا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔

"میں کل جا کر اس کمپنی سے معلوم کرتا ہوں، وہ ایک لاکھ روپے کے قرض پر کتنا مارک اَپ لیں گے اور اس قرض کی واپسی کا طریقہ کار کیا ہو گا۔ پھر پتہ چل جائے گا کہ ان کی آسان شرائط کیا معنی رکھتی ہیں!"

"اچھا...... تو تم نے یہ بھی فیصلہ کر لیا کہ کتنا قرض لو گے؟" بیوی نے پُرمسرت انداز میں استفسار کیا۔

"بھئی تمہاری فرمائش بلکہ ضد ہے، میں ایک عالی شان جنرل اسٹور کھولوں۔" ریاست نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔"اس درجے کا اسٹور ایک لاکھ سے کم میں کیا کھلے گا!"

آج سے بیس پچیس سال پہلے ایک لاکھ روپے کی اچھی خاصی ویلیو ہوا کرتی تھی۔ اس حوالے سے ریاست کا حساب کتاب بالکل درست تھا۔ وہ ایک لاکھ روپے سے ٹھیک ٹھاک جنرل اسٹور کھول سکتا تھا کیونکہ اس قسم کی دکانداری کے اکثر آئٹمز کریڈٹ پر بھی مل جاتے ہیں۔

ریاست کی بات کے جواب میں بیوی نے کہا۔"تم اسے میری فرمائش سمجھو یا ضد اور یا پھر خواہش، میں جو کچھ بھی چاہ رہی ہوں وہ اپنے بچوں کے مستقبل کی خاطر سوچ رہی ہوں۔ ہماری تو جیسے تیسے گزر گئی، ان تینوں کی زندگی بنانے کے لئے معیاری تعلیم کی اشد ضرورت ہے اور تم جانتے ہو، آج کل معیاری تعلیم کتنی مہنگی ہوتی جا رہی ہے!"

معیار اور کوالٹی کے حوالے سے آج کل جو سنگین اور فکر انگیز مسائل درپیش ہیں، بیس پچیس سال پہلے بھی ان کا یہی حال تھا بلکہ میرا تو یہ خیال ہے، یہ مسائل ہر دور میں ایک جیسے ہی رہے ہیں اور آئندہ بھی ایک جیسے ہی رہیں گے۔ معیاری تعلیم، معیاری طبی امداد اور معیاری انصاف تک عام لوگوں کی رسائی اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور رہی ہے۔

ریاست بیوی کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔ نصف بہتر کے فرمان پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہی جرح و بحث کی گنجائش تھی کیونکہ اس نے ایک انتہائی معقول اور جائز بات کی تھی۔

آئندہ روز ریاست لنچ کے وقفے میں، آسان شرائط پر قرضہ دینے والی کمپنی کے دفتر پہنچ گیا۔"ایزی لائف ٹریڈرز" والوں نے کتھئی رنگ کی ایک ملٹی اسٹوری بلڈنگ کا سیکنڈ فلور گھیر رکھا تھا اور وہاں کی چمک دمک اور رونق کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، پورا شہر قرضہ حاصل کرنے کے لئے امڈ آیا ہو!

وہ جب داخلی دروازے سے اندر پہنچا تو ایک کشادہ ہال میں لگے میلے کو دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ہال کے عین وسط میں ایک خوب صورت قد آور مصنوعی پودا بڑے دلکش انداز میں ایستادہ نظر آیا۔ اس کے چاروں جانب دائرے کی شکل میں چھوٹے گملے رکھے ہوئے تھے جن میں ان ڈور پلانٹ دکھائی دے رہے تھے۔ قریب سے گزرنے کے بعد ریاست کو پتہ چلا کہ پہلی نظر میں وہ جس قد آور پودے کو مصنوعی سمجھا تھا، وہ بھی کوئی ان ڈور جسیم پلانٹ ہی تھا۔ دروازے سے داخل ہونے کے بعد ہال کی مغربی دیوار کے ساتھ ایک قطار میں بیس پچیس کرسیاں لگی ہوئی تھیں اور وہ تمام کرسیاں اس وقت "ضرورت مندوں" سے بھری ہوئی تھیں۔ اسی نوعیت کی کرسیوں کی ایک ایل۔ شیپ "قطار" داخلی دروازے کے دائیں جانب ایک کونے میں بھی نظر آ رہی تھی۔ وہاں دس سے بارہ تک کرسیوں کو رکھا گیا تھا۔ ان میں سے ریاست کو دو چار خالی دکھائی دیں۔

ریاست نے نگاہ اٹھا کر سامنے کے ماحول کا جائزہ لیا۔ شمالی دیوار کے بائیں کونے میں ایک ادھیڑ عمر شخص کی سیٹ تھی اور دائیں کونے میں ایک طرح دار حسینہ اپنی کرسی میز سجائے

بیٹھی تھی۔ ہال کی مشرقی سمت چند کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ ظاہر ہے ان کمروں میں بھی کمپنی سے متعلق افراد ہی بیٹھے ہوں گے۔ انتارش دیکھ کر ریاست کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کہاں جائے؟ کیا کرے؟ اور کیا نہ کرے؟

بالآخر وہ ان کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا جو ایل۔شیپ میں، داخلی دروازے کی دائیں جانب بچھی ہوئی تھیں۔ اس کے بازو میں بیٹھے ہوئے شخص نے رشک آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

''میرا نام فرید مرزا ہے اور آپ ... ؟''

اس شخص نے سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو ریاست سمجھ گیا، وہ اس کا تعارف حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے ریاست علی کہتے ہیں۔''

''کتنا قرضہ منظور ہوا ہے آپ کا؟'' فرید مرزا نامی شخص نے استفسار کیا۔

''میں تو آج پہلی مرتبہ یہاں آیا ہوں بھائی!'' ریاست نے جواب دیا۔ ''ابھی قرضہ حاصل کرنے کے لئے طریقہ کار کا مجھے کوئی علم نہیں۔ میں قرضہ حاصل کرنے آیا ہوں۔''

''پھر تو آپ بالکل غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' فرید مرزا کی بات سن کر ریاست چونک اٹھا۔ ''کیا ایزی لائف ٹریڈرز والے آسان شرائط پر قرضہ فراہم نہیں کرتے؟''

''اوہ!'' فرید مرزا نے ایک گہری سانس لی۔ ''آپ میری بات نہیں سمجھے۔ میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں، آپ غلط لائن میں بیٹھ گئے ہیں۔'' پھر اس نے مغربی دیوار کے ساتھ ایک قطار میں لگی ہوئی دو درجن کرسیوں کی جانب اشارہ کیا اور کہا۔ ''پہلی مرتبہ آنے والے ادھر بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں۔''

''یہ بات مجھے معلوم نہیں تھی۔'' ریاست نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''مگر اس طرف تو کوئی سیٹ خالی نظر نہیں آ رہی!''

''یہاں ہر وقت ایسا ہی رش لگا رہتا ہے۔'' فرید مرزا نے اکتاہٹ آمیز انداز میں کہا۔ ''ادھر نظر جمائے رکھو، جیسے ہی کوئی کرسی خالی ہو، تم قبضہ کر لینا۔ لیکن اس سے پہلے تمہیں ایک کام کرنا ہے۔''

''کون سا کام؟'' ریاست نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے پوچھا۔ ''کیا تم نے ٹوکن حاصل کر لیا ہے؟''

''ٹوکن ..... کون سا ٹوکن؟''

''اپنی باری کا ٹوکن۔'' فرید مرزا نے بتایا۔ ''اس لمبی قطار کے اختتام پر ایک بڑے میاں بیٹھے تمہیں دکھائی دے رہے ہیں ناں! وہ قرضے کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں اور ٹوکن کا نمبر دیکھ کر وہ اپنی باری پر متعلقہ شخص کو اٹینڈ کرتے ہیں۔''

''یہ ٹوکن کہاں سے ملتا ہے؟'' ریاست علی نے پوچھا۔

''اس طرف سے۔'' فرید مرزا نے ایک سمت انگلی سے اشارہ کر دیا۔

ریاست نے اس کی انگلی کی تقلید کی تو اس کی متلاشی نگاہ، داخلی دروازے کے بائیں جانب کونے میں پہنچ گئی۔ وہاں ایک نوجوان لڑکی کرسی میز سجائے بیٹھی تھی۔ ریاست چند لمحات تک ایک ٹک اس لڑکی کو دیکھتا چلا گیا۔ بلاشبہ وہ ایک حسین اور پُرکشش لڑکی تھی۔ اسے ایک ٹک نہ دیکھنا، بد ذوقی میں شمار ہوتا۔ لیکن ریاست زیادہ دیر تک اس خوش ذوقی کا مظاہرہ نہ کر سکا۔ فرید مرزا کی کھنکار نے اس کی محویت کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔ فرید نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے کھنکارا تھا۔

وہ بوکھلاہٹ آمیز نظر سے فرید کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اچھا ... اچھا ... ٹوکن وہاں سے ملتا ہے۔'' پھر وہ یک لخت اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''میں ٹوکن لے کر ابھی آتا ہوں۔''

فرید مرزا کا جواب سنے بغیر وہ مذکورہ حسینہ کی جانب بڑھ گیا۔ وہ لڑکی گویا اس کے دل میں کھب سی گئی تھی۔ یہ بات نہیں کہ وہ کوئی دل پھینک یا فلرٹ قسم کا شخص تھا۔ وہ اپنے بیوی بچوں سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ وہ اس کی زندگی کا محور و مرکز تھے۔ اور وہ اپنے محور و مرکز تک ہی محدود تھا۔ مگر اس لڑکی نے بہرحال اس کے دل و دماغ کو متاثر ضرور کیا تھا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا، اس نے آفس میں داخل ہوتے ہی اس لڑکی کو کیوں نہیں دیکھ لیا تھا۔

انہی خیالات کو ذہن میں بٹھائے اور انہی جذبات کو دل میں سجائے وہ مذکورہ خوبرو لڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ لڑکی کی میز پر اس کے نام کی تختی موجود تھی جس پر جلی حروف میں ''فوزیہ'' لکھا ہوا تھا۔ ریاست کے دل میں ایک جذبہ دھڑک اٹھا ... اس کی طرح اس کا نام بھی کتنا پیارا ہے!

لڑکی نے گردن اٹھا کر اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے ریاست کی طرف دیکھا اور بڑے دل آویز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تشریف رکھیں سر!''

اس پیشہ ورانہ پیش کش کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ کے اشارے سے اس اکلوتی کرسی کی جانب اشارہ بھی کر دیا جو اس کی میز کے سامنے بچھی تھی۔ لیکن ریاست کو اس کا ہاتھ

''دکھائی'' نہ دیا۔ وہ یہی سمجھا، لڑکی اسے اپنے دل میں تشریف رکھنے کو کہہ رہی ہے۔ بہر حال، وہ کسی طرح مذکورہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس دوران میں فوزیہ نامی وہ خوب صورت لڑکی مسلسل اسے سوالیہ نظر سے دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے جز بز ہوتے ہوئے کہا۔ ''مس فوزیہ! میں دراصل ....''

ریاست نہیں جانتا تھا، فوزیہ مس ہے یا مسز! اسی لئے احتیاطاً اس نے ''مس'' کا لفظ استعمال کیا تھا تاکہ لڑکی کے برا ماننے کے امکانات صفر کے برابر ہو جائیں۔ لیکن فوزیہ نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

''میں جانتی ہوں سر! آپ ٹوکن لینے کے لئے میرے پاس آئے ہیں۔''

''اوہ!'' ریاست ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

اس دوران میں فوزیہ نے اپنی میز کی دراز میں سے چار انچ لمبائی چوڑائی سائز کا گتے کا ایک چوکور ٹکڑا نکالا اور ریاست کی طرف بڑھاتے ہوئے ریشمی لہجے میں بولی۔

''یہ لیں سر! آپ کا ٹوکن نمبر ایک سو ایکیس ہے۔''

''ایک سو ایکیس؟'' ریاست نے حیرت سے دہرایا اور ٹوکن کو اپنے ہاتھوں میں الٹ پلٹ کر دیکھا، واقعی گتے کے اس چوکور ٹکڑے پر ''ون ٹو ون'' لکھا ہوا تھا۔ وہ پریشانی سے بولا۔ ''میں تو لنچ کے وقفے میں اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر آیا ہوں۔ پتہ نہیں، یہاں میری باری کب آئے گی؟''

''آپ فکر نہ کریں سر!'' وہ ریاست کی فکر مندی پر تسلی کا مرہم رکھتے ہوئے بولی۔ ''میں خلیل صاحب سے سفارش کر دوں گی تو آپ کی باری جلدی آ جائے گی۔ ویسے میں نے آپ کو بہت اچھا نمبر نکال کر دیا ہے۔ ایک سو ایکیس کا مجموعہ چار بنتا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں ''چار'' کا ہندسہ دولت اور خوش بختی کا ہندسہ تسلیم کیا جاتا ہے۔'' پھر اس نے چونکنے والے انداز میں ٹیبل کیلنڈر پر نگاہ ڈالی اور خاصے جوشیلے لہجے میں بولی۔ اس نے اب تک کی تمام تر گفتگو نہایت مدھم لہجے میں کی تھی تاکہ کوئی دوسرا نہ سن سکے۔

''کمال ہو گیا سر! آج آپ پہلی مرتبہ ہمارے دفتر آئے ہیں اور اتفاق سے آج چار تاریخ بھی ہے۔ آپ کی خوش قسمتی کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔'' وہ بدستور آواز کو دھیما رکھتے ہوئے بولی۔

ایک حسین و جمیل لڑکی کسی مرد کے سامنے بیٹھ کر بڑے ناز و انداز سے ''سر، سر'' پکار کر خوش کن باتیں کر رہی ہو تو یہ مرد کی فطرت اور شان کے خلاف ہے کہ وہ اپنے دل کا کوئی

رومان پرور گوشہ اس ماہ جبیں، نازنیں، دل ربا، دل نشیں کے لئے خالی نہ کر دے۔ بقول کسے، ریاست غیر محسوس طور پر فوزیہ پر ریجھ گیا۔

باچھیں پھیلاتے ہوئے اس نے فوزیہ سے پوچھا۔ ''مس فوزیہ! کیا آپ علم الاعداد وغیرہ سے بھی شغف رکھتی ہیں؟''

''میں کوئی پیشہ ور نجومی تو نہیں ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ریاست کو وہ سنجیدگی میں بھی مسکراتی ہوئی نظر آئی۔ ''بہر حال، آپ نے شغف کا لفظ بالکل درست استعمال کیا ہے۔ سر! میں اپنے علم کو اپنے شوق اور تفریح کے لئے استعمال کرتی ہوں۔''

فوزیہ کے مخصوص حوصلہ افزا رویے نے ریاست کو خاصا بہادر اور نڈر بنا دیا۔ کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''کبھی میرا حساب کتاب لگا کر بھی تو بتائیں، کیا ساری زندگی نوکری کرتے ہوئے ہی گزر جائے گی یا.....''

وہ ایک مرتبہ پھر قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔ ''سر! آپ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ٹوکن کا نمبر دیکھ رہے ہیں نا! میں نے آپ کو بتایا ہے، یہ عدد خوش قسمت لوگوں کی زندگی میں گردش کرتا رہتا ہے اور آج کی تاریخ سے یہ آپ کی زندگی میں بھی شامل ہو گیا ہے۔ ویسے تو آپ یہاں آتے جاتے ہی رہیں گے، میں آپ کے بارے میں، بعد میں اور بھی بہت سی باتیں بتاؤں گی۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوئی پھر سرسری انداز میں بولی۔

''سر! اس ٹوکن کی فیس دے دیں پلیز!''

''کتنی فیس دینا ہو گی؟'' ریاست نے دریافت کیا۔

فوزیہ نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ ''صرف ایک سو روپے۔''

''صرف ایک سو روپے'' کا ذکر اس نے ایسے کیا جیسے محض ایک روپے کا مطالبہ کر رہی ہو۔ لیکن ریاست علی نے بے چون و چرا اپنے پرس میں سے سو روپے والا نوٹ نکال کر فوزیہ کی طرف بڑھا دیا۔ فوزیہ نے رقم کو میز کی دراز میں رکھا اور آواز دبا کر رازدارانہ لہجے میں مستفسر ہوئی۔

''سر! آپ کی شادی ہو گئی ہے؟''

یہ ایسا سوال تھا کہ ریاست علی چکرا کر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرے یا دروغ گوئی سے کام چلائے۔ دل تڑپ تڑپ کر مطالبہ کر رہا تھا، وہ فوزیہ سے کہہ دے کہ ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی لیکن پاسبانِ عقل تنبیہ کر رہا تھا، بری بات! جھوٹ نہیں بولنا چاہئے۔ تحاتی سوچ و بچار کے بعد اس نے ایک محفوظ راہ تلاش کر لی۔

بڑے اعتماد سے بولا۔

"ابھی کہاں ۔۔۔ قسمت بدلے تو اس بارے میں بھی سوچا جائے۔"

فوزیہ نے معنی خیز نظر سے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور گردن کو مخصوص انداز میں جھٹکتے ہوئے بولی۔ "سوچنا شروع کر دیں سر! آپ ہماری کمپنی میں قدم رکھ چکے ہیں۔ اب قسمت بدلنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

اس نے فوزیہ کی موہوم اور مبہم پیش کش کے جواب میں باچھیں اور آنکھیں ایک ساتھ پھیلا کر اس کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ فوزیہ نے کہا۔

"آپ جائیں سر! میں خلیل صاحب کو آپ کے بارے میں انٹرکام پر انفارم کرتی ہوں۔"

ریاست نے کرسی سے اٹھ کر کرسیوں کی لمبی قطار کی طرف دیکھا مگر ابھی تک وہاں کوئی سیٹ خالی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایل۔ شیپ میں لگی ہوئی کرسیوں کی جانب بڑھ گیا۔

اس کا ضمیر بار بار اسے ملامت کر رہا تھا کہ اس نے فوزیہ سے اپنی شادی کے بارے میں جھوٹ کیوں بولا؟ اس کی محبت کرنے والی وفادار بیوی اور تین ننھے منے پیارے پیارے بچے ہیں۔ اس قسم کی حرکت اسے زیب نہیں دیتی۔ کرسی پر بیٹھنے سے پہلے وہ خود کو تسلی دینے کے لئے بچ کی راہ تلاش کر چکا تھا۔ اس نے اندر کی آواز کا گلا گھونٹنے کے لئے ضمیر کو یہ تھپکی دے کر سلانے کی کوشش کی۔

"میں نے یہ جھوٹ کون سا سنجیدگی اور مستقل بنیادوں پر بولا ہے۔ میں تو اپنے بیوی بچوں سے شدید محبت کرتا ہوں۔ فوزیہ کو آزمانے کی خاطر میں نے کہہ دیا کہ ابھی شادی نہیں ہوئی۔ اس طرح دراصل میں اس کے علم کو آزمانا چاہتا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں وہ علم الاعداد کے ذریعے یہ جاننے میں کامیاب ہوتی ہے یا نہیں کہ میں شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ!"

عقل کی عیاری سے انکار ممکن نہیں۔ انسان اپنی فطرت اور جبلت سے مجبور ہے۔ جب کوئی خوبصورت لڑکی دلربایانہ انداز میں کسی شادی شدہ مرد سے یہ سوال کرے کہ اس کی شادی ہو گئی کہ نہیں تو نوے فیصد مردوں کا جواب عموماً یہی ہوتا ہے ۔۔۔ نہیں، ابھی نہیں!

ریاست علی، فرید مرزا کے برابر میں آ کر بیٹھ تو گیا لیکن اس کی گردن اسی سمت مڑی ہوئی تھی جدھر فوزیہ کی سیٹ تھی۔ فرید مرزا چند لمحات تک تو اس کے یہ لچھن دیکھتا رہا پھر اس سے رہا نہ گیا اور اس نے پوچھ لیا۔

"ریاست میاں! کیا تم وہاں کچھ بھول آئے ہو؟"

"نن ۔۔۔ نہیں!" وہ کھسیانا سا ہو کر فرید مرزا کی طرف دیکھنے لگا۔

فرید نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا۔ "ٹوکن حاصل کر لیا تم نے؟"

"جی، یہ دیکھیں۔" ریاست نے گتے کا چوکور ٹکڑا اس کے سامنے کر دیا۔ "ایک سو اکیسواں نمبر ملا ہے۔ لیکن مس فوزیہ نے کہا ہے، وہ خلیل صاحب سے میری سفارش کر دے گی۔"

"اچھا، وہ بڈھا کھوسٹ!" فرید مرزا نے لمبی قطار کے اختتام پر شمالی دیوار کے ساتھ بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر شخص کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔ "یہ شخص تو بڑا ہی بد مزاج اور بدتمیز ہے۔ مجھے نہیں امید یہ کسی کی سفارش وفارش بھی سنتا ہو۔" وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر قدرے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"لیکن ریاست میاں! کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ہو سکتا ہے، تمہاری فوزیہ کی واقعی چل جائے۔ تم اچھا خاصا وقت اس کے ساتھ لگا کر آئے ہو۔ میرے خیال میں تو یہی خیال گردش کر رہا تھا کہ چیک لے کر ہی وہاں سے اٹھو گے!"

ریاست نے اس کے انداز میں شامل کاٹ کو اچھی طرح محسوس کر لیا۔ وہ یہی سمجھا، فرید مرزا اس سے جیلس ہو رہا ہے۔ پتہ نہیں کیوں، آپوں آپ ریاست، فوزیہ کو اپنی پراپرٹی محسوس کرنے لگا تھا۔ اس لئے فرید مرزا کا طنز اسے کچھ زیادہ ہی چبھا۔ جواباً وہ بھی وار کرنے سے نہ چوکا۔

"مرزا صاحب! آپ بھی تو ٹوکن لینے کے لئے مس فوزیہ کے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ میں نے کوئی نیا کام تو نہیں کیا؟"

"میں نئے اور پرانے کام کی بات نہیں کر رہا ہوں میاں۔" مرزا کے لہجے میں مخصوص چبھن بدستور شامل رہی۔ "بلکہ میں تو یہ کہہ رہا ہوں، تم کافی دیر تک اس لڑکی سے گپیں لگا کر آئے ہو۔ وہ بھی بڑی مسکرا لجا کر تم سے باتیں کر رہی تھی۔ ہمیں تو تمہاری مس فوزیہ نے چٹکی بجاتے میں ٹرخا دیا تھا۔ ٹوکن ہمارے ہاتھ پر رکھا، سو روپے وصول کئے اور بس ۔۔۔!"

فرید مرزا نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو ریاست کو صد فی صد یقین ہو گیا، وہ اس سے حسد کرنے لگا تھا۔ فرید کو اللہ نے بس گزارہ چلاؤ صورت وصحت سے نوازا تھا۔ ریاست نے اس کے سراپا اور شخصیت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور دل ہی دل میں کہا۔ "تم جیسے لنگور سے اگر اس نے بات بھی کر لی ہے تو اسے اپنی خوش قسمتی ہی جانو۔ یہ میں ہی سمجھتا ہوں کہ تمہیں کتنی دیر سے کس طرح برداشت کر رہا ہوں؟"

پھر اس نے بہ آواز بلند فرید مرزا سے پوچھ لیا۔ ''بائی دی وے، آپ کس قطار میں بیٹھے ہیں مرزا صاحب؟''

''یہاں وہ لوگ بیٹھتے ہیں جن کا قرضہ منظور ہو چکا۔'' فرید مرزا نے فخریہ انداز میں ناکافی سینے کو حدود سے باہر پھیلانے کی کوشش کرتے ہوئے بتایا۔ ''یہاں سے باری باری انہیں چیک ملیں گے۔''

اپنی معلومات اور دلچسپی کی خاطر ریاست نے پوچھ لیا۔ ''مرزا صاحب! آپ نے کتنی رقم کے لئے اپلائی کیا تھا؟''

''پانچ لاکھ روپے کے لئے!'' مرزا نے پُر جوش انداز میں جواب دیا۔

''مبارک ہو مرزا صاحب! آپ کو پانچ لاکھ روپے کا چیک ملنے والا ہے۔'' ریاست نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''کہاں چل دیئے میاں؟'' مرزا نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''اس قطار میں ایک سیٹ خالی ہو گئی ہے۔'' ریاست علی نے سرسری انداز میں کہا اور مرزا کا جواب سنے بغیر وہ مذکورہ قطار کی سمت بڑھ گیا۔

اس قطار میں لگ کر بالآخر اسے خلیل نامی اس شخص تک پہنچنا تھا جس سے سفارش کرنے کے لئے فوزیہ نے اسے یقین دلایا تھا۔ اس دوران میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ نگاہ اٹھا کر فوزیہ کی طرف بھی دیکھ لیتا۔ ایک دو مرتبہ اس کی نظریں چار بھی ہوئیں اور اس نے فوزیہ کو بڑے دل آویز انداز میں مسکراتے ہوئے پایا۔ فوزیہ کی روح پرور اور انبساط انگیز مسکراہٹ نے اس کا جی بڑھا دیا۔ وہ خود کو معطر فضاؤں میں اُڑتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ ان لمحات میں وہ خود کو مجرم سا بھی محسوس کر رہا تھا لیکن احساسِ ندامت اس قدر کمزور اور ناتواں تھا کہ احساسِ تفاخر نے اسے حقیر چیونٹی کے مانند کچل کر رکھ دیا۔ وہ فوزیہ کے بارے میں سوچتے ہوئے یکسر بھول گیا کہ اس کی باوفا بیوی گھر میں بیٹھی ہے۔

انسان کی نفسیات بھی بڑی عجیب و غریب ہے۔ بعض اوقات یہ احساسات اور جذبات کی ان انتہاؤں کو چھو لیتا ہے کہ اپنے قرب و جوار سے بے گانہ ہو جاتا ہے۔ اپنے ماحول سے یہ بیگانگی اسے اندھا، بہرا اور گونگا بنا دیتی ہے۔ خوشی کے شادیانوں میں اسے زندگی کی چیخ سنائی نہیں دیتی!

جلد ہی ریاست کو یقین آ گیا کہ حسب وعدہ فوزیہ نے خلیل صاحب سے اس کی سفارش کر دی تھی۔ ابھی اس سے آگے چار پانچ افراد موجود اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے کہ ادھر

عمر خلیل نے اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے پکارا۔

''ایک سو اکیس نمبر آگے آ جائے!''

ایک سو اکیس نمبر کا ٹوکن ریاست علی کے پاس تھا۔ اس بلاوے پر اس سے آگے بیٹھے ہوئے افراد احتجاج کرنے لگے۔ ہر کوئی اپنی اپنی بول رہا تھا۔ اجتماعی طور پر ان کے احتجاج کا لب لباب یہ تھا۔

''ہم کوئی بے وقوف تھوڑی ہیں جو اتنی دیر سے لائن میں لگے بیٹھے ہیں۔ آپ پیچھے سے آنے والوں کو پہلے کیوں بلا رہے ہیں؟''

''میں سب کو نمبر وار بلاتا ہوں۔'' خلیل وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ایک سو اکیس نمبر والے صاحب تھوڑی دیر کے لئے کسی ضروری کام سے چلے گئے تھے اس لئے آپ لوگوں کو محسوس ہو رہا ہے۔ ہماری کمپنی قواعد و ضوابط کی سختی سے پابندی کرتی ہے۔ اگر آپ میں سے کسی کے پاس ایک سو اکیس میں سے پہلے کا نمبر ہو تو بتایئے۔ میں نے ایک سو بیس کو نمٹانے کے بعد ہی ایک سو اکیس کو کال کیا ہے۔''

خلیل کی وضاحت بڑی مدلل تھی لیکن ریاست نے اس کارنامے کا کریڈٹ فوزیہ کے کھاتے میں ڈال دیا جس نے اسے پہلے کا نمبر نکال کر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا، اس کے آگے بیٹھے ہوئے افراد اس سے پہلے آئے تھے مگر ان کے پاس بعد کے نمبر تھے۔ فوزیہ نے اس کے ساتھ امتیازی سلوک کر کے اپنے مہربان ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ فوزیہ خوب صورت تو تھی ہی، ریاست اس کی عقل مندی کا بھی قائل ہو گیا۔ حُسن اور خوبصورتی ایک ہی جگہ بڑی مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں۔ ریاست اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنے لگا۔ اس نے گردن موڑ کر بڑے ستائشی انداز میں فوزیہ کی طرف دیکھا۔

اتفاق سے فوزیہ بھی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دونوں کی نگاہیں ملیں تو فوزیہ قاتلانہ انداز میں مسکرائی۔ ریاست کا اندرون مہک اٹھا۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا، کوئی حسین و شاداب لڑکی یوں اس پر فدا ہو جائے گی۔ قدرت کی اس مہربانی اور فوزیہ کی قدر دانی پر وہ شیر ہو گیا۔ ان لمحات میں وہ اپنے بیوی بچوں کو یکسر فراموش کئے بیٹھا تھا۔ پتہ نہیں، اتنی جرأت اس میں کہاں سے آ گئی تھی!

ریاست علی، خلیل کے سامنے بچھی کرسی پر آ بیٹھا۔ خلیل کی وضاحت کے بعد وہاں موجود لوگوں کے پاس اعتراض کی گنجائش نہیں تھی تاہم وہ دبی زبان میں کچھ نہ کچھ بولتے جا رہے تھے۔ ریاست کی سماعت تک اس نوعیت کے جملے رسائی حاصل کرتے رہے۔

''ہم نے بھی ٹوکن کے لئے پورے سو روپے ادا کئے ہیں، کوئی مفت میں تھوڑی یہاں بیٹھے ہیں بھائی، اپنے کو نوازنے کا چکر ہے ہمارے ملک میں کوئی اصول چل ہی نہیں سکتا..... بینک میں یوٹیلیٹی بل بھرنے جاؤ یا نان، شیرمال والے کے پاس روٹی لینے، یہی چلن دیکھنے کو ملتا ہے۔ تعلق والے بعد میں آ کر بھی پہلے نمٹ جاتے ہیں۔ اس ملک اور اس قوم کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔''

ریاست نے یہ تمام تر تبصرے سنے اور آخری جملے پر دل ہی دل میں ''آمین!'' کہہ کر وہ خلیل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ فوزیہ کی طرح خلیل کے نام کی چوبی تختی بھی اس کی میز پر رکھی نظر آ رہی تھی۔ خلیل کی عمر پچپن سے متجاوز تھی۔ اس نے نظر کا بائی فوکل چشمہ لگا رکھا تھا۔ چہرہ ہونق اور مزاج آتشی تھا۔ وہ اتنے تواتر سے پان چبا رہا تھا کہ بولنے پر یوں محسوس ہوتا جیسے وہ الفاظ اس کے منہ سے نہیں بلکہ کسی قیمے کی مشین سے خارج ہو رہے ہیں۔ بہر حال، وہاں آنے والوں کو کوئی اشد ضرورت کھینچ کر لاتی تھی، لہٰذا وہ پوری توجہ سے خلیل کی بات کو سمجھنے کی کوشش کرتے۔ ریاست بھی ہمہ تن گوش ہو گیا۔

خلیل نے اس سے پوچھا۔ ''ہاں میاں! تمہارا کیا مسئلہ ہے؟''

''میں قرضے کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنے آیا ہوں۔'' ریاست نے کہا۔

''تمہیں کتنا قرضہ درکار ہے؟''

''ایک لاکھ روپے۔'' ریاست نے بتایا۔

''صرف ایک لاکھ؟'' خلیل نے اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولا۔ ''یہ بھی مل جائیں تو غنیمت ہے۔ اس رقم سے میرا کام چل جائے گا۔''

''کیوں نہیں ملیں گے میاں!'' خلیل نے اتنی فراخ دلی سے یہ جملہ ادا کیا جیسے ایک لاکھ کی رقم اس کی واسکٹ کی جیب میں رکھی ہو۔ ابھی وہ پان زدہ انگلیوں والا ہاتھ جیب میں ڈالے گا اور جیب سمیت نوٹوں کو آلودہ کرتے ہوئے وہ رقم ریاست کے ہاتھ پر رکھ دے گا، اس اعتماد کے ساتھ کہ ریاست کا ہاتھ بھی آلودہ ہونے سے محفوظ نہ رہ سکے۔

ریاست نے کہا۔ ''یہ تو آپ کی مہربانی ہو گی خلیل صاحب!''

''ایک لاکھ تو بہت معمولی رقم ہے۔'' خلیل نے اپنے دہانے کے اندر انگلی گھما کر پان کی باقیات کو باہر نکالا اور پاؤں کے نزدیک رکھی ہوئی ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ پھر بات کو آگے بڑھانے سے پہلے اس نے پان کی اسٹیل باڈی ڈبیہ کھولی، ایک پان نکال کر منہ میں دبایا، میز پر ہی رکھی ہوئی دو لمبوتری پلاسٹک کی بوتلوں میں سے چھالیہ اور تمباکو لے کر پھانکا

اور آلودہ انگلیوں کو میز کی کگر پر صاف کرتے ہوئے وہ ریاست علی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''ایزی لائف کا مطلب سمجھتے ہو میاں؟'' ریاست علی کے کچھ بولنے سے پہلے ہی اس نے خود ہی جواب بھی دے دیا۔ ''یعنی آسان زندگی۔ ہماری کمپنی کا نام اسی لئے ایزی لائف رکھا گیا ہے کہ ہم لوگوں کی زندگیوں کو آسان بناتے ہیں۔'' یہ خطاب وہ بہ آواز بلند کر رہا تھا تاکہ قرب و جوار والے بھی استفادہ کر سکیں۔ ''میاں ریاست! تم ایک لاکھ کی بات کرتے ہو، میں نے خود اپنی آنکھوں سے لوگوں کو پچاس لاکھ اور ایک کروڑ تک کے چیک وصول کرتے دیکھا ہے!''

انکشاف انگیز انداز میں بات ختم کر کے اس نے تمباکو اور چھالیہ کی بوتلوں کو ایک مرتبہ پھر اعزاز بخشا۔ شاید منہ کے اندر گردش کرنے والے ملغوبے میں ان کی کمی شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ یہ دونوں پلاسٹک کی بوتلیں دراصل وہ ڈبیاں تھیں جن کے اندر کیمرا کی فلم رکھی ہوتی ہے۔

ریاست علی نے پوچھا۔ ''آپ لوگوں نے اشتہار میں آسان شرائط کی بات کی ہے۔ مجھے ایک لاکھ کا قرضہ حاصل کرنے کے لئے کن کن مراحل سے گزرنا ہو گا، میں آپ لوگوں کا پروسس اور پروسیجر معلوم کرنے آیا ہوں۔''

''پروسس اور پروسیجر بہت ایزی ہے۔ کیونکہ اسے ایزی لائف ٹریڈرز والے ڈیل کر رہے ہیں۔'' خلیل نے فخریہ لہجے میں بتانا شروع کیا۔ ''ریاست میاں! تمہیں ایک لاکھ کا قرضہ چاہئے، مل جائے گا۔ ہم اس ایک لاکھ کی رقم پر دس فیصد مارک اپ وصول کریں گے یعنی تمہیں ایک لاکھ دس ہزار روپے لوٹانا ہوں گے اور وہ بھی آسان اقساط کی صورت میں۔ ایک لاکھ کے قرضے کی قسط دو ہزار روپے ماہانہ ہوتی ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔ جیسا کہ قرض کا اصول ہوتا ہے، پہلی قسط ہم اسی وقت کاٹ لیں گے جب تمہیں چیک جاری کیا جائے گا۔ تمہیں اٹھانوے ہزار روپے کا چیک پیش کیا جائے گا۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر سرسری انداز میں بولا۔

''اگر ہماری کمپنی کا سسٹم تمہاری سمجھ میں آ رہا ہو تو مس انیتا کے پاس جا کر رجسٹریشن کروا لو۔''

''مس انیتا؟'' ریاست نے سوالیہ انداز میں دہرایا۔

خلیل نے بائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مس انیتا ادھر بیٹھی ہیں۔''

ریاست جب اس کمپنی کے دفتر میں داخل ہوا تھا تو اس نے مس انیتا کو اپنی سیٹ پر بیٹھے

دیکھا تھا تاہم وہ اس وقت اس طرح دار حسینہ کے نام سے واقف نہیں تھا۔ کمپنی کا سسٹم اس کی سمجھ میں بیٹھ گیا تھا لہٰذا وہ پان خور خلیل صاحب کے سامنے سے اٹھ کر مس انیتا کے سامنے جا بیٹھا۔ انیتا کی میز پر بھی اس کے نام کی چوبی تختی موجود تھی۔

ریاست کو اپنی آمد کی غرض و غایت سے انیتا کو آگاہ نہیں کرنا پڑا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وہ پہلے سے سب کچھ جانتی ہو۔ کسی خود کار مشین کے مانند وہ شروع ہو گئی   آپ کا نام، ایڈریس، کہاں کام کرتے ہیں، فون نمبر، کتنی رقم درکار ہے، ضمانتی کون ہوگا وغیرہ وغیرہ؟

یہ تمام تر کوائف وہ ایک کمپنی کے چھپے ہوئے ایک فارم میں درج کرتی جا رہی تھی۔ ریاست کھٹا کھٹ انیتا کی مطلوبہ معلومات اسے فراہم کرتا جا رہا تھا۔ ضمانتی پر آ کر اس کی سوئی رک گئی۔

''کیا یہ بہت ضروری ہے؟'' ریاست علی نے پوچھا۔

''ظاہر ہے۔'' انیتا نے بڑی ادا سے کہا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔''ہم ایک لاکھ روپے کی رقم اٹھا کر آپ کو دے رہے ہیں۔ آپ کی کوئی گارنٹی ہمارے پاس بھی تو ہونا چاہئے نا سر!''

انیتا نے جب بڑی لگاوٹ سے اسے ''سر'' کہا تو وہ خوشی سے پھول گیا۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ زندگی میں کبھی ایسی پری وش مہ جبینیں اسے ''سر، سر'' کہہ کر پکاریں گی۔ انیتا اور فوزیہ ایک سے بڑھ کر ایک تھیں لیکن ریاست کو جو بات فوزیہ میں دکھائی دی وہ انیتا میں نظر نہیں آ رہی تھی۔ حالانکہ انیتا، فوزیہ کے مقابلے میں زیادہ گوری چٹی اور اسمارٹ تھی۔ وہ ''فرسٹ امپریشن از دی لاسٹ امپریشن'' کے فلسفے میں گرفتار ہو گیا تھا۔

انیتا کی رس بھری آواز نے اسے خیالوں سے چونکا دیا۔''سر! میں نے آپ کا فارم پُر کر دیا ہے۔ آپ کسی گارنٹر کا بندوبست کر لیں تو میں آپ کا کیس پروسس میں ڈال دوں گی۔''

''ٹھیک ہے   میں کل آپ کو اس بارے میں بتا دوں گا۔'' ریاست نے کہا۔

''تو میں آپ کی رجسٹریشن تو او کے کر دوں نا؟''

''بالکل   بالکل...'' ریاست جلدی سے بولا۔

''سر! اس کے لئے آپ کو رجسٹریشن فیس ابھی ادا کرنی ہو گی۔'' انیتا نے نرم لہجے میں کہا۔

ریاست نے سیٹ چھوڑنے سے پہلے پوچھ لیا۔''آپ کی رجسٹریشن فیس کتنی ہے؟''

''خلیل صاحب نے آپ کو ایک لاکھ روپے کے قرضے کی ماہانہ قسط کے بارے میں تو بتا

دیا ہو گا۔'' وہ شوگر کوٹڈ ٹیبلٹ کو ریاست علی کے حلق میں اتارتے ہوئے بولی۔''ہماری رجسٹریشن فیس ایک قسط کے برابر ہوتی ہے۔''

ریاست کو وہ ٹیبلٹ باؤنٹی نہ لگی، اس نے ٹیبلٹ کے اندر چھپی کڑواہٹ کو فوراً محسوس کر لیا، حیرت بھرے لہجے میں بولا۔''یعنی دو ہزار روپے رجسٹریشن فیس؟''

''یس سر!'' وہ تبسم ریز لہجے میں بولی اور ریاست کو بڑی گہری نظر سے دیکھنے لگی۔

''یہ   یہ کچھ زیادہ نہیں ہے؟'' وہ اس کی نظر کے رعب میں آتے ہوئے بولا۔

''ممکن ہے، آپ کو زیادہ لگ رہی ہو سر!'' وہ فراخ دلی سے مسکرائی پھر متاثر کن سنجیدگی سے بولی۔''فراڈ کا کام کرنے والے عموماً رجسٹریشن فیس بہت کم لیتے ہیں یا پھر لیتے ہی نہیں۔ اور انہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ چند روز بعد انہیں اپنا ٹین ڈبا سمیٹ کر رفو چکر ہونا ہوتا ہے۔ مگر ہم مضبوط بنیادوں پر اس بلڈنگ میں بیٹھے ہیں۔ ہم صرف اس فلور کا کرایہ پچاس ہزار روپے ماہانہ ادا کر رہے ہیں۔ آفس کی آرائش و زیبائش اس کے علاوہ ہے۔ دس ہزار روپے سے زیادہ تو بجلی کا بل ہی آ جاتا ہے۔ انکم ٹیکس الگ ادا کرنا پڑ رہا ہے۔ ہمارا تمام تر بزنس قانونی ہے اور باقاعدہ اس کا انشورنس ہوا ہے۔ اگر آپ کو یقین نہ آ رہا ہو تو میں آپ کو لیگل ڈاکومنٹس دکھا سکتی ہوں۔ آپ ذرا عقل مندی سے سوچیں سر! ماشاء اللہ آپ صورت ہی سے انٹیلیجوئل دکھائی دیتے ہیں۔'' اس نے ریاست علی کو بانس کے آزاد سرے پر بٹھاتے ہوئے محبوبانہ انداز میں کہا۔''ہمیں یہ تمام تر اخراجات بھی تو پورے کرنا ہوتے ہیں۔ رجسٹریشن کی مد میں جمع ہونے والی رقم ہی اس ذیل میں خرچ کرتے ہیں۔ اور میں آپ کو ایک خاص بات بتاؤں!''

اتنا کہہ کر انیتا ڈرامائی انداز میں خاموش ہوئی اور بڑے دلکش زاویے سے میز پر تھوڑا آگے کو جھک گئی۔ زاویہ چونکہ دلکش اور جاذبِ نظر تھا اس لئے ریاست کو اپنا دل و نظر زیر و زبر ہوتے محسوس ہوئے۔ ان نشاط انگیز لمحات میں وہ غلطی سے بھی یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ آج تو وہ بڑے چاؤ سے جس بانس کے افتادہ بلند اور آزاد سرے پر بیٹھا ہوا ہے، کل اسی بانس کے دوسرے، زمین میں گڑے ہوئے سرے کی بھی سیر کرنا ہو گی جہاں صرف اور صرف خاک ہی اس کا مقدر ٹھہرے گی!

ریاست جب ہونقوں کی طرح انیتا کے سامنے خاموش بیٹھا رہا تو وہ رازدارانہ لہجے میں بولی۔''سر! سہیل صاحب کے لئے سب سے بڑا مسئلہ تو ملازمین کی تنخواہوں کا ہے۔ ایزی لائف ٹریڈرز میں کام کرنے والوں کو کافی تگڑی تنخواہیں دی جا رہی ہیں۔ کیا آپ اندازہ لگا

سکتے ہیں کہ سہیل صاحب مجھے کتنی تنخواہ دیتے ہوں گے؟''

ریاست آٹھ دس گھنٹے کی ڈیوٹی کے بعد ڈیوٹی فری شاپ سے جو مقررہ تنخواہ اٹھاتا تھا اس نے اس رقم میں سو فیصد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں آپ کی تنخواہ چار ہزار روپے ہوگی!''

یہ خصوصی رعایت اس نے انیتا کو ایک دلکش اور خوب صورت لڑکی ہونے کے ناتے دی تھی۔ لڑکوں اور مردوں کی بہ نسبت لڑکیوں کو ایک جیسی پوسٹ پر قدرے زیادہ تنخواہ دی جاتی ہے۔ اور لڑکی اگر غیر معمولی حسین ہو تو پھر اس کی تنخواہ کسی پے اسکیل یا کرائیٹریا کی محتاج نہیں ہوتی۔ مگر انیتا کے جواب نے ریاست کا پندرھواں طبق روشن کر دیا۔ وہ بڑے معنی خیز انداز میں گردن کو جنبش دیتے ہوئے بولا۔

''سر! مجھے امید تھی، آپ اندازہ لگانے میں غلطی کر جائیں گے۔ سہیل صاحب بہت جینئس ہیں۔ وہ دوسروں کے اندازوں کو ہمیشہ غلط کر دکھاتے ہیں۔ آپ کی اطلاع کے لئے بتاؤں سر! مجھے ایزی لائف ٹریڈرز سے پورے بیس ہزار روپے تنخواہ مل رہی ہے۔''

''بیس ہزار؟'' ریاست کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

''آپ کو یقین نہیں آیا نا سر!'' وہ تھوڑا سا اور آگے کو جھکتے ہوئے معنی خیز انداز میں بولی۔ ''مجھے پتہ تھا آپ میری تنخواہ کا سن کر حیران رہ جائیں گے۔ میں آپ کو بتاتی ہوں، وہ جو لڑکی ٹوکن والے کاؤنٹر پر بیٹھی ہے نا، اسے کمپنی پندرہ ہزار روپے دیتی ہے۔'' انیتا کا واضح اشارہ فوزیہ کی طرف تھا۔ ریاست کے نزدیک فوزیہ بھی کاؤنٹر پر بیٹھی ہوگی، اب تو وہ اس کے دل پر بیٹھی ہوئی تھی۔

انیتا بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''خلیل صاحب کو بائیس ہزار روپے ملتے ہیں۔ اندر کمروں میں شہناز، نازنین اور عاصم صاحب بیٹھتے ہیں۔'' اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی طرف اشارہ کیا اور معلومات فراہم کرنے کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''ان تینوں کا شمار افسران میں ہوتا ہے۔ شہناز سہیل صاحب کی پرسنل سیکرٹری ہے۔ وہ پچیس ہزار تنخواہ پاتی ہے۔ نازنین فنانس ڈائریکٹر کے عہدے پر کام کرتی ہے، اسے تیس ہزار مل رہے ہیں۔ عاصم صاحب ہماری کمپنی کے جنرل منیجر ہیں، وہ سب سے زیادہ تنخواہ لیتے ہیں یعنی پورے پچاس ہزار روپے!''

بات ختم کرتے ہی انیتا ایک جھٹکے سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ہوش و حواس کو بے قابو کرنے کے اسباب اگرچہ اس کی نگاہ سے اوجھل ہو گئے تھے تاہم انیتا نے اپنی کمپنی کے

ملازمین کی تنخواہوں کی جو ہوش ربا کہانی سنائی وہ ریاست علی کا دماغ ماؤف کرنے کے لئے بہت زیادہ تھی۔ اس کی سماعت سے انیتا کی مدھ بھری آواز ٹکرائی تو وہ چونک اٹھا۔ وہ بڑے شائستہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''سر! اب آپ خود ہی اندازہ لگا لیں، اس لیول کے اخراجات پورے کرنے کے لئے ہمیں ہینڈسم رجسٹریشن فیس تو لینا ہی پڑتی ہے نا۔''

وہ پچھلے چند منٹ سے جس دنیا کا نظارہ کر رہا تھا اس کیف کے زیر اثر وہ انکار یا تکرار کی جرأت نہ کر سکا۔ کسی فرمانبردار شخص کی مانند گردن ہلاتے ہوئے اس نے کہا۔

''مس انیتا! آپ بالکل بجا فرما رہی ہیں۔ میں کل حاضر ہوتا ہوں، رجسٹریشن فیس اور ایک گارنٹر کے ساتھ۔''

''کل کا مطلب کل ہی ہے سر!'' وہ تنبیہی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''میں کل تک آپ کے فارم کو الگ رکھ لوں گی لیکن اگر آپ حسب وعدہ کل اپروچ نہیں کرتے تو میں اسے کینسل کر دوں گی۔ پھر آپ کو نئے سرے سے ٹوکن حاصل کر کے لائن میں لگنا ہوگا۔ آخر میں بھی کسی کو جواب دہ ہوں۔'' پھر وہ تھوڑا توقف کرنے کے بعد بولی۔ اس کا انداز دو ٹوک اور خیر خواہانہ تھا۔

''اب یہ آپ کے ہاتھ میں ہے سر! میں جس حد تک ممکن ہوا، آپ سے بھرپور تعاون کروں گی۔''

''آپ فکر نہ کریں مس انیتا!'' وہ پُر وثوق لہجے میں بولا۔ ''میں کل یقیناً آپ کے پاس آ رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، آپ کل آ جائیں۔'' وہ سرسری لہجے میں بولی۔ پھر ایسے چونکی جیسے اچانک اسے کوئی اہم بات یاد آ گئی ہو۔ اس نے کہا۔ ''سر! مجھے کل آپ کا انتظار رہے گا۔ قرضے والے معاملے سے ہٹ کر مجھے آپ سے ایک ضروری بات بھی کرنا ہے۔''

اس ملاقات کے دوران میں انیتا کی باتوں اور اس کے بدن کی بے باک جنبشوں نے ریاست کو اس قدر متاثر کیا تھا کہ وہ فوزیہ کے ساتھ ساتھ اس کا بھی ''گرویدہ'' ہو گیا۔ اس کے دل میں شدت سے یہ خواہش جاگی کہ انیتا قرضے والے معاملے کو چاہے بعد میں ڈسکس کر لے، مذکورہ ضروری بات وہ فوراً اس سے کہہ دے۔ لیکن اس کی یہ تمنا پوری ہونے کے امکانات اچانک گھٹ کر صفر کے برابر ہو گئے۔

اسی وقت ایک اور امیدوار قرضہ انیتا کے پاس پہنچ گیا اور وہ ریاست علی کو نظر انداز کر

کے نو وارد کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ بادل ناخواستہ ریاست کو وہاں سے ہلنا پڑا۔

ان لمحات میں ریاست کو وہ نو وارد انتہائی منحوس، خبیث، کمینہ اور بدتمیز لگا۔ اس نے سوچا، اگر وہ کم بخت پانچ منٹ بعد انیتا کے پاس پہنچتا تو اس کا کیا بگڑ جاتا۔ کم از کم اس طرح ریاست کا تو کچھ ضرور سنور جاتا۔ وہ اصرار کر کے انیتا سے یہ ضرور پوچھ لیتا کہ وہ کل اس سے کون سی ضروری بات کرنے والی تھی۔ بہرحال، اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے بہرطور کل کا انتظار کرنا تھا۔

وہ بجھے ہوئے دل اور بوجھل قدموں کے ساتھ ٹوکن کاؤنٹر کے قریب پہنچا تو فوزیہ پر نظر پڑ گئی۔ اس کے دل اور ذہن میں ایک کشمکش ہونے لگی۔ وہ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر رہا کہ ان دونوں میں سے زیادہ حسین، پُرکشش اور دل ربا کون ہے؟ جب تک اس نے انیتا سے میٹنگ نہیں کی تھی اس کے دل و دماغ پر فوزیہ کا سکہ بیٹھا ہوا تھا لیکن انیتا کی فراخ دلی اور بے باکی نے اسے ایک بالکل منفرد اور نئے زاویے سے متاثر کیا تھا۔ وہ اپنی سمجھ کی ترازو میں ان دونوں مہ جبینوں کو بٹھائے تصوراتی ناپ تول میں مصروف رہا۔ اس جذباتی ترازو کے پلڑے اس کے قابو میں نہیں آ رہے تھے۔ کبھی انیتا کا پلہ انیتا ہی کی طرح بڑی جراءت اور بے باکی سے جھکنے لگتا اور کبھی فوزیہ رعب حُسن سے اپنے پلّے کو جھکا دیتی۔

وہ انہی دشمن عقل و خرد سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ فوزیہ کی رسیلی آواز نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کی سماعت میں امرت گھول دیا ہو۔ فوزیہ کے انگ انگ سے شہد ٹپکتا تھا۔ ریاست نے کسی سحرزدہ شخص کی طرح گردن گھما کر بہ الفاظ دیگر گردن بڑھا کر فوزیہ کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے دل گداز انداز میں پوچھ رہی تھی۔

''سر! آپ کا کام ہو گیا؟''

''بس سمجھ لیں، ہو گیا۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''کوئی پرابلم ہو تو مجھے بتائیں سر!'' وہ کسی مخلص دوست کی طرح بولی۔

''کوئی خاص پرابلم تو نہیں ہے۔'' ریاست سوچتے ہوئے بولا۔ ''بس، مس انیتا نے گارنٹر کی شرط لگا دی ہے۔''

''اوہ!'' فوزیہ نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ''گارنٹر تو بہت ضروری ہے سر!'' پھر پوچھنے لگی۔ ''اس سلسلے میں اگر آپ کو کوئی مشکل پیش آ رہی ہو تو میں بھی آپ کے لئے کسی گارنٹر کا بندوبست کر سکتی ہوں۔''

''آپ ......؟'' وہ لکنت زدہ انداز میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

''ہاں، ہاں میں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''آپ اگر کہیں تو میں آپ کی گارنٹر بن جاتی ہوں۔ کمپنی میری گارنٹی کو آنکھ بند کر کے ایکسیپٹ (Accept) کر لے گی۔ آپ کہیں تو سر!''

آخری جملہ فوزیہ نے اتنے دلکش اور دل نشیں انداز میں ادا کیا کہ ریاست دل و جان سے اس پر قربان ہونے کو تیار ہو گیا۔ بے ساختہ اس نے سوچا ...... بیویاں اتنی اچھی کیوں نہیں ہوتیں؟

ایسا سوچنے میں ریاست بے چارے کا کچھ زیادہ قصور نہیں تھا۔ وہ مردوں کی مخصوص نفسیات اور فطرت سے مجبور تھا۔ اپنی بیوی چاہے حور پری اور مہر و وفا کا پیکر کیوں نہ ہو، محبت کے دو بول بولنے والی کوئی بھی نامحرم پرائی لڑکی اور دوسرے کی بغل میں دبی ہوئی عورت دنیا کی حسین ترین اور فرمانبردار عورت نظر آنے لگتی ہے۔

اس روز جب ریاست گھر پہنچا تو اس کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ وہ جس بیوی سے بے پناہ محبت کرتا تھا، وہ اسے بھدی اور میلی کچیلی محسوس ہونے لگی۔ وہ اس کے قریب گیا تو اس کی طبیعت مکدر ہو گئی۔ بیوی نے چونک کر پوچھا۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''ابھی تک تو ٹھیک ہے۔ لیکن کچھ دیر اور تمہارے نزدیک بیٹھا رہا تو پھر کوئی گارنٹی نہیں ہے۔''

بیوی نے حیرت اور پریشانی سے شوہر کو دیکھا۔ ''کیوں ...... کیا اچانک میرے جسم میں سے کانٹے نمودار ہو گئے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ ''آج آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟''

ریاست نے کہا۔ ''میں ڈیوٹی فری شاپ سے کتنے ہی پرفیومز لا کر تمہیں دے چکا ہوں لیکن تم انہیں استعمال کرنے کی زحمت نہیں کرتی ہو۔ تمہارے لباس سے ہر وقت ادرک، لہسن اور پیاز ہی کی بُو اٹھتی محسوس ہوتی ہے۔''

بیوی وہی تھی جو دس سال سے اس کے قدم سے قدم اور شانے سے شانہ ملا کر چل رہی تھی۔ اس کا لباس بھی ویسا ہی تھا جیسا عموماً وہ پہنتی تھی۔ آج تک ریاست کو اس کے لباس میں سے ادرک، لہسن اور پیاز کی بُو اُمڈتی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ لیکن آج تک! اور آج تو وہ خوشبوؤں سے مہکتے ہوئے دو بدنوں کے قرب میں حسین لمحات گزار کر آیا تھا۔ ان مہکتے بدنوں کی حامل مہ جبینوں نے اس سے دل ربایانہ انداز میں کلام بھی کیا تھا۔ وہ اب تک اسی گفتگو کے نشے میں چور تھا۔ وہ بیوی کو بھی اسی ترازو میں رکھ کر تول رہا تھا اور یہ بھول رہا تھا

کہ شاطر شکاری اپنی شکار گاہ کی پُرکششی، رنگینی اور سنگینی کے بل بوتے پر ہی تو کامیاب شکار کھیلتے ہیں۔

بیوی دور اندیش تھی، سمجھ گئی کہ شوہر کو کوئی ٹینشن ہو گی جو وہ اس قسم کی اُکھڑی اُکھڑی باتیں کر رہا ہے جن کا کوئی سر پیر ہے اور نہ ہی جواز۔ چنانچہ اس نے فوراً گفتگو کا موضوع بدل دیا اور پوچھا۔

''آج آپ کو قرضہ دینے والی کمپنی میں معلومات حاصل کرنے جانا تھا، اس کا کیا ہوا؟''

بیوی نے اپنی دانست میں موضوع بدلا تھا۔ وہ بے چاری نہیں جانتی تھی، موضوع کا تسلسل جاری ہے۔ کوئی کسی کے دل میں اتر کر تو نہیں دیکھ سکتا نا! ریاست نے فوزیہ اور انیتا کے تصور میں قلابازیاں لگاتے ہوئے مسرور کن لہجے میں کہا۔

''میں نے اس سلسلے میں مکمل معلومات حاصل کر لی ہیں۔ انشاء اللہ ہمیں قرضہ مل جائے گا۔''

''سچ!'' بے ساختہ حقیقی خوشی اس کی آواز سے پھوٹ نکلی۔ ''انہوں نے کوئی کڑی شرط وغیرہ تو نہیں رکھی؟'' اس نے پوچھا۔

''صرف ایک ہی کڑی شرط ہے۔'' ریاست نے قدرے مغموم لہجے میں کہا۔ ''رجسٹریشن فیس دو ہزار روپے پہلے دینا ہو گی۔ اس کے بعد تو قرض کی ماہانہ قسط دو ہزار روپے بندھ جائے گی۔'' گارنٹر والا مسئلہ چونکہ فوزیہ نے حل کر دیا تھا لہٰذا اس نے بیوی سے نہ اس بات کا تذکرہ کیا اور نہ ہی اس مسئلے کا حل پیش کرنے والی کا!

''ایک لاکھ پر ہمیں کتنی رقم دینا ہو گی؟'' بیوی نے نہایت ہی اہم سوال کیا۔

''دس ہزار روپے...... یعنی دس فیصد زیادہ۔'' ریاست نے بتایا۔

''کیا رجسٹریشن والے دو ہزار روپے، بعد میں ادائیگی والی رقم میں ایڈجسٹ کر لئے جائیں گے؟'' اس نے خالصتاً بیویانہ سوال کیا۔

''نہیں۔'' ریاست نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''ان دو ہزار کا کوئی حساب نہیں۔ نہ پہلے اور نہ بعد میں۔''

''اچھا تو اب میں سمجھی آپ اس قدر پریشان اور دباؤ میں کیوں ہیں!'' اچھی اور نیک سیرت بیویاں اپنے شوہروں کے بارے میں بڑی خوش گمان ہوتی ہیں۔ ریاست علی کی بیوی بھی اسی قسم کی تھی۔ اس بات سے بحث نہیں کہ بیویوں کی یہ عادت مفید ہے یا نقصان دہ البتہ ایک بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ شوہروں پر اعتماد کرنے والی ایسی بیویاں ضرور

جنت میں جائیں گی۔

''کیا سمجھتی ہو تم؟'' ریاست نے چور نظر سے بیوی کی طرف دیکھا۔

''یہی کہ آپ دو ہزار روپے کے بندوبست کی وجہ سے فکر مند ہیں۔'' وہ سادگی سے بولی۔ ''ظاہر ہے، اتنی بڑی رقم آپ کی جیب میں تو رکھی ہو گی نہیں۔''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔''

''آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔'' وہ خلوصِ دل سے اسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔ ''میں نے گھر کے خرچے میں سے تھوڑا تھوڑا بچا کر کچھ رقم پس انداز کر رکھی ہے۔ مجھے امید ہے، دو ہزار روپے تو نکل ہی آئیں گے۔''

ریاست نے ایک گہری اور اطمینان بھری سانس خارج کی اور ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔ ''تم نے میرے دل و دماغ سے ایک بڑا بوجھ اتار دیا ہے۔''

ریاست نے کچھ بھی غلط نہیں کہا تھا۔ واقعی، وہ دو ہزار روپے کے لئے سخت فکر مند تھا لیکن اس نے محسوس کیا اس کے دل و دماغ کا بوجھ کم ہونے کی بجائے کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ اس بوجھ میں غالب وزن ان خیالات و احساسات کا تھا جو فوزیہ اور انیتا کے حوالے سے مسلسل اس کے دل و دماغ میں انگڑائیاں لے لے کر بیدار ہو رہے تھے۔

وہ رات ریاست علی نے فوزیہ اور انیتا کی یادوں سے لپٹ کر، سونے کی کوشش میں جاگتے ہوئے گزار دی۔

آئندہ روز وہ اپنی بیوی سے دو ہزار روپے لے کر ڈیوٹی پر چلا گیا پھر لنچ کے وقفے میں وہ سیدھا ایزی لائف ٹریڈرز کے آفس پہنچ گیا۔

وہاں کے تمام امور بہ احسن طریق طے پا گئے۔ ریاست علی نے دو ہزار روپے، شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی کے ہمراہ انیتا کے حوالے کئے۔ گارنٹر (ضامن) کے خانے میں مس فوزیہ کا نام درج کر دیا گیا اور ضروری مقامات پر جب ریاست علی اور فوزیہ کے دستخط ہو گئے تو مس انیتا نے اس سے کہا۔

''سر! آپ کے قرضے کے سلسلے میں ضروری کاغذی کارروائی ہو گئی ہے۔ اب آپ ایک ہفتے کے بعد آ کر معلوم کر لیں۔ اٹھانوے ہزار کے چیک کے بارے میں خلیل صاحب نے آپ کو بتا دیا ہو گا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ خلیل نے اسے بتایا تھا، ادائیگی کی پہلی قسط کاٹ کر ہی وہ چیک جاری کریں گے۔ باقی ایک لاکھ آٹھ ہزار روپے (اصل زر + مارک اپ) وہ دو ہزار

روپے ماہوار کے حساب سے وصول کریں گے۔ اس طرح مکمل ادائیگی میں چون ماہ یعنی ساڑھے چار سال کا عرصہ لگے گا۔ یہ تمام حساب کتاب تو ریاست کی سمجھ میں آ گیا تھا لیکن وہ انیتا کی زبان سے بھی تسلی کے کلمات سننا چاہتا تھا اس لئے وہ اس سے پوچھ بیٹھا۔

''جب ساری کاغذی کارروائی مکمل ہے تو پھر ایک ہفتے کی دیر کیوں؟''

''سر! آپ ہماری مجبوریوں کو بھی تو سمجھنے کی کوشش کریں۔'' وہ بڑی حسین لجاجت سے بولی۔ ''فوزیہ تو ہماری کمپنی کی ملازم ہے، اس کی گارنٹی کو چیک کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن آپ نے جو دیگر کوائف بھروائے ہیں ان کی پڑتال تو ہمیں کرنا ہے نا۔ اسی کام کے لئے ہمیں ایک ہفتہ درکار ہے۔'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لئے رکی پھر اس کا انداز رازدارانہ ہو گیا۔ تھوڑا سا آگے کو جھکتے ہوئے بولی۔

''ویری فیکیشن کے لئے ہم نے دس افراد کا عملہ رکھا ہوا ہے جو پورے کراچی میں موٹر سائیکلوں پر دن بھر چکراتے پھرتے ہیں۔ ہمارے پاس درجنوں نہیں، سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں درخواستیں ہوتی ہیں جن کی ویری فیکیشن بہت ضروری ہوتی ہے سر!'' وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ تو جانتے ہیں، پانچوں انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ کچھ لوگ ہمارے ساتھ فراڈ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ہمیں چکر دینے کے لئے درخواست قرضہ میں بعض اندراج بوگس یا غلط کروا دیتے ہیں اور ویری فیکیشن پر پتہ چلتا ہے کہ اس ایڈریس پر تو وہ شخص رہتا ہی نہیں جس نے ہمیں قرضے کے لئے درخواست دے رکھی تھی۔ اس لئے سر! ہم چیک جاری کرنے سے پہلے اپنی تسلی کی خاطر ویری فیکیشن ضرور کرواتے ہیں۔'' تھوڑا توقف کرنے کے بعد اس نے ریاست علی سے پوچھا۔ ''سر! آپ کے تمام اندراجات تو بالکل صحیح ہیں نا؟''

''صد فی صد درست۔'' وہ تیقن سے بولا۔

''یہی بات ہے نا سر!'' وہ گول مول انداز میں بولی۔ ''اب، سب لوگ آپ کی طرح ایماندار اور نستعلیق تو نہیں ہوتے نا!''

انیتا نے بڑے مدلل انداز میں اپنی بات کی وضاحت کر دی تھی۔ اگر اس موقع پر وہ کوئی نامناسب بات بھی کرتی تو اس کے دل نشیں انداز و ادا کو دیکھتے ہوئے ریاست چوں نہ کرتا!

اچانک اسے یاد آیا، انیتا اس سے کوئی ضروری بات کرنے والی تھی۔ اس نے انیتا کو یاد دلایا تو وہ چونکتے ہوئے بولی۔ ''ہاں سر! وہ میں یہ پوچھ رہی تھی کہ آپ کو ڈیوٹی فری شاپ سے کتنی تنخواہ مل جاتی ہو گی؟''

ریاست نے قدرے محتاط انداز میں کہا۔ ''آپ یہ سوال کیوں کر رہی ہیں؟''

''وہ بات دراصل یہ ہے کہ سہیل صاحب، خلیل صاحب سے بہت تنگ ہیں۔'' وہ سرگوشیانہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ اپنی بات کو ریاست کی سماعت تک پہنچانے کے لئے اسے کہنیاں ٹیک کر آگے کو جھکنا پڑا۔ ''خلیل انتہائی غصہ ور اور بدمزاج ہیں۔ کئی کلائنٹس نے ان کی شکایت بھی کی ہے۔ آپ نے بھی ان کا رویہ دیکھا ہو گا۔ سہیل صاحب ان کی چھٹی کرنا چاہتے ہیں۔ اب کمپنی خلیل صاحب کو اتنی بھاری تنخواہ دے کر اپنے کلائنٹس تو خراب کرنے سے رہی۔ اونہہ!''

انیتا نے کل ریاست کو بتایا تھا کہ ایزی لائف ٹریڈرز سے خلیل نامی اس پان خور بڈھے کو بائیس ہزار روپے ماہانہ مل رہے تھے۔ اتنی بھاری تنخواہ میں خلیل کی سنیارٹی کا بھی ہاتھ تھا۔ ریاست ہمہ تن گوش رہا۔ انیتا اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''سر! اگر آپ اس پوسٹ کے لئے انٹرسٹڈ ہوں تو میں سہیل صاحب سے بات کرتی ہوں۔ لیکن مجھے پہلے پتہ چلنا چاہئے، آپ کو ڈیوٹی فری شاپ سے کیا مل رہا ہے تاکہ میں یہاں سے آپ کو کچھ زیادہ ہی دلواؤں۔ ویسے ایک بات ذہن میں رکھئے گا۔'' وہ دوٹوک انداز اختیار کرتے ہوئے بولی۔ ''خلیل صاحب والی تنخواہ وہ کسی بھی صورت میں آپ کو نہیں دیں گے۔ سہیل صاحب، خلیل صاحب سے جان چھڑانے کے ساتھ ساتھ بچت کے موڈ میں بھی ہیں۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا۔''

انیتا نے ایسی کوئی مشکل بات نہیں کی تھی کہ اسے سمجھنے کے لئے ریاست علی کو ہل بیل جوتنے پڑتے۔ اس نے اپنی پوزیشن محفوظ رکھتے ہوئے انیتا کے اصل سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''ڈیوٹی فری شاپ میں تنخواہ کے طور پر تو مجھے دو ہزار روپے ملتے ہیں لیکن اوپر کی آمدنی کو شامل کر لیں تو حساب چھ سے سات ہزار تک جا پہنچتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں سہیل صاحب سے دس ہزار روپے کی بات کر لوں گی۔'' انیتا نے امید افزا انداز میں کہا۔ ''یہاں کا کام سمجھنے میں آپ کو زیادہ دشواری نہیں ہو گی۔ خلیل صاحب سے تو آپ ہزار درجے اچھا کام کر سکتے ہیں۔''

ریاست کو یقین نہیں آ رہا تھا، اس کی قسمت اچانک یوں بھی چمک سکتی ہے۔ ایزی لائف ٹریڈرز میں قدم رکھتے ہی گویا اس نے ترقی کے گھوڑے کی رکاب میں قدم ڈال دیا تھا۔ اسے اپنی لائف واقعی ایزی اینڈ کمفرٹ ایبل محسوس ہونے لگی۔ انیتا اپنی گفتگو میں

متعدد بار کسی سہیل صاحب کا ذکر کر چکی تھی۔ ریاست نے اس سے پوچھ لیا۔

''سہیل صاحب کا آپ کی کمپنی سے کیا تعلق ہے؟''

''وہ ایزی لائف ٹریڈرز کے ایم ڈی (مینجنگ ڈائریکٹر) ہیں۔'' انیتا نے بتایا۔ ''سمجھ لیں، وہ اس کمپنی کے مالک و مختار ہیں۔''

وہ خوشی سے پھول کر کپا ہو گیا۔ انیتا اس کی بات کو ایم ڈی سہیل صاحب تک پہنچانے والی تھی۔ اس نے پُر اشتیاق لہجے میں پوچھا۔ ''مس انیتا! آپ کب سہیل صاحب سے یہ معاملہ ڈسکس کریں گی؟''

''ابھی تو وہ امریکہ گئے ہوئے ہیں۔'' انیتا نے سرسری انداز میں کہا۔ ''واپس آ جائیں تو دیکھتی ہوں۔''

ریاست شاد شاد، ایزی لائف ٹریڈرز کے آفس سے نکل آیا۔

ایک ہفتے کے بعد وہ پھر وہاں پہنچا تو انیتا نے پُر جوش انداز میں اسے مطلع کیا۔ ''سر! مبارک ہو۔ آپ کا قرضہ منظور ہو گیا ہے۔ اب آپ مٹھائی کے لئے تیار ہو جائیں۔''

''کیا ویری فیکیشن ہو گئی؟''

''بالکل ہو گئی سر! اس کے بغیر قرضے کی منظوری کا کیا سوال!''

''لیکن میرے گھر پر یا شاپ پر آپ کا کوئی نمائندہ تصدیق کے لئے گیا ہی نہیں!'' ریاست نے حیرت سے کہا۔ واقعی اس کے پاس ایسی کوئی بھی اطلاع نہیں تھی۔

انیتا اعتماد بھرے لہجے میں بولی۔ ''سر! ہمارے ویری فیکیشن کرنے کا ایک اپنا مخصوص طریقہ کار ہے۔ ہم غیر محسوس انداز میں کام کرتے ہیں۔''

ریاست کا کام ہو رہا تھا اس لئے اس نے زیادہ جرح بحث نہیں کی اور خوش دلی سے بولا ''مٹھائی بھی آپ کو کھلا دیں گے۔ رقم کا چیک تو ہاتھ میں آ جائے۔''

وہ چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولی۔ ''سر! رقم کے چیک سے ایک بات یاد آئی۔ آپ کو ہمارے بینک میں ایک سیونگ اکاؤنٹ کھولنا ہو گا تاکہ رقم کا چیک اس میں جمع کیا جا سکے۔''

''میرے پاس ذاتی بینک اکاؤنٹ موجود ہے۔ پھر نیا اکاؤنٹ کھلوانے کی کیا ضرورت ہے؟''

''بس، اسے بھی ہماری کمپنی کا ایک اصول سمجھ لیں۔'' انیتا نے بڑی محبت سے کہا۔ ''سر! کیا آپ کو کوئی اعتراض ہے؟''

''نہیں، نہیں۔'' اس نے اتنی شدت سے نفی میں گردن ہلائی جیسے اعتراض کی صورت میں کوئی قیامت برپا ہو جائے گی۔ ''میں نے تو ایسے ہی ایک بات کہہ دی تھی۔ آپ جس بینک میں کہیں گی، میں اکاؤنٹ کھلوانے کو تیار ہوں۔'' ریاست اس وقت کاٹھ کے کسی الّو جیسا کردار ادا کر رہا تھا۔

انیتا نے کہا۔ ''سر! نیا اکاؤنٹ کھلوانے کے لئے آپ ایک ہزار روپے ادا کر دیں تاکہ میں آپ کا کام جلد از جلد کروا دوں۔''

ریاست ان دنوں ایزی لائف ٹریڈرز کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے جیب میں کچھ رقم رکھنے لگا تھا تاکہ کسی عین ضرورت کے وقت اسے کوئی شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔ اس نے کسی مطیع و فرمانبردار شخص کی مانند ایک ہزار روپے پرس میں سے نکال کر انیتا کے حوالے کر دیئے پھر دبی دبی زبان میں پوچھ لیا۔

''اندازاً کتنے دنوں میں رقم کا چیک مجھے مل جائے گا؟''

''عام طور پر تو اس پروسس میں دس سے پندرہ دن تک کا عرصہ لگ جاتا ہے۔'' انیتا نے جواب دیا۔ ''لیکن سر! میں آپ کے کیس کو ذرا جلدی فارورڈ کرانے کی کوشش کروں گی۔''

ریاست نے اطمینان بھری سانس لی اور انیتا سے پوچھا۔ ''کیا سہیل صاحب امریکہ سے واپس آ گئے؟'' اس کا یہ سوال ایک خاص مقصد کی خاطر تھا۔

''نہیں، شاید آئندہ ماہ آ جائیں۔'' انیتا نے جواب دیا۔

''کیا ان کی غیر موجودگی میں بھی کمپنی کا کام تسلی بخش انداز میں چلتا رہتا ہے؟''

''بالکل سر!'' انیتا فخریہ لہجے میں بولی۔ ''کامیاب سسٹم کا یہی تو کمال ہوتا ہے جناب!''

ریاست انیتا کا شکریہ ادا کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا تو انیتا نے کہا۔

''سر! آئندہ جب بھی آپ ہمارے آفس آئیں تو آپ کو اس قطار میں بیٹھ کر انتظار کرنا ہو گا۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے ایل شیپ میں لگی ہوئی کرسیوں کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔

ریاست کو یاد آ گیا کہ فرید مرزا سے اس کی ملاقات انہی کرسیوں پر ہوئی تھی۔ وہ پانچ لاکھ روپے قرضے کی منظوری کے بعد چیک کے انتظار میں وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے انیتا سے پوچھا۔

''اکاؤنٹ کے بارے میں مجھے کیسے پتہ چلے گا؟''

''وہ آپ مجھ سے معلوم کر سکتے ہیں۔''

ریاست وہاں سے چلا آیا۔

آئندہ ملاقات پر انیتا نے اسے اکاؤنٹ نمبر نوٹ کروا دیا۔ ''سر! آپ کا اکاؤنٹ کھل گیا ہے۔ نمبر ہے ون سیون تھری سیون ڈیش سکس۔ چیک بک اور ضروری کاغذات آپ کو بعد میں مل جائیں گے۔''

ریاست فوزیہ اور انیتا کے چکر میں اس طرح الجھ چکا تھا کہ ان سے کوئی سوال کرنا وہ گناہِ عظیم سمجھتا تھا۔ ورنہ وہ ذرا سی عقل بھی استعمال کرتا تو انیتا سے پوچھ سکتا تھا، بغیر کوئی فارم بھرے اور ضروری مقامات پر اس کے دستخط لئے اس کا کسی بینک میں اکاؤنٹ کس طرح کھل گیا؟ وہ کچھ اس طور ان دونوں کے عشوہ ادا میں گرفتار تھا کہ ڈرتا تھا، اس کا کوئی استفسار انہیں ناراض نہ کردے۔ وہ ان کی خفگی سے خوف زدہ تھا۔ ان چال باز حسیناؤں نے اس کی عقل ضبط کر کے رکھ دی تھی۔ وہ ان سے بہت سی امیدیں باندھ بیٹھا تھا۔ انیتا کے توسط سے اسے دس ہزار روپے کی ملازمت ملنے والی تھی اور فوزیہ نے علم الاعداد کی روشنی و چاشنی میں حساب لگا کر اسے بتایا تھا، عنقریب کسی عورت کی مہربانی سے اسے بہت زیادہ دولت ملنے کا امکان تھا۔ ریاست کے ذہن میں اس ''سہارا عورت'' کے حوالے سے انیتا کا چہرہ ہی گھومتا اور جھومتا رہتا تھا۔ وہ احمق یہ نہیں سمجھ رہا تھا کہ اسے کسی ایک عورت کے توسط سے بلندی نہیں ملنے والی، بلکہ دو عورتوں کی مشترکہ ''مہربانیوں'' سے اس کا سوا ستیاناس ہونے والا ہے!

ایزی لائف ٹریڈرز کی دو نمائندہ حسین اداکاراؤں نے ریاست علی کو کس طرح بے وقوف بنا کر لگ بھگ چار ہزار روپے ہتھیا لئے تھے، یہ تو واضح طور پر نظر آرہا تھا۔ وہ اپنے دوسرے ''کلائنٹس'' کو بھی یقیناً کسی نہ کسی طریقے سے چونا لگا رہے ہوں گے۔ یہ بات تو طے تھی، وہ کسی کو قرضے کی مد میں ایک پائی دینے والے نہیں تھے۔ یہ آفس انہوں نے لام پے ''لے'' کی بنیاد پر کھولا تھا۔ وال پے ''دے'' کا لفظ ان کی اول آخر فراڈ لغت میں کہیں درج نہیں تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے، جب تک بے وقوف زندہ اور موجود ہیں، عقل مند بھوکا نہیں مرسکتا۔ اس سفاک حقیقت کا بین ثبوت ''ایزی لائف ٹریڈرز'' کی صورت میں آنکھیں رکھنے والوں کو نظر آرہا تھا!

انیتا نے اسے بتایا تھا، چیک ملنے میں عموماً دس سے پندرہ دن لگ جاتے ہیں۔ وہ اسے بینک اکاؤنٹ نمبر نوٹ کروا چکی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی تاکید کردی تھی کہ آئندہ وہ اس سے رجوع کرنے کی بجائے ایل شیپ کرسیوں کی قطار سے ''رجوع'' کرے۔ وہ چونکہ انیتا اور فوزیہ کی بات کو حتمی سمجھنے لگا تھا لہٰذا ہدایات پر عمل کرنا بھی ضروری ٹھہرا۔

تیسرے ہی روز اس کی ملاقات فرید مرزا سے ہوگئی۔

''کمال ہے مرزا صاحب!'' اس نے مرزا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ ابھی تک ادھر ہی نظر آرہے ہیں؟''

''تو پھر کیا میں سمندر میں ڈوب مروں؟'' وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

مرزا کا یہ انداز ریاست کے لئے بالکل نیا اور حیران کن تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے مرزا صاحب! آج آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔ خیریت تو ہے نا؟''

''خیریت کہاں ہے میاں!'' وہ اپنے لہجے کو نرم کرتے ہوئے بولا۔ ''میں تو ان بدمعاشوں کی وجہ سے پریشان ہو کر رہ گیا ہوں۔ پانچ لاکھ روپے کے قرضے کے لالچ میں، میں اب تک لگ بھگ بیس ہزار روپے ان کو دے چکا ہوں لیکن چیک ہے کہ ملنے کا نام ہی نہیں لے رہا!''

''مرزا صاحب!'' وہ اپنی معلومات کا دریا بہاتے ہوئے بولا۔ ''چیک ایشو ہونے میں دس سے پندرہ دن .....''

''بس میاں! مجھے یہ کہانی مت سناؤ'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ''میں ایک ماہ سے ان کرسیوں پر بیٹھ کر چیک کا انتظار کر رہا ہوں۔ ایک ماہ پہلے تمام پراسس ہوگیا تھا۔ اب یہ لوگ آئے روز مجھے ٹہلا رہے ہیں۔ کبھی کوئی بہانہ تو کبھی کوئی بہانہ۔ میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ خوبصورت لڑکیوں کے ذریعے بڑا حسین ''فراڈ بزنس'' کر رہے ہیں۔ یہ حرافائیں .....'' اس نے فوزیہ اور انیتا کی جانب باقاعدہ انگلی سے اشارہ بھی کر دیا۔ ''لوگوں کو اپنے ناز نخروں سے پھانس کر رکھتی ہیں۔ میں نے تو صرف بیس ہزار گنوائے ہیں، پتہ نہیں کتنے لوگ لاکھوں کروڑوں روپے پھنسائے بیٹھے ہوں گے؟''

ریاست کو مرزا کی باتیں اچھی نہیں لگیں۔ وہ ایزی لائف ٹریڈرز کو برا بھلا اور فراڈ کہہ رہا تھا اور خاص طور پر جب اس نے انیتا اور فوزیہ کے لئے حرافہ کا لفظ استعمال کیا تو اس کے شیشۂ دل کو ٹھیس لگی۔ اس نے جی ہی جی میں مرزا کو ایک لاکھ سنائیں اور رسماً پوچھ لیا جیسے بن بلائے اور زبردستی مسلط مہمان کو جھوٹے منہ پوچھا جاتا ہے، آپ گرم لیں گے یا ٹھنڈا یا پھر کھانے کا انتظام کیا جائے!

''مرزا صاحب! آپ کے بقول، یہ لوگ مختلف حیلوں بہانوں سے ایک ماہ سے آپ کو ٹہلا رہے ہیں۔ چیک نہ دینے کی کوئی وجہ بھی تو بتائی ہوگی انہوں نے؟''

وہ جلے بھنے انداز میں بولا۔ ''کہتے ہیں، ایم ڈی صاحب امریکہ گئے ہوئے ہیں۔ وہ

واپس آ جائیں تو چیک جاری ہو جائے گا۔ اور یہ نہیں بتاتے کہ ایم ڈی صاحب واپس کب آئیں گے!''

''ایم ڈی صاحب امریکہ تو واقعی گئے ہوئے ہیں۔'' ریاست نے تصدیقی انداز میں کہا۔ ''لیکن اس کمپنی میں اتنا اچھا سسٹم رائج ہے کہ ایم ڈی صاحب کی غیر موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہاں کے سارے معاملات بخیر و خوبی انجام پا رہے ہیں۔''

''سسٹم!'' فرید مرزا نے دانت پر دانت جما کر زہر خند لہجے میں یہ ایک لفظ ادا کیا پھر خواب ناک لہجے میں بولا۔ ''فکر نہ کرو، تم بھی اسی سسٹم کی دھار پر ہو۔ میری تو آج عاصم صاحب سے میٹنگ ہے۔ ایم ڈی کی غیر موجودگی میں وہی یہاں سب سے زیادہ سینئر ہیں۔ میں ان سے صاف صاف کہہ دوں گا، مجھے کوئی قرضہ ورضہ نہیں چاہئے۔ آپ لوگ میرے بیس ہزار روپے واپس کر دیں۔ عاصم صاحب جی ایم ہیں، کوئی تو تسلی بخش جواب دیں گے نا آخر۔''

اس نے بات ختم ہی کی تھی کہ عاصم صاحب کے لئے اس کی ملاقات آ گئی۔ فرید مرزا پندرہ منٹ تک جی ایم کے کمرے میں بند رہا، پھر جھنجلایا، سٹ پٹایا سا نکلا اور ریاست کی طرف نگاہ ڈالے بغیر وہ آفس سے نکل گیا۔ ریاست نے اندازہ لگا لیا، اندر عاصم صاحب سے اس کی اچھی خاصی گرما گرمی ہوئی ہو گی!

مرزا کے رخصت ہونے کے بعد ریاست انیتا کے پاس پہنچا اور اسے مرزا کے کمپنی کے بارے میں خیالات سے آگاہ کیا۔ وہ سرسری سے لہجے میں بولی۔

''سر! آپ خود سوچیں، ہم نے یہاں کوئی لوٹ سیل تو نہیں لگا رکھی کہ آنکھیں بند کر کے چیک بانٹتے رہیں۔ مرزا صاحب نے جو کوائف دیئے تھے، ان میں خاصی گڑبڑ ہے۔ ہم نے اپنے ویری فیکیشن ڈیپارٹمنٹ سے کراس چیک بھی کرایا ہے اور پتہ چلا ہے، مرزا نے اچھی خاصی غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ ہم نے انہیں اس بارے میں بتایا تو وہ ایک سیاسی شخصیت کی سفارش لے کر آ گئے۔ ان کا چیک اسی وجہ سے رکا ہوا ہے۔ بس ایم ڈی صاحب کا انتظار ہے۔ ہم ان کی غیر موجودگی میں کوئی ڈیسیشن نہیں لے سکتے۔''

انیتا کی وضاحت نے وقتی طور پر اس کی تسلی کر دی لیکن مرزا کی باتیں اس کے دماغ میں چکراتی رہیں۔ اگلے روز سے اسے آفس میں مرزا کی شکل دکھائی نہ دی۔ اس نے انیتا سے پوچھا تو پتہ چلا، مرزا اور عاصم میں خاصی تلخ کلامی ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں عاصم صاحب نے اسے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ ہم اس کا کیس ختم کر رہے ہیں۔ اب وہ ہم سے کسی

قرضے کی امید نہ رکھے اور اپنی دی ہوئی رقم ایک ہفتے کے بعد آ کر لے جائے۔ ہم اس قسم کے پھڈے باز سیاسی لوگوں سے لین دین نہیں کرتے۔

اس وضاحت نے کمپنی کی جانب سے ریاست کا دل صاف کر دیا۔ لیکن یہ صفائی زیادہ عرصے تک برقرار نہ رہ سکی۔ مرزا نے جو اس کے ذہن میں شک کا بیج بو دیا تھا، اس نے دیکھتے ہی دیکھتے جڑ پکڑ لی پھر ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس میں سے کونپلیں پھوٹنے لگیں۔ اسی دوران میں وہ دس پندرہ دن بھی گزر گئے جس مدت میں اسے یقیناً چیک مل جانا تھا۔ لیکن نہ اسے چیک ملا اور نہ ہی فرید مرزا سے پھر ملاقات ہوئی۔ اب اسے مرزا کا انتظار رہنے لگا تھا کہ معلوم کرے، عاصم صاحب سے اس کی کیا بات ہوئی ہے۔ مرزا کے مسلسل غیاب کو دیکھ کر اس نے اندازہ لگا لیا کہ شاید وہ اپنے بیس ہزار روپے وصول کر کے اس کمپنی کا راستہ بھول گیا۔ رفتہ رفتہ اس کے ذہن میں یہ خیال پختہ ہوتا گیا کہ ''ایزی لائف ٹریڈرز'' والے لائف کو ایزی بنانے کی بجائے ہارڈ بنا رہے ہیں۔ کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ کیا اور کہاں گڑبڑ ہے؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کا کیس تو نیٹ اینڈ کلین تھا۔ پھر چیک ایشو ہونے میں کیوں تاخیر ہو رہی تھی؟

فوزیہ پچھلے دو چار دن سے اپنی سیٹ پر دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کی جگہ ایک دوسری لڑکی نظر آ رہی تھی۔ ریاست آج دوٹوک بات کرنے آیا تھا۔ وہ سیدھا انیتا کے پاس پہنچا اور کہا۔

''مس انیتا! آخر آپ لوگ مجھے چیک کب دیں گے؟''

''بس سر! تھوڑا سا مسئلہ چل رہا ہے۔'' وہ ٹرخانے والے انداز میں بولی۔ ''چند دن میں آپ کا چیک مل جائے گا۔''

آج انیتا کے رویے میں فرحت بخش سامان نہیں تھا جس کا ریاست کو بارہا خوش گوار تجربہ ہو چکا تھا۔ اس نے محسوس کر لیا وہ اسے ٹالنے کے چکر میں تھی۔ انیتا کے خشک انداز سے مرزا کی کہی ہوئی تلخ اور ترش باتوں کی تصدیق ہونے لگی تو اس نے بیزاری سے کہا۔

''ابھی تک آپ نے مجھے نئے اکاؤنٹ کی چیک بک اور دیگر ضروری کاغذات بھی نہیں دیئے؟''

''وہ بھی جلد ہی مل جائیں گے۔'' اس مرتبہ پہلی دفعہ انیتا نے اسے ''سر'' نہیں کہا تھا۔

ریاست کے دل کو ٹھیس لگی۔ وہ اس حسینہ سے ڈھیروں امیدیں باندھ بیٹھا تھا لیکن اب اسے محسوس ہو رہا تھا، اس نے سخت غلطی کی تھی۔ امیدیں باندھنے میں بھی اور چار ہزار

روپے پھنسانے میں بھی۔ اس کے ذہن میں فرید مرزا کے الفاظ گونجنے لگے ...... یہ لوگ خوبصورت لڑکیوں کے ذریعے بڑا حسین ''فراڈ بزنس'' کر رہے ہیں۔ یہ حرافائیں لوگوں کو اپنے ناز نخروں سے پھانس کر رکھتی ہیں ...... ریاست کو لگا، اس کے چار ہزار روپے گئے! یہ سوچتے ہی اس نے ایک حتمی فیصلہ کر لیا۔

''ایم ڈی سہیل صاحب امریکہ سے واپس آ گئے؟'' اس نے روکھے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں جی، ابھی تو نہیں آئے۔'' افیتا نے جواب دیا اور دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئی۔

''میں جی ایم صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔'' ریاست نے اٹل لہجے میں کہا۔

افیتا نے گردن اٹھا کر عجیب سی نظر سے ریاست کو دیکھا، ایک لمحے تک کچھ سوچا پھر اسے جی ایم عاصم کے کمرے کا راستہ دکھا دیا۔ ریاست اس کے پاس سے اٹھا اور جنرل منیجر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

اسی روز سہ پہر کے بعد ریاست کو ''ایزی لائف ٹریڈرز'' کے جنرل منیجر عاصم کے قتل کے الزام میں ڈیوٹی فری شاپ سے گرفتار کر لیا گیا۔

❋❋❋

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے چالان پیش کر دیا۔

میں نے ملزم ریاست کی درخواست ضمانت کے ساتھ اپنا وکالت نامہ دائر کر دیا۔ ملزم نے مجھے اپنے ساتھ ہونے والے خوبصورت فراڈ کی بدصورت کہانی بڑی تفصیل سے سنائی تھی اور میں نے اپنی کوشش آپ کے تحت بھی بھاگ دوڑ کر کے اِدھر اُدھر سے بہت سی معلومات اکٹھا کر لی تھیں۔ اس سلسلے میں ڈیوٹی فری شاپ کے سپروائزر اجمل بٹ نے بھی مجھ سے بہت تعاون کیا تھا۔ اسی کی مدد سے میں ایزی لائف ٹریڈرز کے بارے میں انکشاف انگیز معلومات سے مستفید ہوا۔ بٹ بڑا جہاں دیدہ اور باخبر شخص تھا۔ اس نے کئی مرتبہ اس افسوس کا اظہار کیا کہ اگر ریاست اسے اپنے معاملے کے بارے میں پہلے بتا دیتا تو اسے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ بہرحال، سچی بات تو یہ ہے کہ جو کام جس طرح ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے!''

عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا تو میں نے اپنے موکل کے حق میں بولنا شروع کیا۔ میں نے اسے معصوم اور سادہ لوح گردانتے ہوئے معزز عدالت کو بتانے کی کوشش کی کہ وہ بے گناہ ہے اور ایک خطرناک سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کو قتل کے اس مقدمے میں گھسیٹنے کی

پلاننگ کی گئی ہے۔ لیکن عدالت نے میری بات پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ استغاثہ نے میرے موکل کے خلاف بڑا مضبوط کیس بنایا تھا۔ استغاثہ کے گواہوں نے اس مضبوطی کو اور بھی پختہ کر دیا تھا۔

مجھے عدالت کے رویے پر کوئی حیرت ہوئی اور نہ ہی مایوسی کیونکہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا، فوجداری مقدمات میں آسانی سے ضمانت نہیں ہوتی لہٰذا میں مطمئن رہا کہ جب استغاثہ کے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوگا تو میں اس کیس کا پانسہ پلٹ کر رکھ دوں گا۔ یہ اطمینان اور اعتماد مجھے اپنی صلاحیتوں اور کیس کے ذیل میں کی جانے والی تیاری کی بناء پر تھا۔

اس روز عدالت نے ملزم کی درخواست ضمانت کو مسترد کرتے ہوئے میرے موکل ریاست علی کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا۔ پھر جج نے آئندہ پیشی کے لئے دس دن بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ وغیرہ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس رپورٹ کے مطابق مقتول عاصم کی موت سترہ جنوری کی دوپہر دو اور تین بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ ''ایزی لائف ٹریڈرز'' کے جنرل منیجر کو کاغذ کاٹنے والی چھری (پیپر نائف) سے قتل کیا گیا تھا۔ معمولی سے کام کے لئے استعمال ہونے والا یہ آلہ بڑا ہی خطرناک ثابت ہوا تھا۔ وقوعہ پر عاصم کی لاش کے ساتھ ہی آلہ قتل بھی پایا گیا تھا، یعنی یہ خطرناک پیپر نائف مقتول کے سینے میں عین دل کے مقام پر گھونپا گیا تھا۔ مقتول اپنے کمرے میں، اپنی کرسی پر مُردہ حالت میں پڑا ملا تھا۔

فنگر پرنٹس کی رپورٹ کو بھی میں نے بڑے غور سے دیکھا۔ مقتول کے کمرے کے دروازے پر اور کمرے کے اندر بھی ایک دو جگہ پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے لیکن آلۂ قتل پر ملزم کے فنگر پرنٹس نہیں مل سکے تھے۔ علاوہ ازیں کچھ اور بھی ضروری کاغذات ان رپورٹس کے ساتھ منسلک تھے۔ میں نے ان کا بھی مطالعہ کیا اور ان میں درج اہم نکات کو ذہن نشین کر لیا۔

پولیس چالان، یعنی استغاثہ کے مطابق ملزم نے جن ٹرمز اینڈ کنڈیشنز کے تحت کمپنی سے قرضہ حاصل کرنے کی درخواست دی تھی وہ ان سے منحرف ہو گیا تھا۔ وہ کمپنی پر ناجائز دباؤ ڈالنے لگا کہ اسے مقررہ وقت سے پہلے قرضے کا چیک جاری کیا جائے لیکن کمپنی فردِ واحد کے لئے اپنے قوانین و قواعد کو بدل نہیں سکتی تھی۔ اس انکار پر ملزم نے کمپنی کے ملازمین سے بدتمیزی کی اور انہیں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دینے لگا۔ اس بدمزگی اور امن و امان کی

صورتحال کو دیکھتے ہوئے کمپنی کی ایک ذمے دار ملازمہ مس امیتا نے اسے مشورہ دیا کہ وہ چیخنے چلانے کی بجائے جا کر ایم ڈی صاحب سے ملاقات کر لے۔ وہ اس کے غصے کو ٹھنڈا کر دیں گے۔ اس پر ملزم نے کھا جانے والی نظر سے مس امیتا کو دیکھا اور یہ کہتے ہوئے جنرل منیجر کے کمرے کی طرف بڑھ گیا کہ وہ آج اس کمپنی کے ایک ایک فرد سے مل کر جائے گا۔ لگ بھگ پندرہ منٹ بعد وہ مقتول کے کمرے سے باہر نکلا اور کسی سے کوئی بات کیے بغیر کمپنی کے دفتر سے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایم ڈی سہیل صاحب کو اپنے جنرل منیجر سے کوئی کام پڑا تو اس نے اپنی سیکرٹری شہناز سے کہا، وہ عاصم کو اس کے پاس بھیج دے۔ سیکرٹری شہناز جب جنرل منیجر کو بلانے اس کے کمرے میں پہنچی تو وہ اپنی سیٹ پر مُردہ پڑا ہوا تھا۔ کمپنی کے دفتر میں ایک افراتفری مچ گئی۔ فوراً پولیس کو بلایا گیا اس کے بعد موقع کی کارروائی ہوئی اور پولیس یہ جاننے میں کامیاب ہوگئی کہ سب سے آخر میں کون شخص مقتول کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ ریاست علی کا نام سامنے آتے ہی پولیس سرگرم ہوگئی۔ کمپنی کے پاس اس کے گھر اور ڈیوٹی فری شاپ کا ایڈریس موجود تھا چنانچہ ٹھیک پانچ بجے اسے ڈیوٹی فری شاپ سے گرفتار کرلیا گیا۔

استغاثہ کی رپورٹ میں بہت سی باتیں بے بنیاد اور جھوٹی تھیں اور مجھے دودھ کا دودھ، پانی کا پانی کر کے اپنے مؤکل کو باعزت بری کروانا تھا۔ آئندہ پیشی سے پہلے میں نے اس کیس کا اچھی طرح مطالعہ کیا، اس کے ایک ایک پہلو پر غور کرنے کے علاوہ کچھ فیلڈ ورک بھی کیا، خاص طور پر ''ایزی لائف ٹریڈرز'' کے بارے میں، میں نے اتنی محنت سے تحقیق کی جیسے اس کمپنی پر میرا پی ایچ ڈی کرنے کا ارادہ ہو۔ اس سلسلے میں اجمل بٹ نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا۔ ان تمام اہم باتوں کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب مواقع پر آتا رہے گا۔

آئندہ پیشی پر عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی لیکن ملزم نے صحتِ جرم سے انکار کر دیا۔ پولیس کے بہیمانہ تشدد سے بچنے کے لئے ریاست نے میری ہدایت کے مطابق، ریمانڈ کی مدت کے دوران میں اقبالِ جرم کرلیا تھا لیکن پولیس کسٹڈی میں دیئے گئے ملزم کے بیان کو عدالت کوئی اہمیت نہیں دیتی۔ دونوں جانب کے وکلاء اور گواہوں کو ناپنے تولنے کے بعد ہی عدالت فیصلہ سناتی ہے۔ اگر عدالت کے فیصلے پولیس چالان پر ہونے لگیں تو پھر عدالت کی ضرورت اور جواز ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔

جج کی اجازت سے عدالتی کارروائی آگے بڑھی اور استغاثہ کی طرف سے گواہوں کا

سلسلہ آغاز ہوا۔ سب سے پہلے ''ایزی لائف ٹریڈرز'' کا ملازم خلیل گواہوں والے کٹہرے میں آیا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا اور اپنا بیان ریکارڈ کروا دیا۔ اس نے اپنے بیان میں ملزم کے خلاف حتیٰ الامکان زہرافشانی کی کوشش کی تھی۔ اس کا بیان مکمل ہو چکا تو وکیل استغاثہ جرح کے لئے آگے بڑھا۔

میں نے اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے گواہ سے پوچھا۔ ''مسٹر خلیل! آپ ملزم کو کس حد تک جانتے ہیں؟''

گواہ نے ناپسندیدہ نظر سے ملزم کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''جناب! میری اس سے کوئی پرانی شناسائی تو نہیں۔ بس، کمپنی کے حوالے سے ایک دو ملاقاتیں ہی ہیں۔''

''آپ نے ان ملاقاتوں میں ملزم کو کیسا پایا؟'' وکیل استغاثہ نے سوال کیا۔

وہ جلدی سے بولا۔ ''انتہائی بدتمیز اور غصہ ور۔''

''وقوعہ کے روز آپ دفتر میں موجود تھے؟''

''جی ہاں۔ میں شاذ و نادر ہی چھٹی کرتا ہوں۔''

''اس روز ملزم آپ کے دفتر میں آیا تھا۔'' وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ نے اس کے رویے میں کوئی خاص بات نوٹ کی تھی؟''

''جناب! اس شخص کے رویے کی سب سے خاص اور بری بات تو یہ ہے کہ یہ بڑا بدمزاج اور چڑچڑا ہے۔'' استغاثہ کے گواہ خلیل نے ایک مرتبہ پھر ناپسندیدہ نظر سے ملزم کو دیکھا۔

''وقوعہ کے روز ملزم نے کوئی خاص قسم کی بدتمیزی کی تھی؟''

''یہ پہلے سیدھا میرے پاس ہی آیا تھا۔'' گواہ نے بتایا۔ ''کافی دیر تک میرا بھیجا کھاتا رہا۔ میں نے زچ ہو کر اسے مس امیتا کے پاس بھیج دیا تھا۔'' وہ ایک لمحے کو رکا پھر خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ ''اور اسی روز میں نے فیصلہ کرلیا تھا، کبھی کسی کو کوئی خاص فیور نہیں دوں گا۔''

وکیل استغاثہ نے جیسے اس کے آخری جملے سنے ہی نہیں۔ اس نے اگلا سوال کیا۔ ''خلیل صاحب! واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ملزم نے وقوعہ کے روز مس امیتا سے بھی اچھی خاصی بدتمیزی کی تھی۔ مس امیتا نے اسے کمپنی کے منیجنگ ڈائریکٹر سے ملنے کا مشورہ دیا اور یہ اندھے بیل کی مانند اٹھ کر جنرل منیجر کے کمرے.....''

''آئی آبجیکٹ یور آنر!'' میں نے تیز آواز میں کہا۔ ''وکیل سرکار میرے مؤکل کے لئے

اخلاق سے گرے ہوئے نازیبا الفاظ کا استعمال کر رہے ہیں۔ انہیں اس بات سے روکا جائے۔"

جج نے میرے اعتراض کو درست تسلیم کیا اور وکیل استغاثہ کو تاکید کی کہ وہ اپنے سوال میں سے "اندھے بیل" کے الفاظ کو خارج کر دے۔ وکیل استغاثہ نے معاندانہ نظر سے مجھے دیکھا پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"ہاں تو خلیل صاحب! وقوعہ کے روز ملزم ایم ڈی سے ملنے کی بجائے جی ایم کے کمرے میں گھس گیا تھا۔ آپ کے اندازے کے مطابق ملزم نے اس کمرے میں کتنا وقت گزارا ہو گا؟"

"کم از کم پندرہ منٹ بعد وہ باہر نکلا تھا۔" گواہ نے جواب دیا۔

"باہر نکل کر اس نے کیا، کیا؟" وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

"وہ جتنا کچھ اندر کر آیا تھا اس کے بعد باہر کرنے کی گنجائش کہاں تھی؟"

"میرا مطلب ہے، اس نے مقتول کے کمرے سے نکل کر کسی کو کوئی دھمکی وغیرہ تو نہیں دی تھی؟" وکیل استغاثہ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ جی ایم کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اس نے مس انیتا سے بڑے ڈرامائی انداز میں کہا تھا...... آج وہ اس کمپنی کے ایک ایک فرد سے مل کر جائے گا؟"

گواہ نے نفی میں سر ہلایا اور کہا۔ "نہیں جناب! ملزم نے مقتول کے کمرے سے باہر آنے کے بعد کمپنی کے ملازم سے کوئی بات نہیں کی اور تیز قدموں سے چلتے ہوئے وہ دفتر سے نکل گیا۔"

"کیا اس کے رخصت ہونے کا انداز کسی خاص جانب اشارہ کرتا تھا؟"

"یہی محسوس ہوتا تھا، وہ کوئی سنگین واردات کر کے موقع سے فرار ہو رہا ہو!"

وکیل استغاثہ نے دو چار مزید سوالات پوچھنے کے بعد جرح موقوف کر دی تو جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد میں وٹنس باکس (گواہوں والے کٹہرے) کے نزدیک آ گیا۔ میں نے چند لمحات تک گہری نظر سے استغاثہ کے گواہ خلیل کے چہرے کا بہ غور جائزہ لیا پھر کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"مسٹر خلیل! ملزم سے آپ کی کوئی خاص دشمنی ہے؟"

وہ میرے اس چبھتے ہوئے سوال سے گڑبڑا گیا، جلدی سے بولا۔ "نہیں...... ایسی تو کوئی بات نہیں!"

"پھر آپ اس کے خلاف اتنا زیادہ زہر کیوں اگل رہے ہیں؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں نے ملزم کے بارے میں اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ یہ شخص واقعی بدتمیز، غصہ ور اور انتہائی چڑچڑا ہے۔ اس کے رویے سے یہ ظاہر ہوتا ہے جیسے یہ ہم سے قرض لینے نہ آیا ہو بلکہ ہم اس کے قرض کے نیچے دبے ہوئے ہوں۔ ایسے تو کوئی اپنے ذاتی ملازموں سے بھی ٹریٹ نہیں کرتا جیسا سلوک اس نے ہمارے ساتھ اپنا رکھا تھا۔"

"مسٹر خلیل! آپ "ایزی لائف ٹریڈرز" کے ملازم ہیں اور اس کمپنی کے ضوابط و قواعد سے آپ کو اچھی طرح آگاہی حاصل ہے۔ خاص طور پر اس لئے بھی کہ آپ جس پوسٹ پر بیٹھے ہیں وہاں کلائنٹس کو ہر قسم کی معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔" میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "استغاثہ میں ایک نکتہ یہ بھی اٹھایا گیا ہے کہ ملزم کمپنی کی ٹرمز اینڈ کنڈیشنز سے پھر گیا تھا اور دباؤ ڈال رہا تھا کہ اسے قبل از وقت قرضے کا چیک جاری کر دیا جائے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟"

"استغاثہ کا یہ دعویٰ بالکل درست ہے جناب!" خلیل نے جواب دیا۔ "ہم قرضے کے خواہش مند سے ایک فارم پُر کرواتے ہیں جس میں اس کے تمام تر کوائف کے علاوہ قرضے کی رقم، ادائیگی کا طریقہ کار اور دیگر اہم امور شامل ہوتے ہیں۔ اسی مطبوعہ فارم کی پشت پر کمپنی کے قواعد وضوابط بھی درج ہیں۔ چیک کے اجراء کے سلسلے میں بھی بڑے واضح الفاظ درج ہیں کہ درخواست کی منظوری کے نوے دن بعد چیک ایشو کر دیا جائے گا۔ لیکن ملزم دس بارہ دن کے بعد ہی ہم پر اکڑنے لگا کہ فوراً سے پیشتر چیک اس کے ہاتھ میں تھما دیا جائے۔ اس رویے سے آپ ملزم کے مزاج اور ذہنیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔"

میں نے اپنی کوشش سے "ایزی لائف ٹریڈرز" کا مذکورہ فارم حاصل کر کے اچھی طرح اس کا مطالعہ کر لیا تھا۔ خلیل جو کچھ کہہ رہا تھا وہ بھی غلط نہیں تھا لیکن فرم کی پشت کی چھپائی اتنے چھوٹے پوائنٹ میں کی گئی تھی کہ بالکل درست نگاہ رکھنے والا بھی محدب عدسے کے بغیر ان شقوں کو نہیں پڑھ سکتا تھا، سمجھنا تو بہت آگے کی بات ہے!

"ایزی لائف ٹریڈرز" جیسی بوگس اور فراڈ کمپنیاں اپنے بروشرز اور فارمز میں اسی انداز سے قواعد وضوابط کا اندراج کرتی ہیں۔ اس طریقہ واردات سے انہیں اپنے کلائنٹ کو ڈیفالٹر کرنے میں بڑی آسانی رہتی ہے جیسا کہ ریاست علی کے کیس میں ہو رہا تھا۔

میں نے استغاثہ کے گواہ خلیل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اتفاق سے میں آپ

کی کمپنی کا درخواست فارم دیکھ چکا ہوں۔ آپ نے اس کی پشت پر درج جن قواعد وضوابط کا ذکر کیا ہے وہ بھی اپنی جگہ درست ہیں لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ فارم پُر ہونے کے بعد آپ لوگوں کے پاس ہی رہتا ہے، کلائنٹ کو اس کے تفصیلی مطالعے کا موقع نہیں ملتا......''

''اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو کلائنٹ کی......''

میں نے بھی جواباً اس کی بات کاٹ دی اور اپنی اُدھوری بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''اور کلائنٹ آپ لوگوں کے زبانی وعدوں پر بہلتا رہتا ہے۔ اسے کمپنی سے ایک بڑی رقم ملنے کی امید ہوتی ہے اس لئے وہ آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتا ہے کہ دس پندرہ دن کے بعد چیک اس کی جیب میں آ جائے گا۔ یہ ایک طرح کی دھوکے بازی ہی کہلائے گی نا۔''

اس نے بڑے تحمل سے میری بات سنی اور طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''ہم کسی کلائنٹ سے کوئی فراڈ وغیرہ نہیں کرتے۔ یہ تو کلائنٹ کی ذمہ داری ہے کہ وہ فارم سائن کرنے سے پہلے اس کے مندرجات کا اچھی طرح مطالعہ کر لے۔ اگر وہ نوٹوں کے تصور میں آنکھیں بند کئے رہتا ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟'' وہ لمحہ بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''یہ بات بھی بالکل غلط ہے کہ ہم نے ملزم سے دس پندرہ دن بعد چیک دینے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ ہم اس کی خاطر کمپنی کے اصولوں کو تو نہیں توڑ سکتے۔ میں نے بھی اور مس انیتا نے بھی بڑے واضح الفاظ میں اسے بتا دیا تھا کہ قرضے کی منظوری کے نوے دن یعنی تین ماہ کے بعد اسے چیک جاری کیا جائے گا۔ ہم اپنے وعدے سے منحرف نہیں ہوئے اور نہ ہی ہوتے ہیں۔ آپ ہمیں کس طرح قصور وار ٹھہرا سکتے ہیں؟''

''ایٹ لیسٹ...... آپ لوگ اتنا تو کر سکتے ہیں کہ درخواست فارم کی پشت پر درج قواعد وضوابط ہی کو تھوڑا جلی کروا دیں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''یہ تجویز آپ کمپنی کے ایم ڈی کو دیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔'' وہ رکھائی سے بولا۔

میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ایم ڈی صاحب امریکہ سے واپس آ جائیں تو ان سے بھی ڈھیروں باتیں ہوں گی۔''

''ایم ڈی اور امریکہ'' والی بات میں نے ایک خاص مقصد کے تحت کہی تھی اور فوراً ہی مجھے خلیل کے چہرے سے اس کا جواب بھی مل گیا۔ وہ جلدی سے بولا۔

''ایم ڈی صاحب تو آج کل پاکستان ہی میں ہیں۔''

''اچھا!'' میں نے کافی کھینچ کر کہا۔ ''میں نے تو سنا تھا وہ کافی عرصے سے وہاں گئے ہوئے ہیں اور واپس آنے کا نام ہی نہیں لے رہے۔ حالانکہ یہاں ایزی لائف ٹریڈرز کے

کلائنٹس کی لائف خاصی ہارڈ ہو چکی تھی؟''

وہ میرے طنز کو پیتے ہوئے وضاحتی لہجے میں بولا۔ ''اس مرتبہ انہیں امریکہ میں کافی دن لگ گئے۔ بہرحال آپ کو کسی نے ان کے بارے میں بالکل غلط بتایا ہے۔ وہ وقوعہ سے دو روز پہلے ہی واپس آئے ہیں۔''

وہ دوسرا جھوٹ بول رہا تھا۔ میں نے اپنی تحقیق سے معلوم کر لیا تھا، ایم ڈی سہیل امریکہ نہیں گیا تھا بلکہ یہ کہانی کلائنٹس کو دھوکا دینے کے لئے گھڑی گئی تھی۔ وہ اکثر و بیشتر اپنے کمرے میں موجود ہوتا اور چیک ملنے کے منتظر افراد کو مختلف حیلوں اور بہانوں سے وعدۂ فردا پر ٹرخا دیا جاتا اور ان بہانوں میں ایک یہ بھی تھا کہ ایم ڈی صاحب امریکہ گئے ہوئے ہیں۔

میں نے جرح کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''خلیل صاحب! آپ نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا، وقوعہ کے روز ملزم کافی دیر تک آپ کا بھیجہ کھاتا رہا تھا اور تنگ آ کر آپ نے اسے مس انیتا کے پاس ریفر کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے خود کلامی کے انداز میں یہ جملہ بڑبڑایا تھا...... میں نے فیصلہ کر لیا ہے، کبھی کسی کو کوئی خاص فیور نہیں دوں گا...... وکیل استغاثہ نے شاید آپ کا یہ جملہ نہیں سنا یا اگر سنا تو کوئی توجہ نہیں دی۔ لیکن میں آپ کی بات کو خاص اہمیت دینا چاہتا ہوں۔ یہ بتائیں، کسی کو کوئی خاص فیور دینے یا نہ دینے سے آپ کی کیا مراد تھی؟''

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر گویا ہوا۔ ''میں دراصل ملزم ہی کی بات کر رہا تھا۔ جس دن یہ پہلی مرتبہ ہمارے آفس میں آیا تو اس کا ٹوکن نمبر بہت بعد کا تھا لیکن پتہ نہیں، اس نے ٹوکن دینے والی لڑکی سے کیا کھسر پھسر کی کہ اس نے ملزم کی سفارش کر دی۔ ملزم کے آگے مجھ سے ملنے کے لئے کئی افراد بیٹھے تھے لیکن میں نے کوئی چکر چلا کر اسے پہلے بلا لیا۔ بس اتنی سی بات ہے۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''بعد میں اس کمبخت نے میرے ساتھ جس رویے کا مظاہرہ کیا اس کو دیکھتے ہوئے میں نے جھنجلا کر کہا تھا کہ میں آئندہ کسی کو کوئی خاص فیور نہیں دوں گا۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''خلیل صاحب! آپ کی وضاحت سے تین باتیں تو واضح ہو گئیں۔''

میں ڈرامائی انداز میں رکا تو وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''نمبر ایک، آپ کے ہاں سفارش بھی

چلتی ہے۔ جہاں سفارش چلتی ہو، وہاں بے ایمانی اور فراڈ کے قوی امکانات ہوتے ہیں۔ نمبر دو، آپ نے بتایا ہے، ملزم نے ٹوکن دینے والی لڑکی سے کچھ کھسر پھسر بھی کی تھی جس کے نتیجے میں مذکورہ لڑکی نے آپ سے ملزم کی سفارش کر دی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے آپ کی کمپنی کی حسین و جمیل لڑکیاں وہاں آنے والے افراد سے کھسر پھسر کر کے آؤٹ آف دی وے کام بھی کرتی ہیں۔ اور نمبر تین، ملزم سے آگے کئی افراد آپ سے ملاقات کے لئے اپنی باری کے منتظر تھے لیکن آپ نے ٹوکن والی لڑکی کی ''بات'' کو اہمیت دی اور ان سب کا استحصال کرتے ہوئے ملزم کو پہلے اٹینڈ کر لیا۔ یہ بھی کرپشن کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے خلیل صاحب!''

میں لمحے بھر کو سانس لینے کے لئے رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جس طرح رشوت لینے اور رشوت دینے والا جہنمی ہیں، بالکل اسی طرح سفارش کرنے اور سفارش سننے والا بھی......''

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ نے اپنی موجودگی کا یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ''عدالت میں اس وقت عاصم مرڈر کیس کی سماعت ہو رہی ہے اور ڈیفنس کونسلر ایزی لائف ٹریڈرز کے دفتری امور میں الجھ کر معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ انہیں پابند کیا جائے کہ وہ متعلقہ کیس تک ہی محدود رہیں۔''

وکیل استغاثہ کی اس حرکت پر گواہ خلیل نے سکھ کی سانس لی کہ کوئی تو ہے جو اس کے حق میں بولا۔ ورنہ میں اسے بری طرح گھیر کر لا جواب کر چکا تھا۔ میں نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کے جواب میں کہا۔

''جناب عالی! مقتول ایزی لائف ٹریڈرز کا جنرل منیجر تھا لہٰذا اس کے قتل کے کیس کی سماعت کے دوران مذکورہ کمپنی اور اس کے دفتری امور کا زیر بحث آنا فطری بات ہے۔ اس فعل سے عدالت کا قیمتی وقت کیسے برباد ہو سکتا ہے؟''

جج نے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں چند منٹ باقی تھے۔ اس نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کو نظر انداز کرتے ہوئے نہایت ہی معقول بات کی۔ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''وکیل صاحب! آپ استغاثہ کے گواہ سے کچھ اور بھی پوچھنا چاہتے ہیں تو پوچھ لیں۔ آج کے سیشن میں ایک گواہی مکمل ہو جائے تو اچھا ہے۔''

میں اس کی بات کی تہ تک پہنچ گیا اور گواہ خلیل کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''خلیل

صاحب! آپ نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ ملزم نے مقتول کے کمرے میں کم از کم پندرہ منٹ گزارے تھے۔ آپ سے میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ اس دوران میں گھڑی تھام کر بیٹھے رہے تھے؟''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ پریشان لہجے میں بولا۔

''میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کو تو سر کھجانے کی فرصت نہیں ہوتی۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''آپ کی میز کے سامنے ادھار منگوں کی لمبی لمبی قطاریں بیٹھی رہتی ہیں۔ اس صورت حال میں آپ کسی اور طرف کیوں کر دھیان دے سکتے ہیں؟ یہ کام تو کوئی ایسا شخص ہی کر سکتا ہے جو انتہائی فرصت میں اسٹاپ واچ تھامے موقع کی تاک میں بیٹھا ہو۔''

اس وقت وہ چونکہ اپنے آفس میں نہیں تھا لہٰذا اسے فرصت ہی فرصت تھی۔ وہ بڑی فراخ دلی سے سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ''بس میں نے اندازہ کر لیا تھا اور میرا اندازہ کبھی غلط ثابت نہیں ہوتا۔''

''میں نے آپ کے اس دعوے کو ذہن نشین کر لیا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا پھر اگلا سوال کیا۔ ''مسٹر خلیل! آپ نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں معزز عدالت کو بتایا ہے کہ ملزم نے مقتول کے کمرے سے باہر آنے کے بعد کسی شخص کو کوئی دھمکی وغیرہ نہیں دی کیونکہ وہ جتنا کچھ کمرے کے اندر کر آیا تھا اس کے بعد باہر کچھ کرنے کی گنجائش کہاں تھی۔ آپ سے میرا صرف اتنا سا سوال ہے کہ آپ کی ان الفاظ سے کیا مراد ہے...... وہ جتنا کچھ کمرے کے اندر کر آیا......؟''

''اس میں مراد وراد وغیرہ کی کیا بات ہے!'' وہ قدرے برہمی سے بولا۔ ''وقوعہ کے روز جنرل منیجر کے کمرے میں جو کچھ بھی پیش آیا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔''

''آپ میرے سوال کو سمجھ نہیں پائے ہیں خلیل صاحب!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''مقتول کے کمرے کے اندر جو بھی واقعہ پیش آیا وہ واقعی کوئی راز نہیں ہے۔ میں نے تو آپ سے صرف اتنا پوچھا تھا کہ آپ کو یہ بات کیسے پتہ چلی، وہ سب کچھ میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم کا کیا دھرا ہے؟ وکیل استغاثہ کو دیئے گئے آپ کے جواب سے تو یہی تاثر ابھرتا ہے کہ آپ اس واقعے کے لئے ملزم کو ذمہ دار ٹھہرا رہے ہیں؟''

''بب...... بات...... دراصل یہ ہے کہ اس وقت ملزم ہی منیجر صاحب کے کمرے سے نکلا تھا۔'' وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اس لئے......''

وہ بات کرتے کرتے اچانک خاموش ہو گیا جیسے وہ کچھ بھول گیا ہو یا پھر اسے کچھ خاص

یاد آ گیا ہو۔ اس نے چڑھائی جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا وقوعہ کے روز صرف ملزم ہی جنرل منیجر کے کمرے میں داخل ہوا تھا جو آپ وہاں پیش آنے والے واقعے کی تمام تر ذمے داری اسی پر ڈالے رہے ہیں؟''

''نن ...... نہیں۔'' وہ بوکھلا گیا۔ ''اس سے پہلے بھی لوگ اندر جاتے رہے تھے۔''

''پھر ......؟'' میں نے زور دے کر کہا۔ ''پھر آپ کی توپوں کا رخ صرف میرے موکل ہی کی طرف کیوں ہے؟'' میں نے سانس لئے بغیر اس پر چڑھائی جاری رکھی۔ ''آپ نے وکیل استغاثہ کو بڑے دعوے سے بتایا ہے کہ ملزم جب کمپنی کے دفتر سے رخصت ہو رہا تھا تو اس کے انداز سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کوئی سنگین واردات کر کے موقع سے فرار ہو رہا ہو۔ کیا آپ نے اپنی آنکھوں سے ملزم کو یہ واردات کرتے دیکھا تھا؟''

گواہ پریشان ہو کر بغلیں جھانکنے لگا تو وکیل استغاثہ اس کی مدد کو لپکا۔ ''یور آنر!'' اس نے کرسی انصاف پر بیٹھے ہوئے معزز شخص کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''استغاثہ کا گواہ بڑے واضح الفاظ میں بتا چکا ہے کہ اس نے ملزم کے انداز سے محسوس کر لیا تھا۔ وکیل صفائی آنکھوں سے وقوعہ دیکھنے کی بات کر کے خواہ مخواہ گواہ کو کنفیوز کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

جج کے کچھ بولنے سے پہلے ہی میں نے جلدی سے کہہ دیا۔ ''ٹھیک ہے، میں اپنے سوال میں سے ''آنکھوں سے قتل کی واردات دیکھنے'' کے الفاظ نکال دیتا ہوں۔'' پھر میں گواہ خلیل کی طرف متوجہ ہوا اور سنسنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''مسٹر خلیل! کیا آپ علم الابدان کے ماہر ہیں؟''

''علم البادام ...... یہ کیا ہوتا ہے؟'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

''میں نے علم البادام نہیں بلکہ علم الابدان کہا ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو سماعت اور یادداشت کی تقویت کے لئے یقیناً دیسی باداموں کی ضرورت ہے۔ اسی لئے آپ بدن کے علم کو بادام کا علم سمجھ رہے ہیں!'' میں لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''علم الابدان کا مطلب ہے، بدن کا علم۔ اسے ''باڈی لینگویج'' بھی کہا جاتا ہے۔ جو شخص اس علم میں مہارت رکھتا ہو وہ کسی کی بھی حرکات و سکنات کو دیکھ کر یہ اندازہ قائم کر سکتا ہے کہ سامنے والے کے کیا ارادے ہیں، وہ کس قسم کا آدمی ہے اور کس معاملے میں کہاں تک جا سکتا ہے۔ آپ نے چونکہ ملزم کے رخصت ہونے کے انداز کو دیکھ کر یہ محسوس کر لیا تھا کہ وہ جنرل منیجر کے کمرے میں کوئی سنگین واردات کر کے موقع سے فرار ہو رہا ہے۔ آپ

کے اسی دعوے کی روشنی میں میری طرف سے سوال آیا تھا، کیا آپ علم الابدان کے ماہر ہیں۔ اب آیا کچھ آپ کی سمجھ شریف میں؟''

سرسری لہجے میں بولا۔ ''میں علم البادا ...... میرا مطلب ہے، علم الابدان کا ماہر تو نہیں ہوں، البتہ مجھے اپنے ججمنٹ پر پورا بھروسہ ہے!''

میں نے اس کے الفاظ پکڑ لئے اور کہا۔ ''گویا یہ آپ کا ججمنٹ تھا کہ ملزم، مقتول کے کمرے میں کسی سنگین جرم کا ارتکاب کر کے وہاں سے فرار ہو رہا تھا۔''

''جی ہاں......'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

میں نے جرح کے سلسلے کو اختتامی زاویے پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر خلیل! آپ نے تھوڑی دیر پہلے یہ دعویٰ کیا تھا کہ آپ کا اندازہ کبھی غلط ثابت نہیں ہوتا اور میں نے آپ کے اس دعوے کو ذہن نشین بھی کر لیا تھا۔ اب آپ اپنے ججمنٹ کے قابل بھروسہ ہونے کی بات کر رہے ہیں۔ اگرچہ لفظ ''اندازہ'' اور ''ججمنٹ'' میں معنوی اعتبار سے کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ بہرحال، میں آپ کے اس حیرت انگیز اور دلچسپ دعوے کو ایک چھوٹے سے تجربے سے چیک کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ اپنی صلاحیت کے عملی مظاہرے کے لئے تیار ہیں؟''

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں۔ میں نے اسے سمجھانے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی اور اپنے بریف کیس میں سے رف پیڈ نکال کر اس کے ایک صفحے پر ایک طویل جملہ تحریر کیا۔ پھر اس کاغذ کو پیڈ میں سے پھاڑ کر تہہ کیا اور جج کی میز پر ایک پیپر ویٹ کے نیچے اس تہہ شدہ کاغذ کو دبا دیا۔ اس کے بعد میں استغاثہ کے گواہ کی جانب متوجہ ہوا۔

''مسٹر خلیل! میں نے اپنی نیت اور سوچ کو تحریر کر کے پیپر ویٹ کے نیچے دبا دیا ہے۔ میں ایک لمحے کے لئے کمرے سے باہر جا رہا ہوں۔ پھر میں دوبارہ کمرے میں داخل ہوں گا اور اسی سوچ و نیت کے ساتھ سیدھا آپ کی طرف بڑھتا چلا آؤں گا۔ آپ نے اپنے ججمنٹ اور اندازے کو آزمانا ہے اور بھانپ کر یہ بتانا ہے کہ میں کس ارادے سے آپ کی سمت آ رہا ہوں۔ آر یو ریڈی؟''

وہ ہونقوں کی مانند میری صورت دیکھنے لگا۔ میں نے اسے کچھ سوچنے اور بولنے کا موقع نہیں دیا اور عدالت کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ پھر واپس آ کر اس کے کٹہرے کے قریب کھڑا ہوا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''جی مسٹر خلیل! آپ کا ججمنٹ کیا کہتا ہے؟''

"مم ... میرا خیال ہے آپ مجھ پر سخت جرح کرنے والے ہیں۔" وہ بے یقینی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ کے تیور انتہائی خطرناک نظر آ رہے ہیں۔"

میں نے فاتحانہ انداز میں جج کی طرف دیکھا۔ جج نے پیپر ویٹ کے نیچے دبے ہوئے تہ شدہ کاغذ کو کھول کر پڑھا پھر چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ جناب عالی! معزز عدالت سے میری یہ استدعا ہے کہ اس پرچے پر لکھی ہوئی تحریر کو حاضرین عدالت کی سماعت تک پہنچانے کا بندوبست کیا جائے۔"

جج نے وہ پرچہ ضروری ہدایت کے ساتھ پیش کار کے حوالے کر دیا۔ عدالت کے کمرے میں موجود وکیل استغاثہ سمیت تمام افراد بڑی سنسنی خیز نگاہوں سے پیش کار کی طرف دیکھنے لگے۔ یوں محسوس ہوتا تھا، پیش کار اس صدی کا کوئی اہم ترین اعلان کرنے والا ہو۔

پیش کار نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور با آواز بلند میری تحریر کو پڑھ کر سنایا۔

"مسٹر خلیل! آپ ایک فراڈ کمپنی کے فراڈ ملازم ہیں اور اسی کمپنی کے پلیٹ فارم سے ایک فراڈ گواہی دینے آئے ہیں چنانچہ آپ پر جرح کرنے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ آپ ہر سوال کے جواب میں دروغ گوئی سے کام لیں گے۔ لہٰذا میں اپنی جرح موقوف کرتا ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

٭٭٭

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں ایزی لائف ٹریڈرز میں ٹوکن جاری کرنے کی ملازمت پر مامور لڑکی فوزیہ پُرسکون کھڑی تھی۔

فوزیہ کی عمر چوبیس پچیس سال کے قریب رہی ہو گی۔ وہ ایک خوش شکل اور اسمارٹ لڑکی تھی۔ سانولی رنگت کے باوجود بھی اس کے چہرے کے تیکھے نقوش نے اس کی کشش میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ وہ ایک جاذب نظر اور دل فریب شخصیت کی مالک تھی۔ اس کو ایک نظر دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اگر میرا مؤکل ریاست علی اس کے ہاتھوں بے وقوف بنا تھا تو اس میں اس کا زیادہ قصور نہیں تھا۔ فوزیہ اپنی شخصیت کے تاثر اور خوب صورتی کے رعب سے کسی بھی مرد کو با آسانی اپنی انگلیوں پر نچا سکتی تھی۔

فوزیہ اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کروا چکی تو وکیل استغاثہ نے سرسری سی جرح کے بعد اسے فارغ کر دیا۔ اس جرح میں پوچھے گئے سوالات اور ان کے جواب کا مقصد صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ ملزم انتہائی بدتمیز، غصہ ور اور لڑاکا قسم کا شخص تھا۔ اس نے مختلف اوقات میں ایزی لائف ٹریڈرز کے ملازمین سے بد اخلاقی کا مظاہرہ کیا اور انہیں کمپنی کے اصول و قواعد

کو توڑنے کے لئے پریشرائز کرتا رہا۔ وغیرہ۔

جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد میں نے اپنی جرح کا آغاز کیا اور استغاثہ کی گواہ فوزیہ کی طرف دیکھتے ہوئے پہلا سوال کیا۔

"مس فوزیہ! آپ کو ایزی لائف ٹریڈرز میں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"چھ ماہ!" اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

"ماشاء اللہ!" میں نے معنی خیز نظر سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا اور خاموش رہا۔

وہ تامل کرتے ہوئے بولی۔ "آپ نے ماشاء اللہ کیوں کہا ہے؟"

"کیا یہ الفاظ نازیبا یا ناگوار ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں ... الفاظ تو یقیناً بہت اچھے ہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔ "آپ کے ادا کرنے کا انداز کچھ طنزیہ سا محسوس ہوا ہے۔"

"یہ آپ کے محسوسات اور سمجھ کا ہیر پھیر ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ورنہ میں نے طنز والی کوئی بات نہیں کی۔ بہرحال!" میں لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے اللہ کی شان کا ذکر اس لئے کیا تھا کہ آپ نے اس کمپنی میں رہتے ہوئے بہت کم عرصے میں بہت زیادہ ترقی کر لی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے، ایزی لائف ٹریڈرز والے اپنے ملازمین کو ہر ماہ سو فیصد انکریمنٹ دیتے ہیں۔"

"سو فیصد انکریمنٹ؟" وہ اُلجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا۔ "مس فوزیہ! میری اطلاعات اور معلومات کے مطابق، چھ ماہ پہلے جب آپ نے یہ کمپنی جوائن کی تھی تو آپ کی تنخواہ صرف تین ہزار روپے تھی لیکن آج آپ کو پورے پندرہ ہزار روپے ماہوار مل رہے ہیں۔ چھ ماہ میں ملنے والی اس روز افزوں ترقی کا اگر حساب کتاب کیا جائے تو یہ سو فیصد ماہانہ انکریمنٹ بنے گا۔ ملازمین کو دی جانے والی ایسی مالی فراخی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کمپنی ماہانہ کروڑوں کا بزنس کر رہی ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

اس نے ایک لمحے کے لئے متذبذب نظر سے مجھے دیکھا اور بڑے اعتماد سے بولی۔ "آپ کی معلومات ناقص اور اطلاعات انتہائی بوگس ہیں۔ میں جب سے اس کمپنی میں کام کر رہی ہوں مجھے ایک بھی انکریمنٹ نہیں ملا۔ آج بھی میری تنخواہ وہی ہے جس پر میں اپائنٹ ہوئی تھی یعنی تین ہزار روپے۔"

''پھر آپ نے ملزم کو اپنی تنخواہ بتاتے ہوئے غلط بیانی سے کام کیوں لیا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ ''ملزم کو آپ نے پندرہ ہزار سیلری کا بتایا تھا۔''

''میں نے نہیں، یہ بات انیتا نے......''

وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گئی اور پریشان نظر سے کبھی مجھے اور کبھی وکیل استغاثہ کو دیکھنے لگی۔ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''تو آپ کی سیلری والی بات مس انیتا نے ملزم کو بتائی تھی؟''

''ہاں ..... نہیں ....'' وہ بری طرح گھبرا گئی۔

''بی بی! ایک بات کرو۔ ہاں یا نہیں؟'' جج نے اسے تنبیہ کی۔

اس دوران میں، میں ٹٹولتی ہوئی سوالیہ نظر سے اسے دیکھتا رہا تھا۔ وہ میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔

''مم ..... میرا مطلب ہے میں نے ملزم سے اپنی سیلری کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔'' وہ ایک لمحے کو رکی پھر بولی۔ ''انیتا بھی ایسی غلط بیانی نہیں کرتی۔ وہ ہماری کمپنی کی ایک ذمے دار ورکر ہے۔ مجھے یقین ہے، آپ کو کسی نے بالکل غلط اطلاع دی ہے یا ..... یا پھر ملزم نے اپنی طرف ہی سے ایسا سوچ لیا ہوگا۔''

بات ختم کرتے ہی وہ ایسی نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو، میں نے کچھ غلط تو نہیں کہہ دیا۔ اس کی کیفیت اور اس کو دیکھنے کے بعد وکیل استغاثہ کی بدلتی ہوئی حالت بڑی محظوظ کن تھی۔ میں نے اس صورتِ حال سے کافی لطف اٹھایا۔

بات دراصل یہ ہے ''ایزی لائف ٹریڈرز'' سو فیصد ایک فراڈ کمپنی تھی۔ فراڈ بزنس سے متعلق تمام افراد کو بڑے اعتماد اور ڈھٹائی سے جھوٹ بولنا پڑتا ہے پھر کہیں جا کر وہ بزنس دوڑتا ہے، کتنی دیر کے لئے؟ اس سے بحث نہیں ہے۔ میں عدالت میں ایزی لائف ٹریڈرز کے فراڈ ہونے یا نہ ہونے کا کیس نہیں لڑ رہا تھا۔ اگر یہی بات ہوتی تو مستند گواہوں کے طور پر فرید مرزا جیسے درجنوں ''کمپنی گزیدہ'' افراد کو عدالت میں پیش کیا جا سکتا تھا۔ مجھے تو صرف اپنے مؤکل کو بے گناہ ثابت کر کے اس قانونی جھمیلے سے نکالنا تھا۔ بس میں جج کے سامنے اس کمپنی کے کردار کا ایک پہلو نمایاں کرنا چاہتا تھا اور اس کوشش میں مجھے بڑی حد تک کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ خلیل اور پھر فوزیہ پر ہونے والی میری جرح نے معزز عدالت کے سامنے چند اہم نکات کو بڑے واضح انداز میں منکشف کر دیا تھا۔

ڈری، سہمی اور الجھن میں گرفتار فوزیہ اس کیفیت میں اور بھی حسین اور قابلِ توجہ نظر آ رہی تھی۔ سچ کہتے ہیں، عورت بیمار اور پریشان ہو کر زیادہ پُرکشش ہو جاتی ہے۔ میں نے اس کی سراسیمہ آنکھوں میں جھانکا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مس فوزیہ! کیا آپ کو پہلے بھی کبھی عدالت میں حاضر ہو کر کسی قسم کی گواہی دینے کا اتفاق ہوا ہے؟''

''نہیں، میں نے پہلی مرتبہ عدالت کا منہ دیکھا ہے۔'' وہ قدرے سنبھلتے ہوئے بولی۔

''جبھی تو!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

وہ متاملانہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے پوچھا۔

''مس فوزیہ! آپ نے وکیل استغاثہ کی جرح کے جواب میں جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ بنتا ہے کہ ملزم ریاست علی ایک بداخلاق، بدتمیز، غصیلا اور بھدے باز قسم کا انسان ہے۔ آپ سے میرا اتنا سوال ہے کہ اس نے کبھی آپ سے کوئی بدتمیزی یا جھگڑا کیا؟''

''نن ..... نہیں۔'' اس نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ''اگر یہ مجھ سے ایسی کوئی نازیبا حرکت کرتا تو میں اس کا منہ توڑ کر رکھ دیتی۔''

''اس کا مطلب ہے یہ کمپنی کے دوسرے ملازمین کے ساتھ دھونس دھاندلی آزماتا رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کے ساتھ تو اس کی خوب بنتی تھی بلکہ آپ لوگوں کے درمیان تو اکثر و بیشتر کھسر پھسر بھی ہوتی رہتی تھی اور آپ ہی کی سفارش پر مسٹر خلیل نے اس کے ساتھ امتیازی برتاؤ کر کے کئی لوگوں سے پہلے اٹینڈ کر لیا تھا۔ مس فوزیہ!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کچھ غلط تو نہیں کہہ دیا؟''

میں نے کھسر پھسر کے ذیل میں ''اکثر و بیشتر'' کے الفاظ دانستہ اسے چکر دینے کے لئے استعمال کئے تھے۔ میری بات سن کر فوزیہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے جواب کے انتظار میں سوالیہ نظر سے اسے گھورا تھا وہ تامل کرتے ہوئے بولی۔

''یہ کھسر پھسر والی بات تو آپ بالکل غلط کہہ رہے ہیں۔ ہمارے پاس نہ تو اتنا فالتو وقت ہوتا ہے اور نہ ہی کمپنی کی طرف سے ڈیوٹی ٹائم میں ہمیں ایسی سرگرمیوں کی اجازت ہے البتہ ....'' وہ لمحہ بھر کو متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''جہاں تک سفارش کرنے کا تعلق ہے ..... تو یہ قدم میں نے ملزم کی مجبوری کو دیکھتے ہوئے اٹھایا تھا۔ میرا خیال ہے، انسانیت کے ناتے اتنا تو سب ہی کو کرنا چاہئے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ نے کھسر پھسر کے حوالے سے جس بات کی تردید کی ہے وہ مجھے

بلکہ معزز عدالت کے روبرو استغاثہ کے گواہ خلیل نے بیان کی ہے۔ آپ کی تردید سے ثابت ہوتا ہے، استغاثہ کا گواہ خلیل ایک دروغ گو شخص ہے۔ اس کی دروغ گوئی دیگر معاملات میں بھی کھل چکی ہے۔ بہرحال۔'' میں سانس لینے کے لئے رکا پھر کہا۔ ''مس فوزیہ! کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گی کہ آپ نے ملزم کی کون سی مجبوری کو دیکھتے ہوئے انسانیت کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا تھا؟''

اس نے بتایا۔ ''ملزم نے مجھ سے کہا تھا، اس کی بیوی بیمار ہے۔ ایک لیڈی ڈاکٹر سے اس نے اپائنٹ منٹ لے رکھا ہے۔ اگر قطار میں بیٹھے بیٹھے دیر ہوگئی تو اپائنٹ منٹ ہاتھ سے نکل جائے گا۔''

وہ اپنی جان بچانے کے لئے صریحاً جھوٹ بول رہی تھی اور یہ تمام تر گفتگو میرا موکل بھی سن رہا تھا۔ کسی بھی کیس کی عدالتی کارروائی کے دوران میں ملزم کی حیثیت بڑی ہی قابل رحم ہوتی ہے۔ اسے اپنے خلاف ہر قسم کی جھوٹی سچی، الٹی سیدھی اور تلخ و ترش باتیں سننا پڑتی ہیں ...... اور نہایت ہی خاموشی کے ساتھ!

میں نے فوزیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''ملزم پہلی مرتبہ لنچ کے وقفے میں آپ کے پاس آیا تھا اور قطار میں لگنے کی نوبت آنے تک دو سے زیادہ وقت ہو گیا تھا۔ کیا کوئی گائنی اس وقت بھی کلینک کھولے مریضوں کو دیکھتی رہتی ہے؟''

''یہ بات تو آپ اپنے موکل ہی سے پوچھیں۔'' وہ برہمی سے بولی۔ ''یا پھر اس گائنی سے جا کر معلوم کرلیں جہاں ملزم اپنی بیوی کو دکھانے جانے والا تھا۔''

فوزیہ کی کیفیت کو دیکھ کر پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ برہم حُسن بھی پریشان حُسن سے کچھ کم دلکش و جاذب نظر نہیں ہوتا۔

میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ''ٹھیک ہے مس فوزیہ! میں آپ کے مشورے کے عین مطابق یہ سوالات متعلقہ افراد ہی سے کروں گا۔''

وہ جھینپ کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔

میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!''

جج نے دیوار گیر کلاک کی سمت دیکھا پھر وکیل استغاثہ سے کہا۔ ''وکیل صاحب! عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں صرف دس منٹ باقی ہیں۔ کیا آپ اپنے کسی اور گواہ کو پیش کرنا چاہتے ہیں؟''

وکیل استغاثہ نے دشمنانہ نظر سے میری طرف دیکھا اور قدرے ترش لہجے میں جج کو

جواب دیا۔ ''یور آنر! ڈیفنس کونسلر اگر اسی طرح غیر ضروری اور غیر متعلق سوالات سے اپنی جرح کو دراز کر کے معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں تو پھر گواہی ممکن نہیں ہو سکے گی۔ میں تو گواہ مس انیتا کو پانچ منٹ میں نمٹا دوں گا البتہ......''

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر معاندانہ انداز میں مجھے دیکھا اور اپنی بات کو پورا کرتے ہوئے بولا۔ ''البتہ میرے فاضل دوست کو پانچ صدیاں بھی ناکافی ہوں گی!''

جج نے ردِعمل کے طور پر میری جانب دیکھا اور پوچھا۔ ''بیگ صاحب! آپ کیا کہتے ہیں؟''

میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! اگر وکیل استغاثہ واقعی پانچ منٹ میں اپنے معزز گواہ کو فارغ کر دیں تو میں وعدہ کرتا ہوں، ایک سوال سے زیادہ نہیں پوچھوں گا۔''

میرے اس اسٹیٹ منٹ سے وکیل استغاثہ کے ساتھ جج کو بھی حیرت ہوئی اور وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگے۔ دراصل بات یہ تھی کہ اب تک استغاثہ کے جو گواہ نمٹ گئے تھے ان پر جرح کے دوران میں نے بہت سے ایسے نکتے اور اعتراضات اٹھائے تھے جن کی بناء پر امید کی جا رہی تھی کہ جب مس انیتا گواہوں والے کٹہرے میں آ کر کھڑی ہو گی تو میں اس کے بیان کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دوں گا لیکن میں نے وہ تمام تر انکشاف انگیز جرح ایک خاص مقصد کے تحت کی تھی اور میرا وہ مقصد پورا ہو گیا تھا۔ میں نے نہایت ہی پُر تاثر انداز میں عدالت کو یہ باور کرا دیا تھا کہ ''ایزی لائف ٹریڈرز'' ایک فراڈ بزنس کو بڑی خوبصورتی سے چلا رہے تھے۔ بس انیتا سے پوچھا گیا ایک سوال تابوت میں آخری کیل کا کردار ادا کرتا! میں نے اپنے طور پر کچھ اور سوچ رکھا تھا۔

وٹنس باکس میں جہاں تھوڑی دیر پہلے فوزیہ میری جرح کو فیس کر رہی تھی وہاں اب مس انیتا کھڑی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ویسے ایک بات ہے، اس کمپنی کے ایم ڈی صاحب نے بہت سوچ سمجھ کر اپنی کمپنی میں لڑکیوں کو بھرتی کیا تھا اور ان کے انتخاب میں بھی اس نے کوئی بھول چوک نہیں کی تھی۔ حُسن و دلکشی میں فوزیہ اگر سیر تھی تو انیتا بلاشبہ ''سوا سیر'' کے ٹائٹل کا استحقاق رکھتی تھی!

وکیل استغاثہ نے مجھے آزمانے اور عدالت کے سامنے مجھے جھوٹا ثابت کرنے کے لئے انیتا کو پانچ منٹ سے بھی پہلے فارغ کر دیا اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''میرے فاضل دوست! اب آپ کے سوال کی باری ہے!''

میں جج سے اجازت حاصل کرنے کے بعد وٹنس باکس کے قریب آ گیا۔ میں چند لمحات تک کھوجتی ہوئی نگاہ سے مس انیتا کی طرف دیکھتا رہا پھر کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''مس انیتا! میری معلومات اور ایزی لائف ٹریڈرز کے سیلری رجسٹر کے مطابق کمپنی آپ کو تنخواہ کی مد میں چار ہزار روپے ماہوار ادا کرتی ہے لیکن آپ میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم مسٹر ریاست علی جیسے معصوم اور سادہ لوح لوگوں کو شکار کرنے کے لئے اپنی تنخواہ بیس ہزار روپے بتاتی ہیں۔ کیا کمپنی کے ایم ڈی صاحب اوپر کے سولہ ہزار روپے آپ کو آپ ہی کے جیسے حسین اور سنہرے جال بننے کی مد میں دیتے ہیں یا ..... ایک فراڈ کمپنی میں کام کرتے کرتے آپ کو جھوٹ بولنے کی اتنی پختہ پریکٹس ہو گئی ہے کہ اب یہ عادت آپ کی فطرتِ ثانیہ بن گئی ہے؟''

پھر میں جج کی طرف مڑا اور معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ ''جناب عالی! الفاظ کچھ زیادہ ہو گئے ہیں لیکن میں اپنے وعدے سے نہیں پھرا۔ طویل سہی، مگر یہ ایک ہی سوال ہے۔''

انیتا میرا سوال سن کر اور سوال کے انداز کو دیکھ کر جزبز سی ہو کر رہ گئی۔ اس وقت حاضرین عدالت کے علاوہ وکیل استغاثہ، جج اور خود میری نظریں اس پر مرکوز تھیں۔ وہ ان کھوجتی ہوئی سوالیہ نگاہوں کی گرماہٹ اپنے وجود کے مختلف حصوں پر محسوس کر رہی تھی اور اسی ''تجربے'' نے اسے نروس کر دیا۔ وہ میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے بوکھلائے ہوئے انداز میں اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ جب انسان کی سمجھ کام کرنا چھوڑ دے تو وہ اول آخر اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔ ایسے ہی موقع پر بے دھیانی میں انسان اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مار بیٹھتا ہے۔

ان لمحات میں مس انیتا گھبراہٹ اور بے خیالی میں اپنے حسین اور گداز ہونٹوں کو خوبصورت اور ہموار دانتوں کے ناروا سلوک سے گزار کر دلکشی کو داغدار کر رہی تھی!

وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ عدالت کا مقررہ وقت بھی انیتا کی لب کشائی کا انتظار نہیں کر سکتا تھا جب کہ وہ لب کشائی کی بجائے لب تباہی پر کمر بستہ نظر آتی تھی۔ جج نے اس کی معنی خیز خاموشی کو نصف اقرار جانتے ہوئے عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''دی کورٹ از ایڈ جارنڈ!''

✲✲✲

وٹنس باکس میں ''ایزی لائف ٹریڈرز'' کا ایم ڈی مسٹر سہیل کھڑا تھا۔ گزشتہ پیشی پر

استغاثہ کی طرف سے ایم ڈی کی سیکرٹری شہناز کو گواہی کے لئے پیش کیا گیا تھا لیکن میں نے اس پیشی کا احوال دانستہ گول کر دیا ہے کیونکہ شہناز پر جرح کے دوران کوئی نئی بات سامنے نہیں آسکی تھی۔ میں نے دو چار تصدیقی سوالات کے بعد اسے فارغ کر دیا تھا۔

ایم ڈی سہیل عمدہ تراش کے ایک قیمتی سوٹ میں ملبوس بڑے اعتماد سے کٹہرے میں کھڑا تھا۔ اس کی عمر چالیس کے قریب رہی ہوگی۔ بدن بھاری بھرکم، درمیانہ قامت اور زیر ناک خوبصورت گھنی مونچھیں۔ اس کی ناک پر دائیں جانب مسور کے دانے کے برابر ایک تل بھی تھا۔ سہیل تاثر انگیز شخصیت کا مالک ایک خوش پوش شخص تھا۔ میں نے سب سے زیادہ ریسرچ اسی کے کردار پر کی تھی۔

وکیل استغاثہ اپنی باری بھگتا چکا تو میں جرح کے لئے وٹنس باکس کے قریب آ گیا پھر جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد میں نے جرح کا آغاز کیا اور گواہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولا۔

''مسٹر سہیل! آپ کی ''ایزی لائف ٹریڈرز'' کتنے عرصے سے کام کر رہی ہے؟''

وہ گول مول جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''ایک سال ہونے کو آ رہا ہے۔''

میری معلومات کے مطابق اس کمپنی کو کھلے ابھی صرف آٹھ ماہ ہوئے تھے۔ میں نے قدرے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا اس سے پہلے کمپنی کا دفتر کسی اور بلڈنگ میں ہوا کرتا تھا؟''

''نہیں ..... ہم نے اسی دفتر سے اپنے کام کا آغاز کیا تھا۔'' وہ قطعیت سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''سہیل صاحب! ایک سال میں پورے بارہ مہینے ہوتے ہیں اور میں یہ ثابت کر سکتا ہوں، ایزی لائف ٹریڈرز کو قائم ہوئے صرف آٹھ ماہ ہوئے ہیں۔ خدا کا خوف کریں، بارہ ماہ اور آٹھ ماہ میں کچھ تو فرق ہوتا ہے نا؟''

وہ ایک لمحہ سوچنے کے بعد چالاکی سے بولا۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب! بس کیا کروں، مصروفیت اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔ اس کام نے میرے ہوش چھین لئے ہیں۔ دراصل میں نے ان آٹھ ماہ میں اتنا زیادہ کام کر لیا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے، ایک سال گزر گیا ہو۔ بس اتنی سی بات ہے!''

''بات اتنی سی نہیں ہے مسٹر سہیل!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جارحانہ انداز میں کہا۔ ''اس کام نے اگر آپ کے ہوش چھین لئے ہیں تو اس سے پہلے والے کاموں کے ہوش آپ نے چھین رکھے تھے اور اور آپ یہ مصروفیت اور زیادہ کام کرنے کی تو

بات ہی چھوڑیں۔ آپ کا پاکستان میں دل کہاں لگتا ہے جو آپ کو کام کرنے کی مہلت مل سکے۔ آپ تو اکثر و بیشتر امریکہ ہی میں ''گئے'' رہتے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''آپ ..... کچھ زیادہ غلط نہیں کہہ رہے۔'' وہ گڑبڑا کر بولا۔ ''میں امریکہ جاتا رہتا ہوں لیکن دفتری امور سے میں کبھی غافل نہیں رہا۔ مجھے جتنا عرصہ بھی یہاں رہنے کو ملتا ہے، میں کمپنی کو بھرپور ٹائم دیتا ہوں۔''

''مسٹر سہیل! آپ نے یہ الفاظ استعمال کئے ہیں ..... میں امریکہ جاتا رہتا ہوں ..... کیا آپ معزز عدالت کو یہ بتانا پسند فرمائیں گے، جب سے آپ کی کمپنی ''ایزی لائف ٹریڈرز'' قائم ہوئی ہے، آپ نے امریکہ کے کتنے چکر کاٹے ہیں؟''

وہ ایک لمحہ سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔ ''آئی تھنک، میں پانچ مرتبہ امریکہ جا چکا ہوں۔ ابھی میں آخری مرتبہ پندرہ جنوری ہی کو تو واپس آیا ہوں۔''

''اوکے!'' میں نے جال کی طرف بڑھتے ہوئے شکار کو بڑی محبت سے پکارا اور کہا۔ ''امریکہ کا ویزا حاصل کرنا کوئی آسان بات نہیں۔ بعض لوگ تو اس خواہش اور کوشش میں اپنی پوری عمر بھی گنوا بیٹھتے ہیں اور امریکہ جانے کا کریز، بلکہ میڈیا انہیں اس حال میں پہنچا دیتا ہے کہ وہ نہ گھر کے رہتے ہیں اور نہ ہی گھاٹ کے۔ آپ کو اتنی آسانی سے اور جلدی جلدی کیسے ویزا مل جاتا ہے؟''

''وہ گھسیارے یا پھر دو نمبر لوگ ہوتے ہیں جنہیں ویزا آفس ریفوز کر دیتا ہے۔'' وہ بڑے فخر سے بولا۔ ''میں ایک معزز بزنس مین ہوں۔''

''اوہ! بزنس مین۔'' میں نے اسی کے الفاظ قدرے طنزیہ انداز میں دہرائے۔ ''میری معلومات کے مطابق کسی بزنس مین کو بھی امریکہ کے ویزے کے لئے درجنوں پاپڑ بیلنا ہی پڑتے ہیں۔ کیا آپ کا بزنس اس قابل ہے کہ اسے ویزا کے حصول کے لئے امریکن قونصلیٹ کے سامنے پیش کیا جا سکے؟''

''وہاٹ ناٹ؟'' وہ قدرے برہمی سے بولا۔ ''آپ نے ایزی لائف ٹریڈرز کو سمجھ کیا رکھا ہے۔ میری ایک ساکھ ہے، انٹرنیشنل بزنس مارکیٹ میں مجھے سینکڑوں لوگ جانتے ہیں۔ آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں وکیل صاحب؟''

وہ اپنی اداکاری سے مجھ سمیت عدالت میں موجود ہر شخص کو متاثر کرنے کی پوری کوشش کر رہا تھا لیکن ادھر میں بھی اس کی اداکاری کے غبارے کی ہوا نکالنے کا پروگرام بنائے بیٹھا تھا۔ میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آپ کا بزنس کتنا صاف شفاف اور معزز ہے یہ تو آج معزز عدالت کے سامنے کھل ہی جائے گا۔ ''آج'' پر میں اس لئے زور دے رہا ہوں کہ اتفاق سے آج عدالت میں ہمارے کیس کی سماعت سب سے پہلے شروع ہوئی ہے۔ لہٰذا سمجھ لیں آج کا سارا وقت ہمارا ہی ہے اور یہ وقت دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کے لئے کافی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے مسٹر سہیل؟''

''پتہ نہیں، آپ کہاں کہاں کی ہانک رہے ہیں؟'' وہ برہمی سے بولا۔

وکیل استغاثہ فوراً اس کی مدد کو لپکا۔ تیز احتجاجی لہجے میں اس نے جج سے کہا۔ ''یور آنر! وکیل صفائی غیر متعلق باتوں سے الجھ کر معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں اور انہوں نے ماشاء اللہ یہ عزم بھی ظاہر کر دیا ہے کہ آج کا سارا وقت موصوف یونہی ضائع کریں گے۔ بھلا بتائیں، غضب خدا کا! عاصم مرڈر کیس کا ایم ڈی صاحب کے امریکہ جانے سے کیا تعلق ہے؟''

جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ''بیگ صاحب! آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''جناب عالی! گواہ کے امریکہ جانے والا معاملہ اس کی دروغ گوئی، مکاری، چال بازی اور دھوکا دہی کو ثابت کرنے جا رہا ہے اور مجھے یقین ہے ..... اور میں ثابت بھی کر سکتا ہوں، گواہ کی ان جملہ ''خصوصیات'' کا عاصم مرڈر کیس سے بڑا گہرا تعلق ہے۔''

جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''پلیز پروسیڈ!''

میں گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''مسٹر سہیل! آپ نے ابھی معزز عدالت کے سامنے اقرار کیا ہے کہ آپ آٹھ ماہ میں پانچ مرتبہ امریکہ جا چکے ہیں۔ کیا ہر مرتبہ آپ نے وزٹ ویزا کے لئے اپلائی کیا تھا؟''

''جی ہاں ..... ظاہر ہے ..... اور کس ویزا کے لئے اپلائی کرتا؟''

''اور پانچوں مرتبہ آپ کو ویزا بھی مل گیا؟''

''وکیل صاحب! لگتا ہے، آپ امریکہ کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ اللہ کے بندے! اگر مجھے ویزا نہیں ملا ہوتا تو میں امریکہ جا کیسے سکتا تھا؟ امریکہ والوں کو آپ نے کوئی کاٹھ کے الو سمجھ رکھا ہے؟''

''کاٹھ کے الو نہیں سمجھ رکھا اسی لئے مجھے آپ کے بیان پر شدید حیرت ہو رہی ہے۔''

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اور جہاں تک امریکہ اور اس کی ویزا پالیسیوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں، میں جس قدر جانتا ہوں، ممکن ہے آپ کی اگلی پچھلی سات نسلوں کو بھی اتنی معلومات نہ ہوں۔''

میرے سخت الفاظ نے اس کا چہرہ سرخ کر دیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ زبان سے ایک لفظ بھی نکالتا، میں نے جارحانہ انداز میں سوال داغ دیا۔

''مسٹر سہیل! آپ آٹھ ماہ میں پانچ مرتبہ وزٹ ویزا پر امریکہ جا اور آ چکے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق امریکن قونصلیٹ اور ویزا آفس والے کسی بھی شخص کو ون ایٹی ڈیز کے لئے وزٹ ویزا جاری کرتے ہیں اور وہ بھی اپنے مکمل اطمینان کے بعد اور ..... یہ ''مکمل اطمینان'' بہت ہی پیچیدہ اور سمجھ میں نہ آنے والا کھیل ہے جس کی فارمیلٹی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس انٹرویو کی تیاری کے لئے کوئی سلیبس نہیں ہے۔ یہ سراسر انٹرویو کرنے کے موڈ، مزاج اور مرضی پر منحصر ہے کہ وہ جس کو چاہے ویزا ایشو کر دے اور جسے چاہے ریفیوز کر دے۔'' میں لمحہ بھر سانس لینے کو رکا پھر سلسلۂ جرح کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''ون ایٹی ڈیز کا مطلب ہے، ایک سو اسی دن ..... یعنی پورے چھ ماہ۔ آپ آٹھ ماہ میں پانچ مرتبہ وزٹ ویزا حاصل کر چکے ہیں جب کہ وزٹ کی مدت چھ ماہ پر محیط ہے۔ آپ معزز عدالت کو یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ آپ نے اتنا بڑا حیرت انگیز کارنامہ کیسے انجام دیا؟ جو لوگ پوری دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا ٹھیکہ لئے بیٹھے ہوں، آپ نے ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کس طرح باقاعدہ صرف آٹھ ماہ کی قلیل مدت میں پانچ وزٹ ویزا حاصل کر لئے؟ کوئی بھی جھوٹ بولنے سے پہلے اتنا ضرور سوچ لیں مسٹر سہیل کہ ثبوت کے لئے آپ کے ''عظیم المرتبت نادر الوجود'' پاسپورٹ کو بھی مشاہدے اور معائنے کے لئے عدالت میں ''طلب'' کیا جا سکتا ہے۔''

اس کے چہرے پر تاریکی چھا گئی۔ جب کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا تو جھنجھلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''آپ کو کیا، میں نے جس طرح بھی ویزا حاصل کیا ہو۔ میں آپ کو بتانے کا پابند تو نہیں ہوں۔''

اس کے اس جواب پر عدالت میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ایک دو مرتبہ شناسا افراد کے قہقہے بھی سننے کو ملے۔ اس صورت حال نے استغاثہ کے گواہ مسٹر سہیل کو اور زیادہ بوکھلا دیا۔ میں نے اس کی بوکھلاہٹ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سوالات کی بھرمار کر دی۔

''آپ امریکہ میں کہاں کہاں جا چکے ہیں؟''

''میں نے تقریباً پورا امریکہ ہی دیکھ رکھا ہے۔'' وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

''آخری مرتبہ آپ امریکہ کی کس اسٹیٹ میں گئے تھے؟''

''نیو یارک۔''

''نیو یارک بہت بڑی اسٹیٹ ہے۔'' میں نے دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ اس اسٹیٹ کے کس مقام پر گئے تھے؟''

''مایامی۔'' اس نے امریکی لہجے میں ''میامی'' کو ''مایامی'' بناتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ کے خیال میں میامی نیو یارک اسٹیٹ میں واقع ہے؟'' میں نے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔

''بالکل ..... جی ہاں ..... میں دو تین مرتبہ مایامی جا چکا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''مسٹر سہیل! امریکہ کی آب و ہوا اور فضا میں اتنی تیزی اور طراری ہے کہ اگر کوئی گدھا بھی چند دن وہاں گزار آئے تو وہ اتنا فن کار ہو جاتا ہے کہ انسان کے سوال کا منہ توڑ جواب دے سکتا ہے۔ آپ تو ماشاء اللہ! اشرف المخلوقات سے تعلق رکھتے ہیں اور آٹھ ماہ میں پانچ مرتبہ امریکہ ہو آئے ہیں اور یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ آپ نے تقریباً پورا امریکہ دیکھ لیا ہے۔ حالانکہ ایسا دعویٰ تو وہ امریکہ بورن شخص بھی نہیں کر سکتا جس نے پوری زندگی امریکہ میں رہتے ہوئے بڑی فعال گزاری ہو۔ اتنے بڑے دعوے کے باوجود بھی آپ کو اتنا معلوم نہیں کہ میامی، فلوریڈا اسٹیٹ میں واقع ہے۔ آپ زبردستی اسے نیو یارک اسٹیٹ میں گھسانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شاید میامی کی چکا چوند اور رنگین و سنگین قصوں نے آپ کے دماغ کی چند چولیں ڈھیلی کر دی ہیں۔ آپ کو ہر جگہ مایامی ہی مایامی نظر آتا ہے۔ آپ ایک انتہائی واہیات حرکت کے مرتکب ہو رہے ہیں اور اس پر میئر فلوریڈا سخت برا مان سکتا ہے کیونکہ فلوریڈا کا اسی فی صد ریونیو میامی سے جمع ہوتا ہے اور ..... آپ کو اتنا تو معلوم ہی ہوگا کہ اگر کوئی با اختیار امریکی کسی بے اختیار پاکستانی کے خلاف ہو جائے تو کتنی بڑی قیمت ٹوٹ سکتی ہے؟ آپ تو بے اختیار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فراڈ بزنس بھی چلا رہے ہیں۔''

ادھر میری بات ختم ہوئی ادھر عدالت کے کمرے میں ایک شور سا اٹھا۔ اس شور میں لوگوں کی کھسر پھسر، چہ میگوئیاں اور بلند قہقہے بھی کچھ شامل تھا۔ جج کو مخصوص جملہ ''آرڈر آرڈر!'' پکار کر خاموشی کو واپس لانا پڑا۔ خاموشی چھاتے ہی وکیل استغاثہ کی چیخ سے مشابہ آواز عدالت کے کمرے میں گونج اٹھی۔

''آبجیکشن یور آنر! وکیل صفائی استغاثہ کے تمام گواہوں پر جرح کرنے کے دوران خصوصی طور پر ''ایزی لائف ٹریڈرز'' کے بزنس کو متعدد بار فراڈ کہہ چکے ہیں۔ یہ ایک طرح کی الزام تراشی ہے۔ کیا وہ اپنی اس بات کو ثابت کر سکتے ہیں؟''

''بیگ صاحب! آپ کیا کہتے ہیں؟'' جج نے روئے سخن میری طرف موڑتے ہوئے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''جناب عالی! اس بزنس کو فراڈ ثابت کرنے کے لئے کئی درجن افراد کو عدالت میں پیش کیا جا سکتا ہے جو قرضے کی آس میں مذکورہ کمپنی کو مجموعی طور پر کروڑوں کا فائدہ پہنچا چکے ہیں لیکن کسی کو بھی ابھی تک قرضہ یا قرضے کا چیک جاری نہیں ہوا۔ اس کیس کا ملزم اور میرا مؤکل بھی انہی سینکڑوں افراد میں سے ایک ہے لیکن میں عدالت کے کمرے میں صفائی کے گواہوں کو بھیڑ لگانے کی بجائے اس کمپنی کے ایم ڈی کی زبان ہی سے اس بزنس کو فراڈ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جس میں، میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوا ہوں۔ اگر وکیل استغاثہ کی مداخلت کے بغیر مجھے اور تھوڑا سا موقع مل جائے تو میں معزز عدالت کے سامنے حقیقت کو روز روشن کی طرح عیاں کر کے رکھ دوں گا۔ دیٹس آل یور آنر!''

وکیل استغاثہ نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''یور آنر! اس عدالت میں عاصم مرڈر کیس کی سماعت ہو رہی ہے۔ ''ایزی لائف ٹریڈرز کے فراڈ یا فیئر بزنس کا اس کیس سے کیا تعلق ہے؟''

''تعلق ہے۔۔۔ اور بڑا گہرا تعلق ہے۔'' میں نے اپنی فائلوں پر ہاتھ مارتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ ''میں آج کی کارروائی کے دوران ہی میں یہ تعلق ثابت کر دوں گا۔''

''مسٹر بیگ! پلیز پروسیڈ۔'' جج نے گہری دلچسپی لیتے ہوئے مجھے کارروائی جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔

میں ایک دوسرے زاویے سے کاسٹک سوڈا ڈال کر استغاثہ کے معزز گواہ اور ایزی لائف ٹریڈرز کے ایم ڈی مسٹر سہیل کو دھونے کی کوشش کرنے لگا۔ میری اب تک کی جرح نے اس کے قدموں کی زمین کو کھینچ لیا تھا۔ وہ اب تب میں زمین بوس ہونے ہی والا تھا۔ میں نے اس کے احوال حال کے ساتھ ہی ماضی کے بخیے بھی ادھیڑ ڈالے۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''مسٹر سہیل! اگر آپ ایک فراڈ بزنس نہیں چلا رہے تو آپ کو معزز عدالت کے علم میں لانا ہوگا کہ ان آٹھ ماہ میں آپ نے اپنے کلائنٹس کو کتنے چیک جاری کیے ہیں؟''

وہ اپنی پیشانی پر آنے والے پسینے کو خشک کرنے کے بعد امداد طلب نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھنے لگا۔ میں نے اگرچہ جج کی حمایت سے وکیل استغاثہ کو کسی قسم کی مداخلت سے روک رکھا تھا لیکن اس مرد برہم کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ وہ کسی وقت بھی ٹانگ پھنسانے کے لئے بیچ مسئلے کے کود سکتا تھا۔ خاص طور پر ایسی صورت میں کہ اس کا گواہ مدد کا خواستگار بھی تھا لہٰذا میں نے ایک لمحے کے توقف سے دوسرا حملہ کر دیا۔

''مسٹر سہیل! آپ کے پاس میرے اس سوال کا کوئی جواب نہیں۔ کیونکہ ان آٹھ ماہ میں آپ نے جن معصوم اور سادہ لوح افراد سے کروڑوں ہتھیائے ہیں ان میں سے کسی ایک کو بھی کوئی چیک ایشو نہیں کیا گیا۔ جب کہ آپ کے فارم کی شرائط کے مطابق آپ نوے دن یعنی تین ماہ کے بعد چیک جاری کرنے کے پابند ہیں۔ میرے مؤکل پر تو یہ الزام ہے کہ اس نے دس بارہ دن کے بعد ہی چیک کا مطالبہ شروع کر دیا تھا اور غصہ میں اس نے کمپنی کے ملازمین کو الٹی سیدھی دھمکیاں بھی دے ڈالی تھیں لیکن ان احمق اور سادہ دل کلائنٹس کے ساتھ ہونے والی زیادتی کو آپ کیا نام دیں گے جو آٹھ ماہ یعنی پورے دو سو چالیس دن سے چیک ملنے کی امید میں آپ کے دفتر کے چکر کاٹ رہے ہیں۔ آپ دفتر میں ہوتے ہیں اور انہیں یہ کہہ کر وعدۂ فراد پر ٹال دیا جاتا ہے کہ آپ امریکہ سے آئیں گے تو چیک جاری ہو جائے گا۔ آپ کس طرح امریکہ جاتے آتے ہیں، اس کا احوال معزز عدالت کے سامنے کھل چکا ہے۔''

وہ کٹہرے کی چوبی ریلنگ کو تھامتے ہوئے بولا۔ ''پانی۔۔۔ میں شدید پیاس محسوس کر رہا ہوں۔''

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''یہ عدالت کا کمرا ہے، کوئی کربلا کا میدان نہیں۔ تمہیں پانی ضرور ملے گا مگر ضروری سوالات کے بعد!''

میں آپ سے تم پر اتر آیا تھا۔ اس طرز تخاطب نے اسے اور بھی نروس کر دیا۔ ویسے اس کی حالت دیکھ کر محسوس ہوتا تھا، کوئی لمحہ جاتا ہے کہ اس کے تعزیئے ٹھنڈے ٹھار ہو جائیں گے۔ وہ پریشان نظر سے جج کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اس کے ماضی کے گڑے مُردے اکھاڑ پھینکے۔

''مسٹر سہیل! آپ ایزی لائف ٹریڈرز کو کب تک سمیٹ کر رفو چکر ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں؟''

''م۔۔۔ میں ایک چلتا ہوا بزنس کیوں سمیٹوں گا۔۔۔؟'' وہ لرزیدہ لہجے میں بولا۔

"اس لئے کہ اب اس کے چلنے کے امکانات معدوم ہو چکے ہیں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "جن لوگوں کے کروڑوں روپے تم کھائے بیٹھے ہو، میں نے انہیں ایک پلیٹ فارم پر متحد کر دیا ہے۔ عنقریب تمہارے خلاف فراڈ کے درجنوں مقدمات درج ہونے والے ہیں۔ تمہیں بالکل اسی طرح سر پر پاؤں رکھ کر یہاں سے بھی فرار ہونا پڑے گا جیسے حیدر آباد سے "ہجرت" کر کے تم کراچی پہنچے تھے۔ کیا سمجھے؟"

"پپ ... پانی ....." وہ نہایت ہی شکستہ لہجے میں بولا۔

"بیگ صاحب! یہ حیدر آباد کا کیا قصہ ہے؟" جج نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "جناب عالی! حیدر آباد میں گواہ سہیل ایک شخص منصور کے ساتھ مل کر پلاٹ وغیرہ کے فراڈ کا کام کر رہا تھا۔ یہ لوگ ایک ہزار روپے لے کر لوگوں کے نام قرعہ اندازی میں شامل کرتے اور انہیں یہ سنہرے خواب دکھاتے تھے کہ خوش قسمتی سے اگر ان کا نام نکل آیا تو انہیں لاکھوں کی مالیت کا پلاٹ صرف ایک ہزار روپے میں الاٹ ہو جائے گا۔ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو قرعہ اندازی ہوتی اور فرضی نام نکال کر لوگوں کی امید کو توانا رکھا جاتا کہ بس اب ان کا نمبر بھی آنے ہی والا ہے۔ لوگ اس لئے بھی نا امید نہیں ہوتے تھے کہ ہر قرعہ اندازی میں انہیں شامل کیا جاتا تھا۔ اس فراڈ میں ان لوگوں نے کروڑوں کمائے۔ پھر ایک روز گواہ کا پارٹنر قتل ہو گیا اور شک اس پر کیا جانے لگا۔ گواہ کو پہلے سے خبر ہو گئی کہ پولیس اس کی گردن ناپنے کسی بھی وقت پہنچ سکتی ہے لہٰذا یہ راتوں رات حیدر آباد سے فرار ہو کر کراچی پہنچا۔ چند دنوں تک یہ روپوش رہا پھر اسے اپنے ہی قماش کا ایک بندہ عاصم مل گیا۔ دونوں میں جلد ہی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی۔ ایزی لائف ٹریڈرز کا آئیڈیا عاصم کا تھا لیکن اس کے پاس فنانس کی کمی بلکہ محرومی تھی۔ اس قسم کا فراڈ کاروبار شروع کرنے کے لئے شروع میں کچھ ... بلکہ بہت کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے تاکہ لوگ رونق میلہ اور خوبصورت لڑکیوں کی چمک دمک دیکھ کر پھنستے چلے جائیں۔ منصور کے ساتھ حیدر آباد میں گواہ کی زبانی پارٹنر شپ تھی لیکن عاصم پڑھا لکھا شخص تھا اس نے باقاعدہ پارٹنر شپ بزنس کا ایگری منٹ تیار کروایا۔ اتفاق سے میں اس ایگری منٹ کی ایک نقل حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اس ایگری منٹ کی رو سے اگر ایک پارٹنر کو کوئی حادثہ پیش آ جاتا ہے تو کمپنی کے تمام تر اثاثہ جات دوسرے پارٹنر کی تحویل میں چلے جائیں گے۔ یعنی عاصم کی موت کے بعد کمپنی کے تمام اکاؤنٹس اور ان میں موجود رقم اب گواہ سہیل کی ہے جو اس کمپنی کے ایم ڈی ہیں اور مقتول عاصم کو اس مکار شخص نے جی ایم کا عہدہ دے رکھا تھا۔

دیگر ملازمین میں سے کسی کو یہ معلوم نہیں کہ ان دونوں کے درمیان کس قسم کے شراکتی کاروبار کا معاہدہ ہوا تھا۔

کسی ایگری منٹ یا اس کی نقل حاصل کرنے والی بات میں نے محض گواہ کو دھوکا دینے کے لئے کی تھی۔ جب کہ میرے پاس کوئی نقل نہیں تھی۔ البتہ ان کے درمیان ایسے کسی ایگری منٹ کی سن گن مجھے مل چکی تھی۔ میرا یہ حربہ خاصا کارگر رہا۔ میں نے گواہ سہیل کو کٹہرے کی ریلنگ تھامے زمین پر اکڑوں بیٹھتے ہوئے دیکھا۔ لوہا پوری طرح گرم ہو چکا تھا لہٰذا میں نے آخری چوٹ بھی داغ دی۔

"باقی باتیں تو رہیں ایک طرف لیکن مجھے امید نہیں تھی کہ استغاثہ کا گواہ مسٹر سہیل اتنا بڑا کباڑیا ثابت ہو گا۔ اس نے سال ڈیڑھ سال سے ایک خطرناک آلۂ قتل کو بڑی حفاظت سے سنبھال رکھا ہے۔ میرا مطلب ہے اس نے جس خنجر سے اپنے حیدر آبادی پارٹنر کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اسی خنجر سے عاصم کو بھی قتل کر ڈالا۔"

"یہ جھوٹ ہے....." وہ کٹہرے کے فرش پر بیٹھے بیٹھے چلایا۔ "میں نے عاصم کو خنجر سے نہیں بلکہ پیپر نائف....."

وہ بولتے بولتے رک گیا اور متوحش نظر سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت سہیل کی حالت ایسی تھی کہ کاٹو تو خون نہیں اور چھوڑو تو وہ کاٹ ڈالے۔ میں نے اس کے جرم کے موی تابوت میں اسٹیل کی میخ ٹھونکتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو مسٹر سہیل! مقتول عاصم کو پیپر نائف ہی سے قتل کیا گیا ہے۔ خنجر والی بات تو میں نے تمہاری زبان کھلوانے کے لئے کی تھی....."

شکست اور جرم کے افشا نے اسے ہوش و حواس سے بے گانہ کر دیا۔ وہ ایک دم اٹھ کر کھڑا ہوا اور مجھ پر حملہ آور ہونے کے لئے ہوا میں اچھلا لیکن کپکپاتی ہوئی ٹانگوں نے اس کا ساتھ نہ دیا اور وہ کٹہرے کے فرش پر ہی ڈھیر ہو گیا۔ اس زمین بوسی کے دوران ہی اس کے منہ سے میرے لئے مغلظات کا طوفان امڈ پڑا۔

"بیگ کے بچے! میں تمہیں بھی اسی طرح فٹ کر دوں گا جیسے میں نے ... جیسے میں نے ...!"

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔

❋❋❋

گزشتہ پیشی پر "ایزی لائف ٹریڈرز" کے ایم ڈی نے جس رویے کا مظاہرہ کیا تھا اس کو

سمجھنے کے لئے کسی اسپیشل عقل اور تجربے کی ضرورت نہیں تھی۔ جج نے اسے پولیس کے حوالے کرتے ہوئے حکم دیا کہ اس کیس کی دوبارہ صحیح رخ پر تفتیش کر کے نیا چالان پیش کیا جائے۔

انکوائری آفیسر ہر پیشی پر عدالت کے کمرے میں موجود رہا تھا اور اس کیس کی پل پل بدلتی صورت حال اس سے پوشیدہ نہیں تھی۔ لہٰذا پولیس کسٹڈی میں سہیل "تفتیش" کا مقابلہ نہ کر سکا اور اقبال جرم کرتے ہی بنی۔ اس نے اقرار کر لیا کہ وہ کافی دنوں سے عاصم کا پتا صاف کرنا چاہتا تھا اور اس کام کے لئے وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔ قربانی کا بکرا بنانے کے لئے اس کی نظر تین افراد پر ٹکی ہوئی تھی یعنی فرید مرزا، ارشد عثمانی اور ریاست علی۔ ارشد عثمانی بھی باقی دو کے مانند ہی بے وقوف تھا لیکن قرعہ ریاست علی کے نام نکل آیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا ہو گا وہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

سہیل کے اقبال جرم نے میرے مؤکل کا معاملہ صاف کر دیا لہٰذا آئندہ پیشی پر عدالت نے اسے باعزت بری کر دیا۔

دوسروں کے لئے گڑھا کھودنے والوں کو یہ بات ضرور ذہن میں رکھنی چاہئے کہ وہ اس گڑھے میں خود بھی گر سکتے ہیں۔" سہیل نے ریاست علی کو جس پھندے میں جکڑنے کی کوشش کی تھی بالآخر وہ پھندا اس کی اپنی گردن کا مقدر ٹھہرا۔

❋ ...... ❋

طرفہ تماشا

بچپن، جوانی اور بڑھاپا زندگی کے تین ایسے دور ہیں جن کا مزہ اور تقاضے جدا جدا ہیں۔ بچپن میں انسان بادشاہ ہوتا ہے، جوانی میں بے فکر اور کھلنڈرا جب کہ بڑھاپا اترتے ہی اس کے انداز واطوار بدل جاتے ہیں۔ یہ دعویٰ کرنا بہت مشکل ہے کہ ایک بچہ جوانی میں کیسا نکلے گا اور ایک جوان بڑھاپے کی عمر کو پہنچنے کے بعد کیا سے کیا ہو جائے گا۔ عام طور پر دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ جن بچوں کا بچپن سخت قسم کی نگرانی میں گزرا ہو، جوانی میں اگر انہیں آزادی اور خود مختاری میسر آ جائے تو وہ کھل کھیلتے ہیں لیکن جیسے ہی وہ عمر کی اس منزل کو چھوتے ہیں جہاں جوانی بڑی بے رخی سے رخصت ہو جاتی ہے تو اچانک ان کی جون بدل جاتی ہے۔ انہیں جوانوں والی وہ تمام حرکتیں گناہ صغیرہ و گناہ کبیرہ دکھائی دینے لگتی ہیں۔ جنہیں اپنی جوانی میں وہ "حق" سمجھتے تھے اس فطرت کے حامل بوڑھے والدین اپنی جوان اولاد کے لئے کسی عذاب سے کم نہیں ہوتے۔ اس سے قطع نظر کہ وہ غلط کر رہے ہوتے ہیں یا درست، بہرحال ان کا طرز عمل بڑا ہی غیر حقیقت پسندانہ، اذیت رساں اور مضحکہ خیز ہوتا ہے۔"

لگتا ہے تمہید کچھ طویل ہو گئی ہے۔ اب میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔ زیر نظر واقعے کا تعلق چونکہ ایک ایسے ہی کردار سے ہے اس لئے مجھے امید ہے، یہ طویل تمہید آپ کو گراں نہیں گزرے گی۔

جنوری کا مہینہ اپنی جولانی پر تھا۔ کراچی میں عموماً موسم سرما مذاق کی حد تک اپنی جھلک دکھا کر غائب ہو جاتا ہے۔ اگر کسی سال ہفتہ دس دن سے زیادہ سردی رہے تو اسے موسم کی جولانی سمجھ کر یہ تصور کر لیا جاتا ہے کہ بھئی اس سال بڑی قیامت کی سردی پڑ رہی ہے۔ اس سال کا جنوری بھی کچھ ایسی ہی بہار دکھا رہا تھا۔ دسمبر کے وسط سے شروع ہونے والی سردی ابھی تک برقرار تھی۔

میں حسب معمول اپنے چیمبر میں بیٹھا تھا کہ میری سیکرٹری نے ایک جوڑے کی آمد کی

اطلاع دی۔ موسم میں خنکی بڑھ جانے کے سبب اس شام میرے دفتر میں خاصی ویرانی تھی اور جس وقت سیکرٹری نے انٹرکام پر مجھے اطلاع دی، میں دفتر بند کر کے گھر جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے، اس جوڑے کو میرے پاس بھیج دو۔'' میں نے سیکرٹری سے کہا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

چند سیکنڈ کے بعد دو افراد میرے چیمبر میں داخل ہوئے۔ سیکرٹری نے جس انداز میں کسی جوڑے کا ذکر کیا تھا اس سے یہی تاثر ابھرتا تھا کہ وہ کوئی نوجوان جوڑا ہوگا۔ لیکن میرے ذہن سے یہ تاثر اس وقت زائل ہو گیا جب میں نے انہیں دیکھا۔ وہ جوڑا ایک مرد اور ایک عورت پر مشتمل تھا جو اپنی زندگی کے آخری دور سے گزر رہے تھے۔ مرد کی عمر پچپن سے کم نہیں تھی اور عورت بھی پچاس کے پیٹے میں نظر آتی تھی۔

میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا اور بیٹھنے کے لئے اپنی میز کے سامنے بچھی کرسیوں کی جانب اشارہ کر دیا۔ مرد نے آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا تاہم عورت نے ''السلام علیکم'' پر اکتفا کیا اور اپنے ہم راہی کی تقلید میں ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ میں سوالیہ نظر سے انہیں تکنے لگا۔

مرد نے میرے چیمبر میں ایک طائرانہ نگاہ دوڑائی پھر میری طرف دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''کیا مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ آپ ہی ہیں؟''

''جی ہاں ....'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''آپ بالکل صحیح جگہ پر آئے ہیں۔''

''آپ کے بارے میں میرے محکمے کے ایک شخص نے بتایا تھا۔'' مرد نے کہا۔ ''شاید آپ کے ایئر کنڈیشنر کا مسئلہ تھا!''

میں نے اس بات پر چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''آپ کس محکمے سے تعلق رکھتے ہیں؟''

''کے ای ایس سی۔'' اس نے جواب دیا۔

''اوہ!'' میں ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ غالباً فاروقی کا ذکر کر رہے ہیں؟''

''جی ہاں ..... جی ہاں!'' وہ تائیدی انداز میں سر ہلانے لگا۔

فاروقی کے ذکر پر تین چار ماہ پہلے کا ایک واقعہ میرے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ کراچی میں کم از کم گیارہ ماہ تک ایئر کنڈیشنرز کا استعمال ایک عام سی بات ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک

ماہ کے لئے ایئر کنڈیشنرز کو اس لئے بھی چھٹی دے دی جاتی ہے کہ بے چارے موسم سرما کو ندامت محسوس نہ ہو۔ چند ماہ پہلے اچانک میرے دفتر کا الیکٹرک بل معمول سے پانچ گنا آ گیا۔ میں نے احتیاطاً بجلی کے میٹر کو چیک کیا تو پتہ چلا لگ بھگ ہزار یونٹ سے زیادہ ریڈنگ پر بلنگ کی گئی تھی۔ بل پر درج شدہ ریڈنگ، میٹر سے ہزار یونٹ آگے کی تھی۔ میں نے بل کی ادائیگی کی بجائے متعلقہ دفتر کے شکایتی شعبے میں ایک لمبی چوڑی درخواست دے دی۔ اس درخواست کے جواب میں متعلقہ محکمے کا ایک انسپکٹر معائنے کے لئے میرے دفتر پہنچا اور میٹر کو ٹھونک بجا کر دیکھنے کے بعد اس نے یہ فتویٰ صادر کر دیا کہ میٹر ریڈر، ریڈنگ نوٹ کرنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ یقیناً آپ نے بعد میں کسی تکنیک سے میٹر کو الٹا گھما دیا ہے۔ ایئر کنڈیشنر چلانے والے ایسے ہتھکنڈے استعمال کرتے رہتے ہیں۔''

فاروقی نامی اس انسپکٹر کا فتویٰ سن کر مجھے غصہ آ گیا۔ اس نے جس ''تکنیک'' کا ذکر کیا تھا، بعض بجلی چور افراد واقعی اسے استعمال کرتے ہیں لیکن میں نے چونکہ ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی لہٰذا میں اس انسپکٹر پر چڑھ دوڑا۔ اسے امید نہیں تھی کہ میری جانب سے ایسے جارحانہ رویے کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مذکورہ محکمے سے متعلق انسپکشن کے عملے کے بعض افراد اس قسم کے جعلی فتوے دینے کے لئے خاصے بدنام ہیں۔ اس حرکت کا مقصد صرف اتنا سا ہوتا ہے کہ صارف کو پریشان کر کے اپنی جیب گرم کر لی جائے۔ فاروقی کا شمار بھی ایسے ہی افراد میں ہوتا تھا مگر اس روز میں نے اس کی ساری توقعات پر پانی پھیر دیا۔ اسے تو کھری کھری سنا کر میں نے اپنے دفتر سے روانہ کیا ہی تھا، اس کے ساتھ ہی میں نے محکمے کے ایک بڑے افسر سے جا کر بالمشافہ ملاقات بھی کی۔ میں گزشتہ دو سال کے بلز کا ریکارڈ بھی احتیاطاً ساتھ لے گیا تھا۔ متعلقہ افسر نے بڑی توجہ سے میری بات سنی، میری بات کو اہمیت دی، انسپکٹر فاروقی کو وہیں بلا کر ڈانٹ پلائی اور متنازع بل کو بلنگ ڈیپارٹمنٹ میں بھیج دیا، اس ہدایت کے ساتھ کہ میٹر ریڈنگ کے مطابق درست بل بنا کر دیا جائے۔

میرا یہ کام اتنی آسانی سے ہو جانے کی دو بڑی وجوہات ہیں۔ ایک تو میں براہ راست اس محکمے کے بڑے افسر سے جا کر ملا تھا، دوسرے میں ایک وکیل تھا۔ ان افراد کی پریشانی کا آپ بہ خوبی اندازہ لگا سکتے ہیں جو ان سہولیات سے محروم، محکمے کے رحم و کرم پر آئے دن دفتروں کے چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ قصہ مختصر، فاروقی اگلے روز ہی میرے دفتر آیا اور اپنے رویے پر دلی معذرت بھی پیش کی۔ اس کے ساتھ ہی یہ آفر بھی کی کہ اگر مجھے کبھی اس محکمے سے کام پڑے تو میں بلا تکلف اسے زحمت دوں۔ میں نے اسے زحمت دینے کی ضرورت تو

محسوس نہیں کی البتہ وہ میرے پاس کلائنٹ بھیجنے کی مہربانی کرتا رہتا تھا۔ اس سلسلے کا تازہ ترین ثبوت میرے سامنے بیٹھا تھا۔

میں نے ازراہِ مذاق اس شخص سے کہا۔ ''کیا آپ کے فاروقی صاحب کو پھر میرے ایئر کنڈیشنر سے کوئی شکایت پیدا ہو گئی ہے جو انہوں نے اپنی جگہ آپ کو میرے پاس بھیجا ہے؟''

''نہیں وکیل صاحب! ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔

عورت لب کشا ہوئی۔ ''ہمیں تو اپنی مصیبت کھینچ کر آپ کے پاس لے آئی ہے۔''

''اوہ.....'' میں نے باری باری ان کے چہروں کی طرف دیکھا اور گہری سنجیدگی سے کہا۔

''آپ کو کیا مسئلہ درپیش ہے؟ اور اس سلسلے میں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' پھر ایک لمحے کے توقف سے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مسئلہ بیان کرنے سے پہلے اپنا مختصر سا تعارف بھی کرا دیں تو اچھا ہے۔''

مرد نے اپنی ساتھی عورت کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھا اور میری فرمائش پوری کرتے ہوئے بولا۔ ''میرا نام ہدایت اللہ ہے اور یہ میری بیوی فریدہ ہے۔'' اس نے اپنے پہلو میں بیٹھی ہوئی عورت کی جانب اشارہ کیا۔ ''ہم پاپوش نگر میں رہتے ہیں۔ اپنے کام کے بارے میں، میں آپ کو بتا چکا ہوں لیکن.....!''

وہ بڑے معنی خیز انداز میں جملہ نامکمل چھوڑ کر خاموش ہوا تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''لیکن کیا ہدایت اللہ صاحب؟''

''جس طرح ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں بالکل اسی طرح کسی محکمے کے تمام افراد ایک جیسے نہیں ہوتے۔'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ فاروقی نے مجھے اپنے ریفرنس کے ساتھ آپ کے پاس بھیجا ہے مگر اللہ کا شکر ہے، میں نے اپنی اولاد کو ہمیشہ رزق حلال کھلانے کی کوشش کی ہے لہٰذا میں کسی بھی محاذ پر کبھی سکی محسوس نہیں کرتا ہوں۔''

''ویری گڈ..... ویری گڈ!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''اللہ آپ کو اس نیکی کا صلہ ضرور دے گا۔'' ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے کاغذ قلم سنبھال لیا پھر ہدایت اللہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں، تو آپ کو کون سی مصیبت کھینچ کر میرے پاس لے آئی ہے؟''

''ہم رضوان کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔'' فریدہ نے رندھی ہوئی آواز میں بتایا۔

''میں نے پوچھا۔'' یہ رضوان کون ہے... اور اس نے آپ کو کیوں پریشان کر رکھا ہے؟''

ہدایت اللہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''رضوان ہمارے بڑے بیٹے کا نام ہے۔ اس نے ہمیں پریشان نہیں کر رکھا بلکہ ہم اس کی وجہ سے پولیس کے ہاتھوں پریشانی اٹھا رہے ہیں۔''

''اوہ... تو معاملہ گمبھیر ہے۔'' میں نے رف پیڈ پر قلم گھسیٹنے کے بعد نگاہ اٹھا کر باری باری ان میاں بیوی کو دیکھا اور کہا۔ ''اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو پولیس نے آپ کے بیٹے رضوان کو گرفتار کر لیا ہے؟''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے وکیل صاحب!'' ہدایت اللہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''رضوان اس وقت تھانے میں بند ہے۔''

''رضوان کو کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''اس پر چچا کے قتل کا الزام عائد کیا گیا ہے۔'' ہدایت اللہ نے جواب دیا۔

''یعنی آپ کے چھوٹے بھائی کے قتل کا الزام؟'' میں نے تعجب خیز نظر سے اسے دیکھا۔

''جی ہاں، پولیس کا کہنا ہے رضوان نے اپنے چچا حیات اللہ کو قتل کیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''یہ کب کی بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے رضوان کی گرفتاری کب عمل میں آئی؟''

ہدایت اللہ نے بتایا۔ ''رضوان کو چار جنوری کی رات گیارہ بجے گھر سے گرفتار کیا گیا ہے۔''

''یعنی یہ چار روز پہلے کا واقعہ ہے!'' میں نے ٹیبل کیلنڈر پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے میرے پاس آنے میں خاصی دیر کر دی۔ اگر آپ کا بیٹا اس وقت تھانے میں بند ہے تو یقیناً وہ پولیس کسٹڈی میں عدالتی ریمانڈ پر ہو گا۔''

ہدایت اللہ نے اثبات میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ''پولیس نے گرفتاری سے اگلے روز رضوان کو عدالت میں پیش کر کے سات دن کا ریمانڈ حاصل کر لیا ہے۔ واقعی میں نے آپ کے پاس پہنچنے میں کافی تاخیر کر دی ہے۔ بہرحال وکیل صاحب! ہم بڑی آس، بڑی امید لے کر یہاں آئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے!'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''میں آپ کی ہر ممکنہ قانونی مدد کرنے کی

کوشش کروں گا۔ آپ مجھے اس کیس کے بارے میں تفصیل سے بتائیں تاکہ معاملے کو سمجھنے میں مجھے آسانی ہو۔ اگر پولیس نے رضوان پر ہاتھ ڈالا ہے تو اس کی کوئی ٹھوس وجہ بھی ہو گی؟''

''وکیل صاحب! ماں کا دل کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔'' فریدہ گلوگیر انداز میں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ رضوان قاتل نہیں ہے۔ میرے بیٹے کو کسی گہری سازش کے تحت اس معاملے میں ملوث کیا گیا ہے۔''

''میں آپ کے جذبات کو محسوس کر سکتا ہوں خاتون!'' میں نے فریدہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن عدالت دل کی گواہی کو تسلیم نہیں کرتی۔ اس سفاک حقیقت کو ہمیشہ ذہن میں رکھیں کہ عدالت میں اپنی بات کو سچا ثابت کرنے کے لئے منطقی دلائل اور ٹھوس ثبوت مہیا کرنا پڑتے ہیں۔ عدالت دل کی نہیں، دماغ کی بات پر کان دھرتی ہے۔'' پھر میں نے ہدایت اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

''آپ مجھے وہ تمام حقائق اور واقعات بتائیں جن کی روشنی میں آپ کے بیٹے کو قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے؟''

''یہ خاصی طویل داستان ہے۔'' وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''پتہ نہیں، آپ بھی کیا سوچیں گے، میں ماضی کے کن قصوں کو لے کر بیٹھ گیا ہوں!''

میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''آپ میری فکر نہ کریں۔ میں قصے اور کہانیاں سننے کے لئے ہی یہاں دفتر کھولے بیٹھا ہوں۔ ایک اچھے وکیل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے کلائنٹ کو پوری توجہ سے سنے اور اس کی بات کو اہمیت دے کیونکہ اسے عدالت میں منصف کو بھی مدلل اور ٹھوس کہانیاں سنانا ہوتی ہیں۔ اگر وہ موکل اور کیس پر وقت اور توجہ صرف نہیں کرے گا تو منصف کو متاثر کرنے میں ناکام ہو جائے گا جس کا نتیجہ ''ہار'' کی صورت ہی میں برآمد ہوتا ہے اس لئے......''

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ذرا توقف کیا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ اس کیس میں جیت آپ کے حصے میں آئے اور آپ کا بیٹا باعزت رہا ہو کر گھر پہنچ جائے تو مجھے پوری تفصیل سے آگاہ کر دیں، یہ سوچے بغیر کہ کون سی بات اہم ہے اور کون سی غیر اہم۔ یہ فیصلہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔''

میرے تسلی دلاسے نے ان دونوں کے چہروں پر امید کی کرن جگمگا دی۔ وہ خاصے مطمئن دکھائی دینے لگے۔ چند لمحات تک خاموش رہنے کے بعد ہدایت اللہ نے بولنا شروع

کیا۔ اس کے بیان کے دوران میں جا بجا فریدہ بھی لقمے دیتی رہی۔ لگ بھگ ایک گھنٹے تک وہ میرے چیمبر میں موجود رہے۔ میں نے پوری توجہ سے ان کی کہانی سنی اور جہاں ضروری سمجھا، سوالات بھی کیے۔ جب وہ میرے دفتر سے رخصت ہوئے تو ان کی پریشانی میں خاصی حد تک کمی واقع ہو چکی تھی۔

اس تمام تر گفتگو میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے میں آپ کی خدمت میں خلاصہ پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس کیس کے پس منظر سے آگاہ ہو جائیں۔ اس طرح عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی قسم کی الجھن محسوس نہیں کرے گا۔ یہ بتا دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے بعض نکات کو دانستہ چھپا لیا ہے تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب موقع پر انہیں منکشف کیا جا سکے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ بتا دوں کہ جب ہدایت اللہ اور فریدہ میرے دفتر سے روانہ ہوئے تو یہ کیس میں اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا۔ ہدایت اللہ نے اسی وقت میری مقررہ فیس ادا کر دی تھی اور آئندہ روز تھانے جا کر میں نے وکالت نامے پر ملزم رضوان کے دستخط لے لئے۔ اس مختصر سی ملاقات میں بھی چند اہم باتیں میرے علم میں آئیں جن کا ذکر بعد میں ہوگا۔

***

اس افسوس ناک کہانی کا آغاز کئی سال پہلے سے ہوتا ہے۔ کفایت اللہ نامی ایک شخص پاپوش نگر میں رہا کرتا تھا۔ بدقسمتی سے اس کی شادی ایک غلط جگہ پر ہو گئی۔ غلط جگہ سے مراد یہ ہے کہ وہ جس عورت کو اپنی بیوی بنا کر گھر لایا وہ بعد میں اچھے کردار کی ثابت نہ ہوئی۔ موجودہ کیس کا اس عورت سے براہ راست کوئی تعلق نہیں لہٰذا میں اس کے ذکر کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ قصہ مختصر، اس عورت سے کفایت اللہ کی دو اولاد نرینہ اور ایک اولاد زرینہ پیدا ہوئی۔ ہدایت اللہ اور حیات اللہ، مہناز سے بڑے تھے۔ پہلے نمبر پر ہدایت اللہ، دوسرے نمبر پر حیات اللہ اور تیسرے نمبر پر مہناز تھی

ان تینوں بچوں کی عمریں بالترتیب آٹھ، پانچ اور تین سال تھیں کہ کفایت اللہ کی بیوی اپنے بچوں کو چھوڑ کر منظر سے غائب ہو گئیں۔ کہاں؟ کیوں؟ کیسے؟ یہ سوالات بھی ہمارے کیس کا حصہ نہیں ہیں لہٰذا میں تیزی سے آگے بڑھتا ہوں۔

کوئی بھی انسان ہمیشہ زندہ رہنے کا پرمٹ بنوا کر دنیا میں نہیں آتا۔ جو پیدا ہوتا ہے اسے ایک روز مرنا بھی ہے۔ بچوں کی ماں اپنے شوہر اور اولاد کو بھول کر پتہ نہیں کہاں چلی

گئی تھی۔ کفایت اللہ نے کبھی اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی اور نہ ہی وہ خود واپس آئی۔ کفایت اللہ نے ماں اور باپ دونوں کی حیثیت سے بچوں کی پرورش کی اور اپنی محنت سے انہیں لکھا پڑھا کر جوان کر دیا۔

اولاد جوان ہو جائے تو والدین کو ان کی شادی کی فکر ہوتی ہے۔ کفایت اللہ بھی شاید اسی فرض کی ادائیگی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے ایک، دو سال کے وقفے سے تینوں بچوں کی شادیاں کر دیں۔ مہتاز بیاہ کر سکھر چلی گئی۔ ہدایت اللہ اور حیات اللہ کراچی میں رہ گئے اور اس کے بعد کفایت اللہ عدم آباد کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ وہ بچوں کے بچوں کو دیکھے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

ہدایت اللہ اور حیات اللہ، پاپوش نگر والے آبائی گھر میں رہ رہے تھے۔ کفایت اللہ نے اچھے وقتوں میں ہدایت اللہ کو بجلی کے محکمے میں ملازم کروا دیا تھا لیکن بے پناہ اصرار کے باوجود بھی حیات اللہ نے باپ کی ایسی کوئی بات مان کر نہ دی۔ وہ چھوٹے موٹے کام کر کے روزی کما رہا تھا۔ ملازمت کو وہ غلامی سمجھتا تھا اور اس کی پہلی اور آخری کوشش یہی تھی کہ وہ کسی طرح ملک سے باہر چلا جائے۔ اس زمانے میں امریکہ جانے کا بھوت لوگوں کے ذہنوں پر سوار نہیں ہوا تھا۔ بیرونِ ملک جا کر روزی کمانے والے زیادہ تر لوگ مڈل ایسٹ اور یورپ کا رخ کرتے تھے۔ مزدور پیشہ لوگ سعودی عرب کو ترجیح دیتے۔ ہنرمند افراد کویت، عراق اور ایران وغیرہ جانا پسند کرتے اور تعلیم یافتہ لوگوں کی کوشش ہوتی کہ وہ ولایت (انگلینڈ) جائیں۔ لیکن اس عمومی رجحان کے برعکس حیات اللہ کی خواہش تھی کہ وہ کسی بھی طرح امریکہ چلا جائے۔

کفایت اللہ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں بیٹے سے کہا۔ ''تم ملازمت اور نوکری کے خلاف ہو۔ اسے غلامی گردانتے ہو۔ اس کے باوجود بھی اپنے ملک کو چھوڑ کر کہیں اور جانا چاہتے ہو۔ آخر کیوں؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ وہاں تمہیں اعلیٰ افسر بنا کر سر آنکھوں پر بٹھایا جائے گا؟''

''میں اپنے ملک میں نوکری کے خلاف ہوں۔'' حیات اللہ نے رسانیت سے کہا۔ ''یہاں ملازم کو انسان نہیں سمجھا جاتا۔ اس کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کیا جاتا ہے اور محنت کی اجرت صرف اتنی دی جاتی ہے کہ انسان کھا پی کر زندہ رہ سکے اور آئندہ روز دوبارہ ملازمت پر جا سکے۔''

''تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ مڈل ایسٹ جا کر محنت کرنے والوں کو ڈھیروں روپے مل جاتے

ہیں!'' باپ نے قدرے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔ ''میں نے تو سن رکھا ہے کہ وہ لوگ پسینے کی جگہ خون نچوڑنے کے بعد ہی مزدوری دیتے ہیں۔ بلکہ یہ تو اس قدر متعصب قوم ہے کہ غیروں کو وہ لوگ اپنے پاؤں کا جوتا سمجھتے ہیں۔''

''اسی لئے تو میں امریکہ کی طرف جانا چاہتا ہوں۔'' حیات اللہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''وہاں انسان اور اس کے کام کی قدر ہے۔ ایک معمولی مزدور بھی عزت و آبرو سے اتنا کما لیتا ہے کہ اس کی زندگی عیش و آرام سے گزر سکے۔''

والدین کسی بھی ملک اور کسی بھی دور کے ہوں، وہ بحث و تکرار اور مستقبل سنوارنے کے منصوبوں کے سلسلے میں اپنی اولاد کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور ایسا کرنے کا اگر شوق بھی ہو تو بس ایک حد تک ہی جانا چاہئے ورنہ حد سے بڑھی ہوئی سختی بھیانک نتائج لے کر آتی ہے۔ کفایت اللہ اس تلخ حقیقت سے بخوبی آگاہ تھا لہٰذا اس نے حیات اللہ کی امریکہ جانے کی کوششوں کے سلسلے میں زیادہ رکاوٹ کھڑی کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ دو چار بار سمجھانے کے بعد حیات اللہ کو اس کے حال پر چھوڑ کر خاموشی اختیار کر لی۔ لیکن کئی سال بعد جب حیات اللہ ایک باپ کی حیثیت سے اپنی اولاد کے سامنے ایسی ہی صورتِ حال سے گزرا تو اس نے اپنے باپ کفایت اللہ کے برعکس فیصلہ کیا۔ وہ اپنی اولاد کی ضروریات اور تقاضوں کو نہ سمجھ سکا اور کسی ڈکٹیٹر کا کردار ادا کرتے ہوئے وہ تمام حدود کو پھلانگ گیا۔ اس کی اس عاقبت نااندیشانہ ''چھلانگ'' نے جس عبرت ناک واقعے کو جنم دیا، اس وقت آپ اسی واقعے کی تفصیل ملاحظہ کر رہے ہیں۔

حیات اللہ کی خواہش تھی کہ وہ کسی بھی طرح امریکہ چلا جائے اور اس مقصد کے لئے وہ پوری سرگرمی سے ہاتھ پاؤں بھی مار رہا تھا۔ انسان سچی لگن سے کسی بھی کام کے لئے تگ و دو کر رہا ہو، اسے کامیابی ضرور حاصل ہو جاتی ہے۔ حیات اللہ کے بھی امریکہ جانے کی راہ نکل آئی۔ ان دنوں وہ بہت خوش تھا۔ کفایت اللہ اپنے بیٹے کی خوشی کو خراب نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا اس نے حیات اللہ کو راضی خوشی امریکہ روانہ کر دیا۔

حیات اللہ کو امریکہ گئے چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ کفایت اللہ کا آخری وقت آن پہنچا۔ امریکہ جانے والوں کا ایسے مواقع پر واپس آنا ناممکن حد تک مشکل ہوتا ہے۔ خاص طور پر وہ لوگ جو روزی (اُردو اور انگلش دونوں یا دونوں میں سے کسی ایک) کی تلاش میں نئے نئے وہاں پہنچے ہوں۔ حیات اللہ اپنے باپ کا آخری دیدار نہ کر سکا اور اس کا باپ کفایت اللہ اپنے بیٹے کی روزی کی شکل نہ دیکھ سکا۔ دستورِ زمانہ یہی ہے۔

یہاں سے اس کہانی میں ایک نیا موڑ آتا ہے۔ حیات اللہ بڑی دل جمعی سے امریکہ کی سرزمین پر قسمت آزمائی کرتا رہا۔ محنت اور کوشش کرنے والے کو اس کا صلہ ضرور ملتا ہے اور حیات اللہ بڑے اچھے زمانے میں امریکہ گیا تھا۔ ان دنوں وہاں ملازمت اور روزگار بڑی آسانی سے مل جاتا تھا اور پاکستانیوں خصوصاً مسلمان پاکستانیوں کو اس قدر حقیر اور قابلِ نفرین نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا جیسی واہیات صورتِ حال آج کل ہے!

حیات اللہ نے ٹیکسی چلائی، گیس اسٹیشن کی ملازمت کی، گودام اور اسٹور میں کام کیا اور بالآخر ایک لانڈری میں وہ باعزت عہدے پر سیٹ ہو گیا۔ استحکام حاصل ہوتے ہی اس نے اپنی بیوی کو امریکہ بلانے کی کوشش شروع کر دی۔ اس زمانے میں اپنے شریک حیات کو وہاں بلانا آج کل کی طرح کارے دارد نہیں تھا۔ پھر لانڈری کا مالک، حیات اللہ سے خوش اور مطمئن تھا۔ اس سلسلے میں اس شخص نے بھی ہر ممکن تعاون کیا اور مسز حیات اللہ محترمہ رخسانہ بیگم پاکستان سے امریکہ پہنچ گئیں۔ اس کے سفر اور دیگر ضروری کاغذات کے سلسلے میں ہدایت اللہ نے دوڑ دھوپ کی اور اپنی بھاوج کو امریکہ روانہ کر دیا۔ رخسانہ ایک پردہ دار اور گھریلو عورت تھی اس نے جب امریکہ کے آزاد معاشرے کی جھلک دیکھی تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

ایک رات اس نے حیات اللہ سے پوچھا۔ ''اب میں سمجھ گئی، آپ امریکہ آنے کے لئے اس قدر زور کیوں مار رہے تھے؟ آپ کی بے چینی کا سبب نظر آ رہا ہے۔''

رخسانہ کا انداز چھیڑ چھاڑ والا تھا اور حیات اللہ بہ خوبی سمجھ رہا تھا، اس کا اشارہ کس جانب ہے۔ وہ اپنی بیوی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا۔

''تم میری بے چینی کو غلط جامہ پہنا رہی ہو!''

حیات اللہ کے انداز میں ایسی سنجیدگی اور قطعیت شامل تھی کہ رخسانہ گھبرا کر بولی۔ ''میں تو مذاق کر رہی تھی۔ آپ بڑی جلدی برا مان گئے۔''

حیات اللہ نے بیوی کو پسپا ہوتے دیکھا تو رعب گانٹھنے کے لئے تھوڑی سی اور جملے بازی کر ڈالی۔ ''رخسانہ! اگر میں اس نیچر کا ہوتا تو کوشش کر کے تمہیں ہرگز یہاں نہ بلاتا۔ بیوی تو ان معاملات میں کسی کڑک تھانے دار سے کم نہیں ہوتی۔ تمہاری موجودگی میں، میں تمہارے بیان کردہ اشاراتی شوق کہاں پورے کر سکتا تھا اور پاکستان کی بہ نسبت یہاں امریکہ میں بیویوں کو کچھ زیادہ حقوق حاصل ہیں۔''

ہنسی مذاق سے شروع ہونے والی بات صلح صفائی پر ختم ہو گئی۔

ایک حوالے سے حیات اللہ کو خوش قسمت کہا جا سکتا ہے۔ اس نے جس بھی کام میں ہاتھ ڈالا، کامیابی حاصل کر کے ہی رہا۔ اس پر اس کی بیوی بھی انتہائی وفادار، خدمت گزار اور گھریلو تھی۔ رخسانہ امریکہ پہنچی تو حیات اللہ نے محسوس کیا جیسے اس کی ذات کی تکمیل ہو گئی ہو۔ میاں بیوی ساتھ رہیں تو وقت آنے پر صاحب اولاد بھی ہو جاتے ہیں۔ جب ہدایت اللہ کے یہاں پہلی بچی کی ولادت ہوئی تو خوش بختی نے ایک مرتبہ پھر اس کے دروازے پر دستک دی۔

وہ جس لانڈری میں ملازم تھا اس کے مالک نے اپنے چلتے ہوئے کاروبار کو فروخت کر کے کسی اور اسٹیٹ میں منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ حیات اللہ کے پاس اپنا سرمایہ تو نہیں تھا کہ وہ اس لانڈری کو خرید سکتا تاہم جب اس نے اپنے باس سے کریڈٹ پر کاروبار خریدنے کی بات کی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ دو چار روز کی سوچ بچار کے بعد وہ جس فیصلے پر پہنچا وہ بھی حیات اللہ کے لئے سود مند تھا۔ مالک نے اس کے سامنے ایک تجویز رکھی کہ وہ لانڈری کو ٹھیکے پر اسے دے سکتا ہے۔

ان کے درمیان ایک کاروباری معاہدہ طے پایا اور لانڈری کا مالک کاروبار کو حیات اللہ کے حوالے کر کے دوسری اسٹیٹ کو نکل گیا۔ معاہدے کے مندرجات سے کلی طور پر کوئی آگاہ نہیں تھا۔ کچھ عرصے کے بعد حیات اللہ نے یہ تاثر دینا شروع کر دیا کہ اس نے اپنے مالک سے وہ لانڈری خرید لی تھی۔ قصہ مختصر، حیات اللہ اس لانڈری کو اپنے کاروبار کی طرح چلانے لگا۔ اس طرح وہ خاصا آسودہ حال بھی ہو گیا۔

بیلا کی پیدائش کے چند سال بعد جنید کی ولادت ہوئی۔ یہ دونوں بچے چونکہ امریکہ میں پیدا ہوئے تھے لہٰذا خود بہ خود وہاں کے شہری ہو گئے۔ حیات اللہ نے اپنے ذہن اور دولت کے گھوڑے دوڑا کر ایک قابل وکیل کی خدمات حاصل کیں اور کچھ عرصے کے بعد وہ پوری فیملی امریکی شہریت کی حامل ہو گئی۔

رخسانہ شروع شروع میں گھر سے باہر نکلتی تو اس کی زبان پر اکثر یہ جملے سجے دکھائی دیتے... استغفر اللہ، لاحول ولاقوۃ ...... وغیرہ وغیرہ۔ وہ سڑکوں پر آویزاں بڑے بڑے نیوڈ اور ہاف نیوڈ ہورڈنگز کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتی لیکن رفتہ رفتہ یہ ساری ''شرم و حیا' جاتی رہی۔ جو شے ایک تواتر کے ساتھ انسان کی زندگی میں شامل ہو کر اس کا معمول بن جائے وہ لامحالہ اس کا عادی ہوتا چلا جاتا ہے۔

رخسانہ بھی دھیرے دھیرے امریکی رنگ میں رنگتی چلی گئی اور اس ''رنگ ریزی'' میں

حیات اللہ کا بھی غالب ہاتھ تھا۔ پہلے رخسانہ کا حجاب غائب ہوا، پھر دوپٹہ بھی جاتا رہا۔ بچوں کے تقاضے الگ تھے۔ وہ امریکی فضا میں سانس لے کر پروان چڑھ رہے تھے۔ انہیں ایک امریکی ممی کی ضرورت تھی۔ اس پر حیات اللہ بھی اصرار کرنے لگا کہ وہ مشرقی لباس کو خیر باد کہہ کر جینز اور ٹی شرٹ میں آجائے۔

رخسانہ نے شوہر کے مطالبے کے سامنے کمزور سا احتجاج کیا تو وہ بولا۔ ''بیگم! اس بات کو ذہن میں بٹھا لو کہ اب ہم امریکی ہیں۔ ہمیں مزید ترقی کرنے کے لئے اس کلچر کو پوری طرح اختیار کر لینا چاہئے۔''

''مزید ترقی؟'' رخسانہ نے حیرت سے حیات اللہ کو دیکھا۔ ''میرے خیال میں ہمارے پاس خدا کا دیا ہوا سب کچھ تو ہے۔''

''انسان کے پاس جو کچھ موجود ہوتا ہے وہ اس سے زیادہ کی تمنا کرتا ہے۔'' حیات اللہ خواب ناک لہجے میں بولا۔ ''میں نے اور آگے جانے کا منصوبہ بنا رکھا ہے۔''

''میرے خیال میں اگر انسان کی جائز ضروریات بہ آسانی پوری ہو رہی ہوں تو اسے خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔'' رخسانہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ضرورت سے زیادہ کی خواہش ہوس کے زمرے میں آتی ہے۔''

''پتہ نہیں، تمہارے یہ دقیانوسی خیالات کب تبدیل ہوں گے....'' حیات اللہ نے چڑ کر کہا۔

رخسانہ حیرت اور استعجاب سے اپنے شوہر کو دیکھنے لگی۔ وہ شوہر جو چند سال پہلے تک بالکل ایسا نہیں تھا جیسا اب ہو گیا تھا۔ لانڈری کا کاروبار ہاتھ میں آنے کے بعد ہاتھ خاصا فراخ ہو گیا تھا۔ ضرورت کی تقریباً ہر شے تو پہلے ہی گھر میں موجود تھی، اب ان اشیاء کا معیار بلند ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے رہائش کے لئے بھی قدرے صاف اور مہنگے علاقے کا انتخاب کر لیا تھا۔ گاڑی بھی نسبتاً قیمتی ان کے پاس آ گئی۔ یہ تمام تر ترقی تو رخسانہ کو بھی اچھی لگتی تھی لیکن لباس اور سوشل میل جول کے حوالے سے حیات اللہ اس پر جن باتوں کے لئے زور دیتا وہ اسے معیوب کی حد تک ناپسندیدہ لگتی تھیں۔ اگر حیات اللہ ایک ہی ہلے میں اس پر سب کچھ نافذ کر دیتا تو عین ممکن تھا اس کی ذات ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی۔ یہ ''ترقی'' چونکہ رفتہ رفتہ اور غیر محسوس انداز میں ہو رہی تھی اس لئے بھی رخسانہ زیادہ دباؤ کی شکار نہ ہوئی۔ مگر اب یہ جینز اور ٹی شرٹ کا مطالبہ.....!

اپنے شوہر کی چڑچڑاہٹ کے جواب میں رخسانہ نے کہا۔ ''آپ میرے جن خیالات کو

دقیانوسی اور فرسودہ سمجھ رہے ہیں وہ آپ ہی کے سکھائے ہوئے ہیں لیکن میں محسوس کر رہی ہوں پچھلے کچھ عرصے سے آپ مشرقی روایات کو یکسر فراموش کر کے پورے امریکی بن گئے ہیں۔''

''میں تو امریکی بن ہی گیا ہوں۔'' حیات اللہ فخریہ لہجے میں بولا۔ ''اسی لئے تو چاہتا ہوں تم بھی امریکی بن جاؤ۔''

''آپ مجھے مجبور کر کے پہننے، اوڑھنے میں تو شاید امریکی بنا لیں لیکن میری سوچ، میرے خیالات تبدیل نہیں ہوں گے۔'' رخسانہ نے کہا۔ ''میں اندر سے ایک مشرقی عورت ہی رہوں گی۔''

''میں نے ترقی کے لئے جو منصوبہ بندی کی ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ تم دل و جان سے میرا ساتھ دو۔'' حیات اللہ نے حتمی لہجے میں کہا۔

''یہ آپ بار بار ترقی کے کس منصوبے کا ذکر کر رہے ہیں؟'' رخسانہ نے سوالیہ نظر سے اپنے الٹرا ماڈرن شوہر کی طرف دیکھا۔ ''آخر آپ کے ذہن میں سما کیا گیا ہے؟''

''میں شہر میں ایک ریسٹورنٹ کھول رہا ہوں۔''

''ریسٹورنٹ؟'' رخسانہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''اور اس لانڈری کا کیا ہو گا؟''

''لانڈری کو فروخت کر دیں گے۔'' حیات اللہ نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

رخسانہ بولی۔ ''اس لانڈری پر آپ نے باقاعدہ یہ کام سیکھا تھا اس لئے مسٹر ڈک کے جانے کے بعد آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ ہوٹل لائن ایک بالکل مختلف کام ہے جس کا آپ کو کوئی تجربہ نہیں۔ آپ یہ دانش مندی کا قدم نہیں اٹھا رہے!''

''میں نے آج تک کوئی ہوٹل نہیں چلایا لیکن بہت زیادہ ہوٹلنگ ضرور کی ہے اور اس فیلڈ کے متعلق میں نے تمام ضروری معلومات حاصل کر لی ہیں اس لئے میں نہیں سمجھتا کہ مجھے کسی قسم کی دشواری کا سامنا کرنا پڑے۔'' وہ ایک لمحے کے لئے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ویسے بھی اس کام میں تم سب لوگ میرا ہاتھ بٹاؤ گے اس لئے کام اور بھی آسان ہو جائے گا۔''

''کیا ...؟'' رخسانہ اچھل پڑی۔ ''کیا میں ہوٹل چلاؤں گی؟''

''اس میں حرج ہی کیا ہے؟'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ امریکہ میں ہر شخص کام کرتا ہے۔ اسی لئے تو کہتا ہوں تم ماڈرن اور

"سوشل" ہو جاؤ۔ ہمارے دونوں بچے بھی سکول سے فارغ ہونے کے بعد ہمارا ہاتھ بٹایا کریں گے۔"

اس نئے اور خاصے کھلے ڈلے وچار پر رخسانہ ہکا بکا اپنے شوہر کا منہ دیکھتی رہ گئی۔ حیات اللہ نے اپنے منصوبے کی تفصیلات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہم نے رہائش تبدیل کی ہے، آگے چل کر بچوں کے سکول بھی بدل جائیں گے۔ میرا اٹھنا بیٹھنا بھی اونچے طبقے میں ہوگا۔ تمہیں بچوں کے سکول بھی جانا ہوگا اور میرے ساتھ سوسائٹی کے اونچے طبقے میں بھی موو کرنا ہوگا۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں بیوی سے اور بچے ممی سے محروم ہو جائیں۔ اور یہ بھی ممکن نہیں کہ ہم تمہیں اپنے ساتھ رکھ کر کسی محفل میں سبکی محسوس کریں۔ اس لئے تمہیں خود میں تبدیلی لانا ہوگی۔ تم میرا مطلب سمجھ رہی ہو ناں؟"

حیات اللہ نے سوالیہ جملے پر اپنی بات مکمل کر کے رخسانہ کو ایک کڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ وہ اگر پاکستان میں ہوتی تو شاید اپنے مسئلے کا کوئی حل نکال ہی لیتی لیکن امریکہ میں وہ اپنے شوہر کی بات ماننے اور اس کا ساتھ دینے کے لئے مجبور تھی۔ وہ بچوں کے تیور اور تیزی سے بدلتے ہوئے مزاج کو بھی دیکھ رہی تھی اگر حیات اللہ کا صرف پاکستانیوں سے ملنا جلنا ہوتا تو معاملہ ہاتھ سے نہیں نکلتا۔ اس نے پتہ نہیں کس طرح ہاتھ پاؤں پھیلا کر چند امریکی فیملیز سے بھی مراسم پیدا کر لئے تھے اور وہ لوگ بھی ان کے گھر آتے جاتے تھے۔ یہی وتیرہ بچوں کا بھی تھا، ان کے دوستوں کی بھی گھر میں آمد و شد رہتی تھی۔ ان تمام تر حالات کے پیش نظر رخسانہ نے اپنے خیالات و نظریات کی قربانی دے کر شوہر کی ترقی کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

ریسٹورنٹ کھل گیا۔ حیات اللہ کے سوشل تعلقات اور وسیع ہو گئے۔ رخسانہ جینز اور ٹی شرٹ میں آ گئی۔ پہلے یہ جینز خاصی لوز اور ٹی شرٹ بھی ڈھیلی ڈھالی ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ آؤٹ فٹس میں تبدیلی آنے لگی۔ رخسانہ متناسب جسم کی مالک ایک خوبصورت عورت تھی۔ اسکن ٹائٹ جینز اور ہاف ٹی شرٹ اس کے بدن پر سجی تو ریسٹورنٹ میں اس کی موجودگی نے گاہکوں کی آمد میں خوشگوار اضافہ کر دیا۔ حیات اللہ کی ترقی کو پر لگ گئے۔

انسان پر اس کا ماحول بری طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ رخسانہ کی سوچ، انداز اور طرز زندگی بھی خالص امریکی ہو گیا۔ اب وہ بڑی آزادی کے ساتھ امریکی معاشرے میں حرکت کرتے ہوئے بالکل امریکی لب و لہجے میں بات کرتی۔ ہفتے دس دن میں ایک مرتبہ ڈسکو جانا بھی اسے معیوب نہیں لگتا تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ ایسی جگہوں پر حیات اللہ کے ساتھ

جاتی تھی۔ سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ اب حیات اللہ نے خود کو "ہائٹ" اور رخسانہ کو "رکسونا" کہلوانا شروع کر دیا تھا۔ وہ احمقوں کا سردار نہیں جانتا تھا، اس نے اپنی فیملی کو جس روش پر ڈالا ہے وہ اس کے لئے کتنی بڑی تباہی اور بربادی لائے گی!

جس رفتار سے مسٹر ہائٹ اور مسز رکسونا کی معاشی اور معاشرتی ترقی جاری تھی اس سے کہیں زیادہ تیزی سے بچے جوان ہو رہے تھے۔ حیات اللہ نے اپنی تفریح اور عیش کے لئے جس قسم کی زندگی اپنائی تھی جب وہی اور اس سے کہیں آگے بڑھ کر بچوں نے انتخاب کیا تو پہلی مرتبہ حیات اللہ کو احساس ہوا کہ اس نے امریکی معاشرت اختیار کر کے بہت بڑی..... زندگی کی سنگین ترین غلطی کی ہے۔ لیکن اب وقت وہاں آن پہنچا تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے..... اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت!

گاہے گاہے، بیلا اپنے بوائے فرینڈز کو اور جنید اپنی گرل فرینڈز کو گھر میں بھی لانے لگے تو "رکسونا" کا ماتھا ٹھنکا۔ تمام تر آزادی کی روش پر قدم رکھنے کے باوجود بھی رخسانہ کو بچوں کا یہ طرز عمل انتہائی ناگوار گزرا۔ اس نے تنہائی میں "مسٹر ہائٹ" سے اس سنگین مسئلے پر بات کی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

اگر وہ واقعی اندر باہر سے امریکی معاشرت اپنا چکا ہوتا تو اسے بیوی کے متعدد سوالات کے جواب میں بھی کندھے اچکاتے ہوئے صرف یہ کہنا چاہئے تھا۔ "اٹس نارمل"

مگر وہ یہ مختصر سا جملہ نہ بول سکا۔ اس کے ہونٹوں میں اتنی جرأت پیدا نہ ہوئی کہ وہ "دو لفظ" ادا کر کے ہر فکر و پریشانی سے آزاد ہو جاتا۔ وہ اپنے لئے جس چیز کو "نارمل" سمجھتا تھا، اپنی اولاد خصوصاً بیٹی کے لئے اسے نارمل کہتے ہوئے جان جاتی تھی۔ یہ ایک المیہ ہے کہ دوسروں کی معاشرت کو اپنانے والے بالآخر ایک روز اسی قسم کے عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

حیات اللہ اور رخسانہ کا عذاب ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ اس دوران میں وقت بڑی تیزی سے آگے بڑھتا رہا۔ جب یہ سب کچھ دیکھنا رخسانہ کے بس میں نہ رہا تو اس نے شوہر سے کہا۔ "حیات! کچھ سوچو، آگے کیا ہوگا؟"

ان کی روز افزوں ترقی نے ایک ثمر یہ بھی دیا کہ رخسانہ شوہر کے معاملے میں "آپ" سے "تم" پر آ گئی تھی۔ اس نے بچوں کے معاملے میں جس جانب اشارہ کیا، حیات اللہ اس پر روز و شب سوچتا تھا لیکن کوئی پائیدار حل سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس نے اپنے پاؤں پر جو کلہاڑی ماری تھی، اس کی تکلیف کا اندازہ اب ہو رہا تھا۔

اس نے گمبھیر لہجے میں رخسانہ سے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا، کیا کروں ...... امریکہ میں رہتے ہوئے ان پر سختی بھی تو نہیں کی جا سکتی۔ ہماری کوئی ایسی ویسی حرکت الٹا ہمیں قانون کی گرفت میں لے آئے گی۔''

''ان کی شادیاں کر دیتے ہیں۔'' رخسانہ نے مشورہ دیا۔

''یہ اس مسئلے کا حل نہیں۔'' وہ پُرتفکر انداز میں بولا۔ ''اول تو وہ اس کام کے لئے آسانی سے تیار نہیں ہوں گے۔ دوسرے بالفرضِ محال اگر ایسا ہو بھی گیا تو اسی معاشرے میں رہتے ہوئے ان کی عادات و اطوار میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ ہمیں یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنا ہوگا۔''

''میں کوشش کر کے دیکھتی ہوں حیات اللہ!'' وہ پُرعزم لہجے میں بولی۔

حیات اللہ نے بے پروائی سے کندھے اچکا دیئے۔

رخسانہ نے اپنے تئیں کوشش کی مگر بری طرح ناکام رہی۔ دونوں بچوں نے شادی کے جھنجھٹ وغیرہ میں پڑنے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ بنیادی تعلیم مکمل کر چکے تھے اور مزید آگے دیکھ رہے تھے۔ دونوں نے اپنی زندگی کے لئے ملتے جلتے شعبے کا انتخاب کیا تھا۔ بیلا آرٹ اینڈ ڈائریکشن کی فیلڈ میں قسمت آزمائی کرنا چاہتی تھی اور جنید نے فیشن ڈیزائننگ کی لائن پکڑ لی تھی۔ اپنی ''ممی'' کے استفسار پر جنید نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

''ممی! یہ شادی وادی کیا ہوتی ہے۔ میں تو اس بندھن کو ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ سمجھتا ہوں۔ پلیز! مجھے تو معاف ہی رکھیں۔''

رخسانہ نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''تم جس بندھن کو فضول سمجھتے ہو، اس کی حقیقت سن لو۔ اگر میں تمہارے باپ سے شادی نہ کرتی تو آج تمہارا کہیں نام و نشان نظر نہ آتا۔ پھر میں دیکھتی، تم کس طرح ترقی کی باتیں کرتے ہو؟''

''ممی! آپ سراسر غلطی پر ہیں۔'' جنید نے تنبیہی انداز میں انگلی دکھاتے ہوئے کہا۔ ''اولاد پیدا کرنے کے لئے شادی ضروری نہیں ہے۔ آپ لوگوں نے کسی مجبوری کے تحت شادی کی ہوگی!''

رخسانہ بیٹے کے اس جواب پر اندر سے کانپ کر رہ گئی۔ وہ پاکستان میں ہوتی تو جنید کا منہ توڑ کر رکھ دیتی۔ اسے دودھ نہ بخشنے کی دھمکی دیتی۔ ازیں علاوہ اور جو کوئی بھی جنید کے ان الفاظ کے بارے میں سنتا، اسے ملامت ضرور کرتا۔ لیکن افسوس کہ وہ لوگ اس وقت پاکستان میں نہیں بلکہ امریکہ میں تھے جہاں والدین اگر اپنی اولاد کو جھانپڑ بھی رسید کر دیں تو انہیں

جیل کی ہوا کھانا پڑتی ہے!

رخسانہ اور حیات اللہ نے اپنی اولاد کو جو راہ دکھائی تھی، اب اس راہ پر بکھرے ہوئے خار بھی نظر آ رہے تھے اور کچھ زیادہ ہی نظر آ رہے تھے۔ جب وہ دونوں زندگی کے اس دور میں اس راہ پر گامزن تھے تو یہ خار کہیں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اولاد کا معاملہ مشرقی والدین کے لئے کچھ زیادہ ہی سنگین ہوتا ہے۔ وہ جوانی میں اپنے لئے جن راحتوں اور عیش و آرام کو جائز اور سود مند سمجھ رہے ہوتے ہیں، ان کے بڑھاپے میں جب جوان اولاد اسی عیش و آرام اور راحتوں کو حاصل کرنا چاہتی ہے تو ان کی آنکھ میں کھٹکنے لگتا ہے۔ انہیں فوراً غلط و صحیح نظر آنے لگتا ہے۔ اگر ذرا تلخی اور دیانت داری سے اس معاملے کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت نکل کر سامنے آئے گی کہ دراصل ہم دو رنگی زندگی گزار رہے ہیں اور اس منافقانہ رویے کو مصلحت کا نام دے کر خود کو تسلی دے رہے ہیں!

جنید کے جواب نے رخسانہ کی ایسی کمر توڑ دی کہ وہ بیلا سے بات کرنے کی ہمت نہ کر سکی۔ اس نے حیات اللہ کو اس تشویش ناک صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ حیات اللہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں بیلا سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔''

پھر ایک مناسب موقع دیکھ کر حیات اللہ نے بیٹی سے بات کی۔ یہ انداز انتہائی دوستانہ تھا۔ وہ ایک باپ ہونے کے ناتے توقع کر رہا تھا کہ بیلا اس کی بات کو نہ صرف سنجیدگی سے سنے گی بلکہ اسے اہمیت بھی دے گی لیکن امریکی بیٹی کے پاکستانی باپ کو بیٹی کے جواب نے بہت مایوس کیا۔

''ڈیڈ! آپ جانتے ہو، میں آرٹ اینڈ ڈائریکشن کے شعبے میں کام کر رہی ہوں۔ مجھے بہت آگے جانا ہے۔ میری منزل تو ہالی وڈ میں میرا انتظار کر رہی ہے۔ اگر میں نے شادی کا روگ پال لیا تو کہیں کی نہیں رہوں گی۔''

حیات اللہ نے بیٹی کو مزید سمجھانے کی کوشش نہیں کی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں اسے بیلا کی زبان سے کوئی ایسا ویسا جواب سننے کو نہ مل جائے جو اس کی برداشت سے باہر ہو۔ ایک آزادی پسند، آزاد ملک کی عوام اپنی رائے کے اظہار میں مکمل طور پر آزاد ہوتی ہے اور امریکہ آزادی کا سب سے بڑا دعوے دار ملک ہے!

موجودہ صورتِ حال نے رخسانہ اور حیات اللہ کو بڑی سنجیدگی سے اولاد کے معاملے پر غور و فکر کرنے کے لئے مجبور کر دیا۔ کئی مہینوں کی سوچ و بچار کے بعد ایک رات حیات اللہ

نے اپنی بیوی کو یہ فیصلہ سنا دیا۔

''میں اور بے غیرتی برداشت نہیں کر سکتا۔''

اس کا سیدھا سیدھا اشارہ اولاد کی ایکٹیویٹیز (Activities) کی جانب تھا۔ رخسانہ کو یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی کہ بیلا اور جنید کی وجہ سے حیات اللہ اچانک بے حد پریشان رہنے لگا تھا۔ تشویش تو رخسانہ کو بھی بہت تھی لیکن وہ زندگی کے ہر معاملے میں اعتدال پسندی کا مظاہرہ کرنے کی قائل تھی۔ جب کہ اس کے برعکس حیات اللہ خاصا انتہا پسند واقع ہوا تھا۔

رخسانہ نے شوہر کی بات کے مفہوم کو بہت دور تک محسوس کرتے ہوئے اس سے پوچھ لیا۔

''پھر تم نے کیا سوچا ہے؟''

''میں نے جو کچھ سوچا ہے اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔''

''میں بھی تو سنوں... آخر تم نے ایسا کیا سوچ لیا ہے؟'' وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''رخسانہ! یقین کرو، ہمارے مسائل کا واحد حل یہی ہے۔'' وہ بڑی رازداری سے بولا۔

''کچھ بتاؤ گے بھی یا یونہی پہیلیاں بجھواتے رہو گے؟''

''ہم واپس پاکستان چلتے ہیں۔'' حیات اللہ نے دھماکا کیا۔

''کیا... ؟'' رخسانہ ہکا بکا اسے دیکھتی چلی گئی۔

حیات اللہ نے کہا۔ ''ہمیں اپنے بچوں کے مستقبل کو تباہ ہونے سے بچانے کے لئے یہ قربانی تو دینا ہی پڑے گی۔''

وہ چیخ کر بولی۔ ''کبھی تم اپنا مستقبل بنانے کے لئے پاکستان سے امریکہ آئے تھے، اب بچوں کا مستقبل بنانے کے لئے امریکہ سے پاکستان جانے کی بات کر رہے ہو۔ میں تو تمہاری خاطر یہ قربانی دینے کو تیار ہوں لیکن تم نے بچوں کے بارے میں ایسا کیسے سوچ لیا؟ مجھے یقین ہے بیلا اور جنید اس فیصلے کو کبھی نہیں مانیں گے۔ وہ اتنا بڑا ہنگامہ مچائیں گے کہ ایک تماشا بن کر رہ جائے گا۔ ہم انہیں زبردستی اپنے ساتھ نہیں لے جا سکیں گے۔ اگر انہوں نے ہمارے ساتھ جانے کی بجائے یہیں امریکہ میں رہنے کو ترجیح دی اور یقیناً وہ ایسا ہی کریں گے، تو یہاں کی حکومت بھی اور قانون بھی ان کا ساتھ دے گا۔ ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔''

حیات اللہ نے گمبھیر آواز میں کہا۔ ''ہم صرف اور صرف جنید اور بیلا کی خاطر امریکہ سے

پاکستان جانے کی بات کر رہے ہیں۔ اگر وہی نہ گئے تو پھر یہ ساری کوشش فضول ہے۔''

''تم ان کے عزائم سے اچھی طرح آگاہ ہو۔'' رخسانہ نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔

''بتاؤ، وہ کیوں اور کیسے ہمارے ساتھ جانے کے لئے تیار ہوں گے؟''

''اگر انسان چالاکی، عقل مندی اور حکمتِ عملی سے کام لے تو ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے۔'' حیات اللہ اپنے اصل منصوبے سے بیوی کو آگاہ کرتے ہوئے بولا۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' رخسانہ کی الجھن میں اضافہ ہو گیا۔

وہ بولا۔ ''میں نے تھوڑی دیر پہلے تمہارے تعاون کی بات کی تھی۔ اگر تم نہایت ہی رازداری سے میرا ساتھ دو تو ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔''

''تمہارے ذہن میں کیا پک رہا ہے؟'' وہ ہمہ تن گوش ہو گئی۔

حیات اللہ نے کہا۔ ''ہمارے بچے امریکی زندگی میں پوری طرح ڈھلنے کے باوجود بھی ایک طرح سے ابھی تک پاکستانی ہی ہیں۔ ہم ان کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھائیں گے۔''

''اور وہ کمزوری کیا ہے؟'' رخسانہ نے گہری دلچسپی سے پوچھ لیا۔

''امریکی بچے بالغ ہوتے ہی رزق روزگار کے لئے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیتے ہیں۔'' حیات اللہ تفصیل بیان کرتے ہوئے بولا۔ ''ان کی پہلی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی طرح والدین کے دباؤ سے نکل جائیں تاکہ وہ بعد میں ان پر ایسے فیصلے مسلط نہ کر سکیں جو ان کے لئے قابلِ قبول نہ ہوں۔ وہ اپنی مرضی کا مالک بننے کے لئے کمائی کی طرف دھیان دیتے ہیں تاکہ فنانشلی اسٹرونگ ہو کر وہ حالات کا مقابلہ کر سکیں۔ لیکن ہمارے دونوں بچے ابھی تک ہم پر بھروسہ کئے بیٹھے ہیں۔''

وہ ایک لمحے کے لئے سانس لینے کی خاطر متوقف ہوا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''ہماری فیملی کے مالی معاملات پوری طرح میرے ہاتھ میں ہیں۔ انہیں اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات کے لئے مجھ سے کہنا پڑتا ہے۔ وہ فی الحال بذاتِ خود کچھ بھی نہیں ہیں۔ اگر ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم کوئی قدم اٹھائیں تو وہ کچھ نہیں کر سکیں گے۔''

''میں تمہاری بات سے اتفاق نہیں کرتی حیات!'' رخسانہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر جنید اور بیلا کو یہ پتہ چلتا ہے کہ ہم امریکہ سے پاکستان شفٹ ہو رہے ہیں اور جیسا کہ نظر آ رہا ہے، وہ پاکستان کی بجائے امریکہ ہی میں رہنے کو ترجیح دیں گے تو اس صورت میں وہ ہمارے ساتھ جانے سے صاف انکار بھی کر سکتے ہیں۔ ان کے لئے یہاں روزگار تلاش

کرنا کوئی مشکل کام تو نہیں۔ اگر تم پاکستان سے امریکہ آ کر یہاں سیٹل ہو سکتے ہو تو ان کے لئے تو یہ سیٹنگ نہایت ہی آسان ہے۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' حیات اللہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''میں نے جس حکمتِ عملی اور چالاکی کا ذکر کیا ہے اگر اس سے کام لیا جائے تو بگڑی بن سکتی ہے۔ بس تم میرا ساتھ دینے پر تیار ہو جاؤ، پھر دیکھتی جاؤ، کیا ہوتا ہے!''

''تم اپنے منصوبے کو ایک ہی بار مجھ پر واضح کیوں نہیں کر دیتے؟'' رخسانہ نے بیزاری سے کہا۔ ''خواہ مخواہ میرا ذہن الجھا رہے ہو؟''

''ٹھیک ہے..... بتاتا ہوں۔'' حیات نے بڑی رسان سے کہا پھر اپنے منصوبے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نہایت ہی راز داری اور خاموشی کے ساتھ اپنے بزنس کو فروخت کر دیتا ہوں۔ بچوں کو اس معاملے کی خبر نہیں ہونے دیں گے۔ ان پر یہی ظاہر کیا جائے گا کہ ہم اپنے عزیزوں اور رشتے داروں سے ملنے کے لئے پاکستان جا رہے ہیں اور مہینے دو مہینے کے بعد واپس آ جائیں گے۔ میرا خیال ہے، اس صورت میں وہ میرے اور تمہارے ساتھ پاکستان جانے سے انکار نہیں کریں گے۔''

''ٹھیک ہے، وہ ہمارے ساتھ امریکہ سے پاکستان پہنچ جاتے ہیں۔'' رخسانہ نے ایک نکتہ اٹھایا۔ ''لیکن ہم تو مستقل پاکستان میں قیام کا ارادہ باندھ کر یہاں سے شفٹ ہو رہے ہیں۔ جب یہ حقیقت بیلا اور جنید پر کھلے گی تو وہ ایک ہنگامہ مچا دیں گے۔ جانتے ہو، کتنی بڑی قیامت برپا ہو جائے گی؟''

''کچھ بھی نہیں ہوگا رخسانہ!'' حیات کی آنکھوں میں عیاری چمکنے لگی۔ ''وہ پاکستان ہے، امریکہ نہیں۔ وہاں اولاد سے زیادہ والدین کی سنی جاتی ہے اور رقم کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔ یہ دونوں مالی معاملات میں ہمارے محتاج ہیں۔ پھر میں وہاں پہنچتے ہی اتنی صفائی سے ان کی شادی کا چکر چلاؤں گا کہ یہ بری طرح پھنس کر رہ جائیں گے۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

رخسانہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''تم کافی عرصے سے اللہ کو بھولے بیٹھے تھے۔ میں محسوس کر رہی ہوں، پچھلے کچھ عرصے سے تم اللہ کو کچھ زیادہ ہی یاد کرنے لگے ہو!''

وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''میں اس حقیقت کو مان گیا کہ مصیبت کے وقت میں اللہ زیادہ یاد آتا ہے۔ آج کل میں کچھ مذہبی سا ہوتا جا رہا ہوں۔ پتہ نہیں میرے اندر یہ تبدیلی کیسے آ رہی ہے!''

رخسانہ نے چوٹ کی۔ ''لگتا ہے، نو سو چوہے پورے ہونے والے ہیں.....''

وہ بیوی کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم اس منصوبے میں میرا ساتھ دینے کو تیار ہو؟''

رخسانہ نے اپنے تعاون کا اسے پورا یقین دلا دیا۔ ایک جمے جمائے کاروبار کو فروخت کر کے ایک ملک سے دوسرے ملک شفٹ ہونا اتنا آسان کام بھی نہیں ہوتا جتنا حیات اللہ نے سمجھ لیا تھا۔ پھر اسے یہ کام ایسی رازداری سے انجام دینا تھا کہ جنید اور بیلا کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ چنانچہ اس مرحلہ وار عمل میں لگ بھگ ایک سال کا عرصہ لگ گیا۔

رخسانہ کو اس بات کا اطمینان تھا کہ وہ بڑی آسانی سے پاکستان میں سیٹل ہو جائیں گے۔ وہ جتنی بڑی رقم لے کر جا رہے تھے اس سے وہ کوئی بھی کاروبار کر سکتے تھے۔ ان کا مستقبل محفوظ تھا اور بچوں کی بے راہ روی کا مسئلہ بھی حل ہوتا نظر آ رہا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ حیات اللہ کی طرف سے فکرمند رہنے لگی تھی۔ کہاں تو وہ مذہب سے دور آزاد روی کی زندگی گزار رہا تھا اور اولاد کا معاملہ سامنے آتے ہی وہ مذہب کی طرف جھکتا چلا جا رہا تھا۔ مذہب کی طرف مائل ہونا کوئی بری بات نہیں لیکن حیات اللہ نے اس پٹڑی پر چڑھتے ہی اپنے رویے میں اچانک بہت زیادہ تبدیلی کر لی تھی۔ وہ اٹھتے بیٹھتے رخسانہ کو چھوٹی چھوٹی باتوں پر ٹوکنے لگتا۔ وہ رفتہ رفتہ انتہا پسندی کی طرف جا رہا تھا۔ بچوں کے معاملے میں وہ تھوڑا احتیاط تھا کیونکہ انہیں تو مٹھی میں لانا تھا!

حیات اللہ لگ بھگ پچیس سال امریکہ میں گزارنے کے بعد اپنی فیملی کو لے کر مستقل طور پر پاکستان آ گیا۔ جنید اور بیلا یہی سمجھ رہے تھے، وہ چند دن یہاں گزار کر واپس امریکہ چلے جائیں گے۔ یہ پہلی مرتبہ پاکستان آئے تھے اور اس ٹرپ کو ایک ایڈونچر سمجھتے ہوئے بھی انہوں نے پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن چند دنوں کے بعد جب حیات اللہ نے نارتھ ناظم آباد میں رہائش کے لئے ایک عالی شان بنگلہ خرید لیا تو بچوں نے والدین کی ''سازش'' کو محسوس کر لیا۔ اس سے پہلے وہ لوگ ہدایت اللہ کے پاس پاپوش نگر والے گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ حیات اللہ نے اپنے بڑے بھائی ہدایت اللہ کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا اور ہدایت اللہ اس بات پر بے حد خوش تھا کہ پچیس سال بعد ہی سہی، چلو بھائی واپس تو آیا۔ اس سے بھی بڑی خوشی کی بات یہ تھی کہ حیات اللہ نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ ہدایت اللہ کے بڑے بیٹے رضوان کو اپنی فرزندی میں لینا چاہتا ہے۔ یہ ساری پلاننگ بیلا اور جنید کو اعتماد میں لئے بغیر کی جا رہی تھی۔ جنید کے لئے حیات اللہ نے سوچا تھا

کہ رضوان کی منجھلی بہن فرحانہ کا رشتہ مانگ لے۔ ہدایت اللہ کے لئے یہ بڑے اعزاز اور شکر کی بات تھی کہ بیٹھے بٹھائے اس کی اولاد کے اچھے رشتے آ گئے تھے۔ لیکن جب جنید اور بیلا صورتِ حال سے آگاہ ہوئے تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

وہ تو اسی بات پر والدین سے سخت ناراض تھے کہ انہوں نے پاکستان میں مستقل رہائش اختیار کرنے کا فیصلہ کیوں کر لیا تھا کجا یہ کہ وہ اب شادی کے بندھن میں باندھ کر کہیں کا بھی نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ رضوان معمولی شکل وصورت کا مالک ایک سانولا لڑکا تھا۔ بی کام کرنے کے بعد وہ ایک پرائیویٹ فرم میں اکاؤنٹنٹ بھرتی ہو گیا تھا۔ بیلا کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس کے والدین رضوان سے اس کی شادی کی بات کر رہے ہیں تو اس نے بڑے دو ٹوک الفاظ میں رضوان کو مسترد کر دیا۔ رضوان کے برعکس اس کی منجھلی بہن فرحانہ انتہائی سلیقہ شعار اور گوری چٹی، خوبصورت لڑکی تھی۔ اس نے ایف۔اے کر لیا تھا اور بی۔اے کی تیاری کر رہی تھی۔ لیکن ان تمام تر خوبیوں کے باوجود بھی جنید نے اسے ریجیکٹ کر دیا۔

اس صورتِ حال نے حیات اللہ اور رخسانہ کو پریشان کر دیا۔ بیلا اور جنید صرف شادی ہی سے انکاری نہیں تھے بلکہ انہیں اس بات پر بھی غصہ تھا کہ انہیں ایک دھوکے کے تحت پاکستان منتقل کر دیا گیا تھا۔

حیات اللہ نے بڑی چالاکی سے ان کے پاسپورٹس اور دیگر ضروری کاغذات غائب کر دیئے اور رقم وغیرہ بھی ان کے ہاتھ نہ لگنے دی کہ کہیں وہ چپ چپاتے ہی پھر سے امریکہ نہ اُڑ جائیں......!

پاکستان آتے ہی حیات اللہ کی دوستی نظم الدین نامی ایک شخص سے ہو گئی۔ نظم الدین بھی نارتھ ناظم آباد ہی میں رہتا تھا اور نہایت ہی انتہا پسند مذہبی آدمی تھا۔ نظم الدین کی صحبت میں حیات اللہ پر وہ رنگ چڑھا کہ اسے اپنے ماحول میں ہونے والی ہر بات گناہ دکھائی دینے لگی۔ اسلام اعتدال پسندی اور رواداری کا مذہب ہے، جو انسان کو عبادات کے ساتھ ساتھ اعلیٰ اخلاق اور میانہ روی کا درس دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ مذہب انتہا پسندی، ظلم اور شرک کی مذمت بھی کرتا ہے۔ لیکن بعض لوگ خود کو انتہائی مذہبی ظاہر کرتے ہوئے انتہا پسندی کی اس حد کو چھو لیتے ہیں کہ ان سے وابستہ افراد اذیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ حیات اللہ کی ایسی جون بدلی کہ وہ کچھ سے کچھ ہو گیا۔ اس کی سخت گیری، امریکہ پلٹ بچوں اور بیوی کو کچھ زیادہ ہی محسوس ہونے لگی۔

نظم الدین کی صحبت کے بعد حیات اللہ جس قسم کی نام نہاد مذہبی زندگی گزار رہا تھا، وہ

اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام کی روشنی میں کسی بھی طور پر درست اور نارمل زندگی نہیں تھی۔ اس نے اپنی بیوی اور بچوں کو ایک تماشا بنانے کے لئے اتنی سختی کرنا شروع کر دی کہ گھر میں ایک سرد جنگ کا آغاز ہو گیا۔ رخسانہ اگر کسی نامحرم سے بات کر لیتی تو اس کی شامت آ جاتی۔ اسے برقع پہن کر گھر سے نکلنے کا حکم تھا۔ جنید اور بیلا پر کی جانے والی سختیاں اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز تھیں۔ یہ وہی حیات اللہ تھا جس نے اپنی ترقی کی خاطر ایک پردہ دار بیوی کو تمام حجابوں سے نکال کر چست جینز اور ہاف ٹی شرٹ کی راہ دکھائی تھی۔ رخسانہ اس کی خوشی کی خاطر ڈسکو بھی جانے لگی تھی اور اب وہی حیات اللہ اپنی کایا پلٹ کے بعد گھر کے تین افراد کے لئے ایک مسئلہ بن گیا تھا۔

فطرت کا یہ اصول ہے کہ جب کسی بھی شعبے میں سختی اور زیادتی حد سے زیادہ بڑھ جائے تو وہاں بغاوت ضرور جنم لیتی ہے۔ اسی اصول کے تحت رخسانہ، بیلا اور جنید میں ایکا ہو گیا۔ اس محاذ پر حیات اللہ بالکل اکیلا رہ گیا۔ حیات اللہ کی تمام تر سختی کے باوجود بھی جب رخسانہ نے اولاد کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا تو صورتِ حال میں تبدیلی آنے لگی۔ کسی بھی گھر میں عورت کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس گھر کی عورت رخسانہ نے دونوں بچوں کو اپنی مٹھی میں کر لیا وہ تینوں حیات اللہ کے خلاف ہو گئے۔ جنید اور بیلا نے رخسانہ کے ساتھ اس لئے بھی الحاق کر لیا کہ حیات اللہ نے ان کا دل توڑ دیا تھا۔ وہ دونوں اپنے والدین کی دھوکا دہی پر برہم تو تھے ہی لیکن حیات اللہ نے اس سے بھی بڑھ کر ایک کام دکھایا۔

بیلا نے رضوان اور جنید نے فرحانہ کو بڑے واضح الفاظ میں مسترد کر دیا تھا۔ یہ بات حیات اللہ کے دل میں چبھ کر رہ گئی۔ کچھ عرصے بعد جب جنید اور بیلا نے مختلف کوششیں کر کے یہ دیکھ لیا کہ اب انہیں بادل ناخواستہ پاکستان ہی میں رہنا ہے تو انہوں نے یہاں رہتے ہوئے اپنے لئے ایک من پسند راہ نکالنے کی کوشش کی۔ اس بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں کہ انہوں نے امریکہ جانے کی کوشش کو موقوف کیوں کر دیا۔

جنید امریکہ میں فیشن ڈیزائننگ کے شعبے میں کام کر چکا تھا۔ گھر کے ماحول سے فرار حاصل کرنے کے لئے اس نے کلفٹن میں واقع فیشن ڈیزائننگ کا ایک ادارہ جوائن کر لیا۔ اس ادارے میں کام کرنے والے لڑکے لڑکیوں میں اکثریت برگرز کی تھی اس لئے جنید کا وہاں دل لگ گیا۔ پھر یہ دل لگ جانا، دل لگی تک پہنچ گیا۔ ادارے کی ایک لڑکی روبی سے اس کی اتنی گہری دوستی ہو گئی کہ انہوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بات رخسانہ کے توسط سے حیات اللہ تک پہنچی تو اس نے ایک معمولی سی بات کو ایشو بنا کر ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

روبی ایک بہت بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ اس کا تعلق ایک بینکر فیملی سے تھا۔ باپ کے علاوہ روبی کے دونوں بڑے بھائی اور بہن بھی مختلف بینکوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ جب یہ بات حیات اللہ کو پتہ چلی تو اس نے یہ کہہ کر اس رشتے سے صاف انکار کر دیا۔

''لڑکی کی پرورش رزق حرام سے ہوئی ہے لہٰذا میں ایسی لڑکی کو اپنے گھر کی بہو نہیں بنا سکتا۔''

حیات اللہ کے مطابق بینک کی نوکری کرنے والوں کی آمدنی سراسر حرام کی ہوتی ہے۔ کیونکہ بینک کا ہر کاروبار سود پر مبنی ہے۔ اس قسم کے خطرناک خیالات نظم الدین نے اس کے ذہن میں بھرے تھے۔ بہرحال، اس بات سے قطع نظر کہ بینک کی ملازمت سے حاصل کیا جانے والا رزق کس زمرے میں آتا ہے، سوچنے اور غور کرنے والی بات یہ تھی کہ اس میں روبی بے چاری کا کیا قصور تھا؟

اس قسم کی ہٹ دھرمی حیات اللہ نے بیلا کے معاملے میں بھی دکھائی۔ اس نے بھی خود کو نفسیاتی مریض ہونے سے بچانے کے لئے ایک کمرشل اسٹوڈیو جانا شروع کر دیا تھا۔ ''ٹرپل ایم'' نامی یہ اسٹوڈیو مل پارک کے نزدیک پی ای سی ایچ ایس میں واقع تھا اور وہاں ملٹی میڈیا مارکیٹنگ کا ہر کام ہوتا تھا۔ بیلا نے امریکہ میں آرٹ اینڈ ڈائریکشن کے شعبے میں بہت کچھ سیکھ رکھا تھا۔ دو چار دن ہی میں اسٹوڈیو کے مالک فیضان کو یہ محسوس ہو گیا کہ بیلا اس اسٹوڈیو کے لئے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ اس نے بیلا کو بھاری معاوضے پر یہاں رکھ لیا۔

چند روز بعد بیلا کی ایک ماڈل جواد حسن سے انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی۔ جواد حسن جو کمرشلز کی دنیا میں محض حسن کے نام سے جانا جاتا تھا، ایک وجیہ، پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا لڑکا تھا۔ وہ بھی بیلا پر بری طرح فریفتہ ہو گیا۔ بیلا کا حُسن و رعنائی کسی تعریف کے محتاج نہیں تھے اور نہ ہی انہیں کسی تعارف کی ضرورت تھی۔ بہت جلد ہی وہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے ... اتنے قریب کہ حسن نے حیات اللہ کی غیر موجودگی میں بیلا کے گھر میں بھی آنا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں بیلا کو اپنی ماں کی مدد اور تائید حاصل تھی۔ رخسانہ اپنے شوہر کے ظالمانہ رویوں سے تنگ آ کر پوری طرح اولاد کی حمایتی ہو گئی تھی۔

کسی طرح حیات اللہ کو حسن کے معاملے کی خبر ہو گئی اور اس نے ایک مرتبہ پھر گھر کے اندر طوفان کھڑا کر دیا اور طوفان کا جو نتیجہ نکل سکتا ہے اس کی تفصیل بیان کرنا ضروری نہیں۔ آپ بھی اسی معاشرے کے فرد ہیں، بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ بیلا کا اسٹوڈیو جانا بند کر دیا

گیا۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ حیات اللہ ان دنوں محرم اور نامحرم کے چکر میں کچھ زیادہ ہی پڑا ہوا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ رضوان کی پیٹھ بھی ٹھونکتا رہتا تھا کہ وہ اس کے گھر اکثر آتا جاتا رہے۔ نہ صرف آتا جاتا رہے بلکہ کسی طرح بیلا کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش بھی کرے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے مذہب اختیار نہ کیا ہو بلکہ دنیا دکھاوے کے لئے مذہب کا لبادہ اوڑھ لیا ہو۔ یہ سراسر منافقت اور ریاکاری تھی۔ حالانکہ اگر دیانت داری سے دیکھا جاتا تو رضوان بھی بیلا کے لئے ایک نامحرم ہی تھا اور رضوان کا بیلا کو رام کرنے کے لئے حیات اللہ کا اکسانا بھی کوئی جائز عمل نہیں تھا۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ کسی بھی شعبے کے نام نہاد چیمپئن افراد کو اپنی آنکھ کا شہتیر دکھائی نہیں دیتا مگر دوسرے کی آنکھ میں پڑا ہوا تنکا بڑی وضاحت سے نظر آنے لگتا ہے!

بیلا نے اسٹوڈیو جانا چھوڑا تو اسٹوڈیو کے مالک فیضان نے گھر کے چکر کاٹنے شروع کر دیئے۔ حسن کی آمد و رفت بھی موقوف نہیں ہوئی تھی اور رضوان بھی اپنے چچا کی ''فرمائش'' پر ادھر کا پھیرا لگا لیتا تھا۔ رخسانہ کو رضوان ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ جب کبھی حسن یا فیضان گھر میں موجود ہوتے تو وہ رضوان کو گیٹ پر ہی سے ٹہلا دیتی تھی تاہم حسن اور فیضان کی آمد و رفت حیات اللہ کی غیر موجودگی میں ہوتی تھی۔ حیات اللہ کا زیادہ وقت اپنے دوست نظم الدین کے ساتھ گزرتا تھا۔ پتہ نہیں حسن اور فیضان حیات اللہ کے معمول سے واقف ہو گئے تھے یا رخسانہ انہیں اس سلسلے میں مطلع کر دیتی تھی بہرحال، نامحرموں کی یہ آمد حیات اللہ سے چھپی ہوئی تھی۔

یہ سلسلہ کچھ عرصہ تک بہ خیر و خوبی چلتا رہا پھر پتہ چلا کہ ہدایت اللہ کے بڑے بیٹے رضوان نے اپنے امریکہ پلٹ پیارے چچا حیات اللہ کو قتل کر دیا ہے!

❋❋❋

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے عدالت میں چالان پیش کر دیا۔

مجھے اس دوران میں بھاگ دوڑ کے لئے بہت کم وقت مل سکا تھا لیکن پھر بھی میں نے حسن، فیضان، روبی، بیلا اور جنید کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ ابھی تک براہِ راست ان میں سے کسی سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ بہرحال، میں اپنے مطلب کی باتوں تک رسائی حاصل کر چکا تھا۔ اگر کوئی وکیل ہاتھ پر ہاتھ رکھے اپنے دفتر میں بیٹھا رہے یا پھر عدالت میں جج کے سامنے پُرزور انداز میں چیختا چلاتا رہے تو اس کی کامیابی

کے امکانات اتنے روشن نہیں ہوتے جتنا کہ وہ وکیل کامیاب ہوتا ہے جو ہاتھ آتے ہی کیس کے سلسلے میں ذہن کے ساتھ ساتھ اپنے ہاتھ پاؤں کو بھی زحمت دیتا ہے۔ اس حوالے سے میں نے ہمیشہ مستعدی کا مظاہرہ کیا تھا۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق حیات اللہ کی موت چار جنوری کی رات نو اور دس بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ وہ اپنے بیڈ روم میں مردہ پایا گیا تھا۔ قاتل نے اس کے سینے پر تکیہ رکھ کر فائرنگ کی تھی تاکہ گولی چلنے کی آواز دور تک نہ جا سکے۔ رپورٹ کے مطابق آلۂ قتل یعنی ریوالور سے کل چار گولیاں چلائی گئی تھیں جو تکیے کو پھاڑتے ہوئے حیات اللہ کے سینے میں پیوست ہو گئی تھیں۔ انہی میں سے دو گولیاں حیات اللہ کے دل میں اتریں اور انہوں نے اس کا کام تمام کر دیا۔ پولیس آلۂ قتل برآمد نہیں کر سکی تھی۔ تاہم اسی رات لگ بھگ ساڑھے گیارہ بجے انہوں نے میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم رضوان کو اس کے گھر واقع پاپوش نگر سے گرفتار کر لیا۔

میں نے اس روز عدالت میں اپنے مؤکل کی ضمانت کروانے کی پوری کوشش کی لیکن مجھے اس کوشش میں کامیابی نہ ہو سکی۔ قتل کے ملزم کی ضمانت بڑی مشکل سے ہوتی ہے۔ پھر پولیس کی طرف سے میرے مؤکل کے خلاف جو چالان پیش کیا گیا وہ بڑا بھرپور تھا لہٰذا جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو میرے مؤکل کے باپ ہدایت اللہ نے امید بھری نظر سے مجھے دیکھا اور کہا۔ ''بیگ صاحب! کیا آپ کو یقین ہے کہ میرا بیٹا اس مصیبت سے نکل آئے گا؟''

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور تسلی بخش لہجے میں کہا۔ ''آپ کا بیٹا بے گناہ ہے۔ اس بات کا میں نے بخوبی اندازہ لگا لیا ہے۔ لیکن جب تک اس کی بے گناہی کو عدالت کے روبرو ثابت نہ کر دیا جائے، وہ آزاد نہیں ہو گا۔ مجھے امید ہے، میں یہ مشکل کام کر گزروں گا۔ مگر اس سلسلے میں مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت پیش آئے گی۔''

''خدا آپ کی زبان مبارک کرے وکیل صاحب۔'' وہ میری تسلی اور یقین دہانی کے جواب میں بولا پھر کہا۔ ''میں آپ سے ہر قسم کے تعاون کے لئے تیار ہوں۔ آپ حکم کریں؟''

میں نے کہا۔ ''مجھے آپ کے مقتول بھائی حیات اللہ اور اس کے افراد خانہ کے بارے میں خاص قسم کی معلومات درکار ہیں۔ آپ ایسا کریں، شام کے وقت میرے دفتر آ جائیں۔''

''ٹھیک ہے جناب! میں حاضر ہو جاؤں گا۔'' وہ تعاون آمیز لہجے میں بولا۔

میں ہدایت اللہ کو رخصت کر کے اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

اس شام وہ وعدے کے مطابق میرے دفتر آیا اور میں نے اس کے ذمے ایک ضروری کام لگا دیا۔ میں فی الحال اس کی تفصیل آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ عدالتی کارروائی کے دوران میں یہ اہم باتیں مختلف مواقع پر منکشف ہوتی رہیں گی۔

آئندہ پیشی سے پہلے پہلے ہدایت اللہ نے میری مطلوبہ معلومات مجھے فراہم کر دیں۔

ایک دلچسپ بات یہ سامنے آئی کہ وقوعہ کے روز، شام پانچ بجے سے لے کر رات نو بجے تک مختلف اوقات میں حسن، فیضان اور رضوان حیات اللہ کے گھر گئے تھے اور رضوان کی گرفتاری رخسانہ کی نشان دہی پر عمل میں آئی تھی۔

آئندہ پیشی سے پہلے چونکہ مجھے بھی دوڑ دھوپ کے لئے کافی وقت مل گیا تھا لہٰذا اس کیس سے متعلق تمام اہم افراد کے بارے میں، میں نے بھی اچھی خاصی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ میں نے یہ کیس لڑنے کے لئے ایسی مضبوط بنیاد کا سامان جمع کر لیا تھا جس کے اوپر میں اپنی کامیابی کی بلند ترین عمارت کو بے خوف و خطر کھڑا کر سکتا تھا۔

❋❋❋
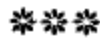
عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔

جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی اور ملزم رضوان نے صحتِ جرم سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد استغاثہ کے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ کسی کیس کا چالان عدالت میں پیش ہونے سے لے کر باقاعدہ کارروائی تک کا درمیانی عرصہ عدالت کی ابتدائی کارروائی کہلاتا ہے جو انتہائی بور اور خشک ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے کبھی اس کارروائی کی تفصیل بیان کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ تفصیل قارئین کے لئے ناقابل برداشت حد تک ناگوار ثابت ہو سکتی ہے۔ قانون کی فائلیں، ضابطے کی درجنوں کارروائیوں سے بھر جاتی ہیں۔ گواہوں کے بیانات، حلف نامے، مشیر نامے اور نہ جانے کیا کیا کچھ۔ میں آپ کے دردِ سر کا خیال کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتا ہوں لہٰذا اس مرتبہ بھی یہی کر رہا ہوں۔ اب آپ استغاثہ کے گواہوں پر جرح کا احوال ملاحظہ فرمائیں۔

استغاثہ کی جانب سے کم و بیش آٹھ گواہوں کی فہرست پیش کی گئی۔ لیکن میں قیمتی صفحات کا خیال کرتے ہوئے اہم گواہوں کے بیانات اور ان پر ہونے والی جرح کا احوال ہی تحریر کروں گا۔ میں نے اپنی جرح کا زاویہ ایسا رکھا ہے کہ ممکن ہے، مجھ سے پہلے آپ اصل قاتل تک پہنچ جائیں ....!

سب سے پہلے مقتول حیات اللہ کی گلی میں رہنے والا ایک شخص صابر حسین گواہی کے لئے گواہوں والے کٹہرے (وٹنس باکس) میں آ کر کھڑا ہوا۔ صابر حسین کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اس کا شمار ان افراد میں ہوتا تھا جو عمر کے چور ہوتے ہیں اور صورت شکل دیکھ کر ان کے بارے میں رائے قائم کرنا عموماً غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ بہرحال وہ شخص تیس اور چالیس کے درمیان کہیں اسٹینڈ کرتا تھا.....!

صابر حسین نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا اور نہایت ہی مختصر الفاظ میں اپنا بیان ریکارڈ کروا دیا۔ اس کے بعد وکیل استغاثہ جرح کے لئے گواہوں والے کٹہرے کے پاس چلا گیا۔ اس نے گواہ سے سوال کرتے ہوئے کہا۔

''مسٹر صابر! کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟'' اس کا اشارہ میرے مؤکل کی جانب تھا۔

گواہ نے اکیوزڈ باکس میں کھڑے رضوان کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جی ہاں، بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''کیا ملزم اکثر مقتول کے گھر آتا رہتا تھا؟'' وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

گواہ نے اثبات میں جواب دیا۔

''کیا یہ وقوعے کی رات بھی مقتول کے گھر آیا تھا؟'' وکیل استغاثہ نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

''جی ہاں، آیا تھا۔'' گواہ نے تصدیقی لہجے میں کہا۔

''مسٹر صابر! ذرا سوچ کر بتائیں۔'' وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے لگ بھگ کتنے بجے ملزم کو مقتول کے بنگلے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا؟''

گواہ نے جواب دیا۔ ''یہ ایک اتفاق ہے کہ میں نے وقوعے کے روز ملزم کو مقتول کے بنگلے میں داخل ہوتے ہوئے نہیں دیکھا بلکہ وہاں سے رخصت ہوتے وقت میں نے اسے دیکھا تھا۔

''صابر حسین! تم نے معزز عدالت کے روبرو بیان دیا ہے کہ ملزم اکثر مقتول کے گھر آتا جاتا رہتا تھا۔'' وکیل صفائی نے ایک خاص زاویے سے سوال کیا۔ ''وقوعے کے روز تم نے اسے وہاں سے رخصت ہوتے ہوئے دیکھا۔ کیا وقوعے کی رات تم نے اس کے انداز میں کوئی خاص بات نوٹ کی؟''

''وہ بڑی افراتفری میں مقتول کے بنگلے سے برآمد ہوا تھا۔'' گواہ نے کسی رٹو طوطے کی طرح جواب دیا۔ ''انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ بنگلے میں نقب لگا کر وہاں سے فرار ہو رہا ہو۔''

''وہ بنگلے سے نکلا۔ اس کا انداز گھبراہٹ اور افراتفری سے بھرپور تھا۔'' وکیل استغاثہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''بنگلے کے باہر آنے کے بعد اس نے کیا کیا؟''

گواہ نے ایک لمحہ غور کرنے کے بعد جواب دیا۔ ''وہ جس تیزی سے بنگلے سے نکلا تھا، اسی تیزی سے اپنی نیلی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر وہاں سے اڑن چھو ہو گیا۔''

''صابر حسین! کیا تم ملزم کی نیلی موٹر سائیکل کا میک بتا سکتے ہو؟''

''جی، وہ نیلی موٹر سائیکل سوزوکی کمپنی کی تھی۔''

''دیٹس آل یور آنر!''

وکیل استغاثہ نے اپنی جرح موقوف کی تو اجازت پانے کے بعد میں گواہ والے کٹہرے کے قریب آ گیا۔ میں چند لمحات تک استغاثہ کے گواہ صابر حسین کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر معتدل انداز میں سوال کیا۔

''صابر حسین! آپ نے معزز عدالت کو بیان دیا ہے اور بعد میں وکیل استغاثہ کی جرح کے جواب میں اس بات کی تصدیق کی ہے کہ آپ ملزم رضوان کو بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ اس واقفیت کی وضاحت کریں گے؟''

''وضاحت......؟'' وہ گڑبڑا گیا۔ ''وضاحت کیا ہو گی؟''

''آپ گھبرائیں مت بلکہ میرے سوال کو سمجھنے کی کوشش کریں۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''معزز عدالت کو صرف اتنا بتائیں کہ آپ ملزم کو کس حوالے سے جانتے ہیں؟''

''اس حوالے سے کہ وہ اکثر وہاں آتا تھا۔'' وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''اور مجھے معلوم تھا، وہ مقتول کا کوئی رشتے دار ہے۔''

''کیا آپ مقتول اور ملزم کے درمیان رشتے کی نوعیت کو سمجھتے تھے؟''

''میری معلومات کے مطابق، ملزم مقتول کا بھتیجا ہے۔''

''صابر حسین! آپ ملزم کو اکثر و بیشتر مقتول کے گھر آتے جاتے دیکھتے رہتے تھے۔'' میں نے غیر محسوس طور پر اسے گھسنا شروع کیا۔ ''کیا آپ کو دنیا میں اور کوئی کام نہیں؟''

وہ اچھل پڑا۔ ''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

وکیل استغاثہ گواہ کی مدد کو لپکا اور خاصی تیز آواز میں بولا۔ ''آبجیکشن یور آنر! وکیل

صفائی آڑھے ٹیڑھے سوالات سے معزز گواہ کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''کیا تم ہراساں ہو مسٹر صابر؟'' میں نے براہِ راست گواہ سے پوچھ لیا۔

وہ امداد طلب نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھنے لگا۔

جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ اپنے سوال کو تھوڑا آسان کر دیں۔''

''میں کوشش کرتا ہوں جناب عالی!'' میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت ہی مہذب انداز میں کہا پھر گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''صابر حسین! تم خواہ مخواہ الجھ رہے ہو اور اپنے ساتھ وکیل استغاثہ کو بھی الجھا رہے ہو۔ حالانکہ میں نے آپ دونوں کو پریشان کرنے والی کوئی بھی بات نہیں کی۔ بہرحال!'' میں لمحے بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے جو یہ کہا تھا، کیا آپ کو دنیا میں اور کوئی کام نہیں! تو اس سے میری مراد یہ تھی کہ آیا آپ ہر وقت اپنے گیٹ پر کھڑے رہتے ہیں جو ملزم کو مقتول کے بنگلے میں اکثر و بیشتر آتے جاتے دیکھتے رہتے ہیں؟''

''وہ تو میں نے محاورتاً ایک بات کہی تھی۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''ورنہ میں کیا کوئی اتنا ہی فالتو ہوں کہ ہر وقت اپنے گھر کے گیٹ پر کھڑا رہوں گا!''

''میں نے یہ کب کہا کہ آپ فالتو ہیں۔'' میں نے سہلانے والے انداز میں کہا۔ ''یقیناً اس کے علاوہ بھی آپ کی کچھ مصروفیات ہوں گی۔'' پھر اس سے پہلے کہ وہ میرے طنز کی تہ تک پہنچ پاتا، میں نے جلدی سے پوچھ لیا۔ ''ویسے آپ کا شغل کیا ہے؟''

''آج کل تو کچھ نہیں، جوانی میں کرکٹ کھیلا کرتا تھا!'' وہ بے ساختگی سے بولا۔

گواہ کے بے اختیار جواب نے عدالت کے کمرے میں موجود حاضرین کو ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ اس صورت حال نے گواہ کو خفیف سا کر دیا۔ وکیل استغاثہ بھی جھینپی ہوئی نگاہ سے جج کو دیکھنے لگا۔ میں نے ''تم ہی نے درد دیا ہے، تم ہی دوا دینا'' کے مصداق، گواہ صابر حسین کے دُکھتے ہوئے زخم پر الفاظ کا مرہم لگاتے ہوئے کہا۔

''صابر حسین! ایک تو آپ گھبرا بہت جلدی جاتے ہیں۔ میرے پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ آپ کا روزگار وغیرہ کیا ہے؟''

''جامع کلاتھ مارکیٹ میں میری کپڑے کی دکان ہے۔'' وہ قدرے سنبھلتے ہوئے بولا۔

''بڑی اچھی بات ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ پھر پوچھا۔ ''آپ نے تصدیق

کی ہے کہ ملزم اکثر مقتول کے بنگلے پر آتا رہتا تھا۔ کیا اس دوران میں آپ کی کبھی اس سے بات چیت بھی ہوئی؟''

''جی نہیں، ایسا کبھی نہیں ہوا۔'' وہ قطعیت سے بولا۔

''صابر حسین!'' میں نے جرح کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے، وقوعہ کی رات جب ملزم، مقتول کے بنگلے سے برآمد ہوا تو اس کے انداز میں ایک افراتفری پائی جاتی تھی، وہ خاصا گھبرایا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ کیا آپ کو معلوم تھا، اس کی گھبراہٹ کا سبب کیا ہے؟''

''وہ...... وہ اپنے چچا کو قتل کر کے بنگلے سے نکلا تھا۔'' وہ روا روی میں بول گیا۔

میں نے اس کے الفاظ پکڑ لئے۔ ''کیا آپ نے اسے اپنی آنکھوں سے قتل کرتے ہوئے دیکھا تھا؟''

''م...... م...... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' وہ گھبرا گیا۔

''پھر کیا مطلب تھا؟'' میں نے کڑے لہجے میں استفسار کیا۔

''میں یہ کہنا چاہ رہا تھا، یہ بات مجھے بعد میں پتہ چلی تھی کہ وہ اپنے چچا کو قتل کر کے وہاں سے فرار ہوا تھا۔'' وہ لنگڑی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

میں اتنی آسانی سے اس کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا، پوچھا۔ ''آپ کو یہ بات کس سے پتہ چلی تھی؟''

وہ مزید بوکھلا گیا۔ ''کسی سے بھی پتہ نہیں چلی تھی۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں، مقتول حیات اللہ کی موت کے بعد یہ خبر عام ہوگئی کہ اسے بھتیجے نے قتل کر دیا ہے اور...... اور دیکھ لیں، یہ بندہ اپنے چچا کے قتل کے الزام میں عدالت میں کھڑا ہے!''

گواہ صابر حسین کی فرمائش پر میں نے نگاہ اٹھا کر اپنے مؤکل رضوان کا سرسری جائزہ لیا پھر گواہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے دیکھ لیا...... !''

وہ سٹ پٹا گیا۔ ''کیا دیکھ لیا؟''

بات ختم کرتے ہی وہ متلاشی نظر سے اِدھر اُدھر تکنے لگا۔ میں نے اس کی الجھن زدہ کیفیت کو نظر انداز کرتے ہوئے جرح کے سلسلے کو جاری رکھا اور قدرے سخت لہجے میں سوال کیا۔

''صابر حسین! تھوڑی دیر پہلے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں، معزز عدالت کے رُو بہ رُو آپ نے بتایا ہے کہ وقوعہ کی رات اتفاق سے آپ اپنے گیٹ پر کھڑے

تھے کہ آپ نے ملزم کو بڑی افراتفری کے عالم میں مقتول کے بنگلے سے برآمد ہوتے دیکھا۔ وہ فرار ہوتے ہوئے کسی نقب زن کی مانند بنگلے سے باہر آیا اور اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اُڑن چھو ہوگیا۔ کیا آپ اپنے اس بیان میں کوئی تبدیلی کرنا چاہتے ہیں؟''

وکیل استغاثہ نے اپنی موجودگی کا ثبوت دینا ضروری جانا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر احتجاجی لہجے میں بولا۔ ''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی! میرے فاضل دوست گواہ کو الجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ استغاثہ کا معزز گواہ اپنے بیان کو کیوں بدلنا چاہے گا؟''

میں نے اپنا روئے سخن جج کی طرف پھیرتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! میں نے گواہ کو الجھانے کی چنداں کوشش نہیں کی۔ وکیل استغاثہ خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا رہے ہیں۔ میرے سوال کے جواب میں وہ گواہ بڑی سہولت سے کہہ سکتا ہے...... میں نے جو بیان دیا ہے اس میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں......!''

جج نے گواہ سے پوچھا۔ ''تم اس سلسلے میں کیا کہتے ہو؟''

گواہ نے عجیب سی نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا اور بولا۔ ''ظاہر ہے جناب! میں اپنا بیان کیوں بدلوں گا؟''

گواہ کے اس جواب پر جج نے مجھ سے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ جرح کے سلسلے کو آگے بڑھائیں۔''

میں گواہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔ ''صابر صاحب! آپ جس گلی میں رہتے ہیں کیا وہاں مناسب لائٹ کا انتظام ہے...... میرا مطلب ہے، کیا گلی میں اسٹریٹ لائٹس نصب ہیں؟''

''جی ہاں، ہماری گلی میں روشنی کا مناسب بندوبست ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''آپ اور مقتول حیات اللہ ایک ہی گلی میں رہتے تھے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ خود کو مقتول کا پڑوسی کہہ سکتے ہیں؟''

میں نے پیچھے ''ہاتھ پاؤں کو زحمت دینا'' اور ''دوڑ دھوپ'' کا جو ذکر کیا ہے اس کے طفیل مجھے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں ان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ گواہ اور مقتول کے بنگلے ایک گلی میں ہونے کے باوجود بھی پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر واقع تھے۔ گواہ نے جواب دیا۔

''آپ ہمیں پڑوسی تو نہیں کہہ سکتے البتہ گلی ایک ہی ہے۔''

''میرے اندازے کے مطابق آپ دونوں کے گھروں میں کم و بیش ساٹھ گز کا فاصلہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میرا اندازہ غلط تو نہیں؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا ملزم افراتفری کے عالم میں موٹر سائیکل پر سوار ہوکر آپ کے سامنے سے گزرا تھا؟''

''نہیں، وہ گلی کی دوسری سمت سے گیا تھا۔'' اس نے پورے وثوق سے جواب دیا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''صابر حسین! آپ نے وکیل استغاثہ کے سوالات کے جواب میں بتایا ہے کہ ملزم نیلے رنگ کی سوزوکی موٹر سائیکل پر سوار ہوکر وہاں سے فرار ہوا تھا۔ کیا آپ نے پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر موٹر سائیکل کا رنگ اور میک دیکھ لیا تھا؟''

''میں اتنے فاصلے سے بھلا کیسے دیکھ سکتا تھا؟'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

''پھر آپ کے وثوق کا سبب کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ دراصل بات یہ ہے کہ میں نے ملزم کو اس موٹر سائیکل پر وہاں آتے جاتے دیکھا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس لئے مجھے اس سلسلے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔''

''تو گویا آپ کا بیان ایک اندازے پر قائم ہے۔'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔

وہ پریشان نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھنے لگا۔

میں نے چڑھائی جاری رکھی۔ ''وقوعہ کی رات ملزم وہاں سے فرار ہوتے وقت آپ کے پاس سے نہیں گزرا۔ آپ نے اس کی شکل دیکھی اور نہ ہی موٹر سائیکل کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے، وہ ملزم نہ ہو، اس کی جگہ کوئی اور شخص وہاں سے فرار ہوا ہو؟''

''ملزم کی موٹر سائیکل کا رنگ میں نے اتنے فاصلے سے بھی دیکھ لیا تھا اور میں اس موٹر سائیکل کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔'' وہ ذہنی طور پر خاصا الجھ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میرے کس سوال کا کیا جواب دے۔

میں نے اسے مزید پریشان کرنے کے لئے کہا۔ ''صابر حسین! اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ وقوعہ کی رات آپ نے جس نیلی موٹر سائیکل کو مقتول کے بنگلے سے جاتے دیکھا، اس پر میں سوار ہوکر وہاں سے روانہ ہوا تھا تو آپ میرے اس دعوے کو کس طرح جھٹلائیں گے؟''

وہ بغلیں جھانکنے لگا۔ وکیل استغاثہ اس موقع پر اس کی مدد کو لپکا۔ اس نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! گواہ بڑی وضاحت سے بتا چکا ہے کہ وہ اکثر و بیشتر ملزم کو نیلی سوزوکی موٹر سائیکل پر اس گلی میں آتے جاتے دیکھتا رہتا تھا۔ ملزم کا اپنے چچا کے گھر

اکثر آنا جانا تھا لہٰذا اسے پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وکیل صفائی خواہ مخواہ اسے پریشان کر رہے ہیں۔ انہیں اس قسم کی حرکت سے باز رہنے کی تاکید کی جائے۔"

جج نے اس موقع پر مجھے کوئی تاکید کی اور نہ ہی تنبیہ۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگا۔ "بیگ صاحب! آپ اور کتنا وقت لیں گے؟"

میں نے دیوار گیر کلاک کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھا، عدالت کا وقت ختم ہونے میں دس منٹ باقی تھے۔ میں نے کہا۔ "جناب عالی! بس، دو تین سوالات کے بعد میں جرح ختم کر دوں گا۔"

"پلیز پروسیڈ۔" جج نے اجازت دینے والے انداز میں کہا۔

میں کٹہرے میں کھڑے ہوئے گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا اور اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "صابر حسین! آپ نے بتایا ہے اور وکیل استغاثہ نے اس کی تصدیق بھی کی ہے کہ آپ ملزم کو اکثر و بیشتر مقتول کے گھر آتے جاتے دیکھتے تھے لیکن کبھی آپ کی اس سے بات چیت نہیں ہوئی۔ وقوعے کے روز آپ نے ملزم کو چوروں کے سے انداز میں مذکورہ بنگلے سے فرار ہوتے دیکھا۔ وہ موٹر سائیکل پر بیٹھا اور اڑن چھو ہو گیا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے، آپ اپنے گھر کے سامنے پہلے سے موجود تھے؟"

"جی ہاں، میں لگ بھگ دس منٹ سے اپنے گیٹ پر کھڑا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "اور میں نے نیلی سوزوکی موٹر سائیکل کو مقتول کے بنگلے کے باہر کھڑے دیکھا تھا۔ میں چونکہ یہ بات پہلے سے جانتا تھا کہ مذکورہ موٹر سائیکل پر ملزم ہی وہاں آیا کرتا ہے اسی لئے صورت دیکھے بغیر میں سمجھ گیا، وہ ملزم کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔"

میں نے پوچھا۔ "صابر حسین! آپ نے وقوعے کے روز ملزم کو مقتول کے بنگلے میں داخل ہوتے نہیں دیکھا اور آپ کے بقول، جب وہ وہاں سے رخصت ہوا تو بھی آپ اس کی صورت نہیں دیکھ سکے، محض بنگلے کے باہر موٹر سائیکل کی موجودگی سے آپ نے یہ فتویٰ صادر کر دیا کہ وہ بنگلے میں آیا تھا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے، اس موٹر سائیکل پر کوئی اور بنگلے پر پہنچا ہو۔ کیا آپ نے مقتول کے بنگلے کی گھنٹی بجا کر یہ تصدیق کی تھی کہ ملزم اندر موجود ہے؟"

"مجھے کیا ضرورت پڑی تھی اس قسم کی حرکتیں کرنے کی۔" وہ برہمی سے بولا۔

"اس کا مطلب ہے آپ غائب کا علم جانتے ہیں۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "بغیر پوچھے اور دیکھے آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ ملزم اس روز مقتول کے بنگلے پر آیا تھا۔"

میری مسلسل جرح سے وہ زچ ہو گیا اور تڑخ کر اس نے الٹا مجھ ہی سے سوال کر ڈالا۔

"تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ملزم اس روز مقتول کے بنگلے میں نہیں آیا تھا؟"

"میں ہرگز یہ نہیں کہنا چاہتا۔" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "مقتول کے بنگلے پر اس روز نہ صرف ملزم پہنچا تھا بلکہ شام پانچ سے لے کر رات دس بجے تک ملزم کے علاوہ دو اور افراد بھی اس بنگلے پر گئے تھے۔ مجھے اعتراض صرف آپ کے بیان کے اس حصے پر ہے کہ میرا مؤکل نہایت افراتفری کے عالم میں وہاں سے اس طرح فرار ہوا تھا جیسے کوئی نقب زن پکڑے جانے کے خوف سے موقع واردات سے فرار ہوتا ہے!"

"میں نے جو کچھ دیکھا، وہ بیان کر دیا ہے۔" وہ اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ "آپ میری بات کا یقین کریں یا نہ کریں، یہ آپ کی مرضی ہے۔"

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اگر واقعی آپ نے کچھ دیکھا ہے تو اس کے بیان میں سراسر دروغ گوئی سے کام لے رہے ہیں۔ میرا مؤکل جس نارمل انداز میں وہاں آیا تھا، ویسے ہی امن و امان سے رخصت بھی ہو گیا تھا۔"

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔

٭٭٭

آئندہ پیشی پر "ٹرپل ایم" اسٹوڈیو میں تیار ہونے والے کمرشلز سے شہرت حاصل کرنے والا ممتاز ماڈل جواد حسن گواہوں والے کٹہرے میں موجود تھا۔ اس کا بیان ہو چکا تو وکیل استغاثہ سوالات کے لئے اس کے پاس آ گیا۔

جواد حسن المعروف بہ حسن ایک ماڈل کے معیار پر ہر طرح پورا اترتا تھا لہٰذا اس کی تعریف کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ امریکہ پلٹ حسین ساحرہ بیلا اگر اس پر فدا ہو گئی تو یہ ایک بڑی بات نہیں تھی۔ وہ پُرکشش اور وجیہہ ہونے کے علاوہ ایک پڑھا لکھا اور خوبصورت نوجوان تھا۔

وکیل استغاثہ نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "مسٹر حسن! کیا یہ درست ہے کہ ملزم اپنے مقتول چچا کو سخت ناپسند کرتا تھا؟"

"یہ بات ایک سو ایک فی صد درست ہے۔" حسن بڑے وثوق سے بولا۔

"اس ناپسندیدگی کا سبب کیا تھا؟" وکیل استغاثہ کی شرارت کچھ اور آگے بڑھی۔

"جب کوئی شخص بار بار دھتکارے جانے کے باوجود بھی پیچھا نہ چھوڑے تو اس سے لازماً نفرت ہو جاتی ہے۔" حسن نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ وہ ماڈل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا اداکار بھی تھا۔ اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ "ملزم کی مقتول کے سلسلے میں ناپسندیدگی اسی

نفرت کا ردِ عمل ہے جو مقتول اپنے دل میں ملزم کے لئے رکھتا تھا۔''

وکیل استغاثہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مسٹر حسن! بات کچھ الجھ گئی ہے۔ کیا آپ معزز عدالت کے سامنے اس الجھن کو سلجھانے کے لئے تھوڑی وضاحت کریں گے؟''

''ضرور!'' وہ اپنے دل کش بالوں میں ایک ادا سے انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔ ''دیکھیں جی، بات دراصل یہ ہے کہ ملزم مقتول کی بیٹی کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ یہ مقتول کی بیٹی بیلا سے شادی کا خواہاں تھا لیکن مقتول کو اس کی شکل ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ رشتے داری کی وجہ سے وہ گھر میں ملزم کی آمد و رفت کو روک بھی نہیں سکتا تھا لہٰذا دل ہی دل میں وہ ملزم کو برا بھلا کہتا اور جب بھی سامنا ہوتا تو ناپسندیدہ نظر سے دیکھتا۔''

وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''مقتول کے یہ دلی جذبات ملزم سے پوشیدہ نہیں تھے۔ چچا اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا چنانچہ وہ اپنی راہ کے اس بھاری پتھر سے نفرت کرنے لگا جس کا نتیجہ بھی نکل آیا۔''

حسن نے کندھے جھٹکتے ہوئے اپنی بات مکمل کی تو وکیل استغاثہ نے اسی قسم کے دو چار سوالات پوچھنے کے بعد اپنی جرح موقوف کر دی۔

میں استغاثہ کے زاویۂ واردات کو بہ خوبی سمجھ گیا تھا۔ حقائق کو الٹ کر اس نے کہانی کا رخ تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ مقتول حیات اللہ از خود یہ چاہتا تھا کہ ملزم اس کے گھر کے پھیرے لگاتا رہے تاکہ کسی بھی چارہ جوئی سے وہ بیلا کو اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ مقتول کی تو یہ خواہش تھی کہ وہ بیلا کی شادی اپنے بھائی کے بیٹے رضوان یعنی ملزم سے کر دے۔ بیلا ہی نے رضوان کو بری طرح مسترد کر دیا تھا۔ اس کے باوجود بھی رضوان اپنے چچا کے ایما پر ان کے گھر کے چکر کاٹ رہا تھا۔ بہر حال، مقتول کو ان تمام باتوں کی گواہی کے لئے سامنے لانا ممکن نہیں تھا۔ اب جو کچھ بھی کرنا تھا، مجھے ہی کرنا تھا

میں نے جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد جرح کا آغاز کیا۔ ''مسٹر جواد حسن! اگر میں آپ کو آپ کے پورے نام سے پکاروں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟''

''پورے نام سے تو آپ پکار رہے ہیں۔'' وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا۔ ''دراصل آپ ''حسن'' کے نام سے رنگ و روشنی کی دنیا میں مشہور ہیں اور آپ کے نام کا یہ حصہ ایک طرح سے شناخت بن کر رہ گیا ہے اس لئے سوچا، کہیں آپ پورے نام کے ذکر پر آکورڈ فیل نہ کریں۔''

''نہیں، نہیں... ایسی کوئی بات نہیں!'' وہ جلدی سے بولا۔

میں یہ غیر ضروری اور فروعی چھیڑ چھاڑ محض اسے پھانسنے کے لئے کر رہا تھا۔ جب وہ میری پٹڑی پر آ گیا تو میں نے اس کے ساتھ دوڑنا شروع کر دیا۔

''مسٹر حسن! آپ نے معزز عدالت کے روبہ رو وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ ملزم اپنے چچا یعنی مقتول حیات اللہ کو سخت ناپسند کرتا تھا اور بعد میں آپ نے اس کی وضاحت بھی پیش کی ہے۔ آپ سے میرا اتنا سا سوال ہے کہ آپ کی مقتول سے کیا رشتے داری ہے؟''

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور جواب دیا۔ ''کوئی رشتے داری نہیں!''

''اور ملزم سے؟'' میرے لہجے میں بڑا کٹیلا استفسار تھا۔

وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس سے بھی نہیں۔''

''کیا آپ کی ملزم سے کسی قسم کی کوئی دشمنی ہے؟''

''قطعی نہیں!''

''اور مقتول سے کوئی خاص نوعیت کی ہمدردی؟''

''ایسی کوئی خاص ہمدردی نہیں سوائے انسانی ہمدردی کے۔'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا، پھر پوچھا۔ ''لیکن آپ مجھ سے اس قسم کے سوالات کیوں کر رہے ہیں؟''

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے جرح کا سلسلہ جاری رکھا اور کہا۔ ''جب آپ کو ملزم سے کوئی پرخاش نہیں، نہ ہی مقتول سے آپ کی کوئی قریبی یا دور کی رشتے داری ہے تو پھر آپ میرے مؤکل کے خلاف گواہی دینے کیوں آئے ہیں؟''

''محض انسانی ہمدردی کے حوالے سے۔'' وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔

''ویل ڈن!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''انسانی ہمدردی انسان کے درمیان سب سے زیادہ مضبوط اور پائیدار رشتے داری کا نام ہے۔ آپ واقعی ایک سچے ماڈل ہیں۔ ایک آرٹسٹ کو اتنا ہی حقیقت پسند اور انسان دوست ہونا چاہئے۔''

وہ میرے منہ سے اپنے لئے تعریفی کلمات سن کر خوش ہو گیا۔ وجیہہ اور خوش شکل تو وہ تھا ہی۔ اس کے ہونٹوں پر سجی ایک مستقل مسکراہٹ نے اس کی دل کشی اور وجاہت میں چار چاند لگا دیئے۔ میں نے جرح کے سلسلے میں تیزی لاتے ہوئے کہا۔

''حسن صاحب! آپ کو یہ بات کیسے پتہ چلی کہ میرا مؤکل مقتول کی بیٹی بیلا کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا تھا۔ وہ بیلا سے شادی کرنا چاہتا تھا جب کہ نہ صرف بیلا اسے بری طرح

مسترد کر چکی تھی بلکہ مقتول حیات اللہ بھی اسے سخت ناپسند کرتا تھا؟''

''یہ بات مجھے خود بیلا نے بتائی ہے۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔

''آپ مقتول کی بیٹی کو کس حوالے سے جانتے ہیں؟''

''ایک بہترین کولیگ کے حوالے سے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا بیلا بھی ماڈلنگ کے شعبے سے تعلق رکھتی ہے؟''

''کہہ سکتے ہیں۔'' وہ ذومعنی انداز میں بولا۔

''کہہ سکتے ہیں، سے بات واضح نہیں ہوئی حسن صاحب!'' میں نے سوالیہ انداز سے کہا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ میں ''ٹرپل ایم'' نامی ایک شوبز اسٹوڈیو سے وابستہ ہوں۔ بیلا بھی اس اسٹوڈیو سے تعلق رکھتی ہے۔ اگرچہ اس کا شعبہ ماڈلنگ نہیں، وہ آرٹ اینڈ ڈائریکشن سے متعلق ہے لیکن شوبز کا حوالہ ایک قدرِ مشترک ہے ہم دونوں کے درمیان۔''

اس کی بات پوری ہوئی تو میں نے کہا۔ ''کہیں یہ ٹرپل ایم اسٹوڈیو وہی ادارہ تو نہیں جس کے کرتا دھرتا فیضان صاحب نامی ایک شخص ہیں؟''

''جی ہاں، میں اسی ٹرپل ایم اسٹوڈیو کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''لیکن میری معلومات کے مطابق تو بیلا نے محض چند روز تک اس اسٹوڈیو میں کام کیا تھا۔ مقتول کو اس کا یہ عمل پسند نہیں آیا تھا لہٰذا اپنے باپ کے دباؤ پر اسے اسٹوڈیو کو چھوڑنا پڑا تھا۔''

''آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ''بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''حسن صاحب! آپ کی بات سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسٹوڈیو چھوڑنے کے باوجود بھی بیلا سے آپ کا میل جول ہے؟''

''جی ہاں... ہمارے درمیان اچھے دوستوں جیسا رابطہ ہے۔'' وہ فخریہ لہجے میں بولا۔

''کیا آپ بیلا کے گھر میں بھی جا کر اس سے ملتے ہیں؟''

''ہاں، کبھی کبھار چلا جاتا ہوں۔''

''کیا آپ کو یہ بات معلوم ہے کہ مقتول اپنے گھر میں نامحرم افراد کا آنا جانا پسند نہیں کرتا تھا؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں، یہ بات بھی مجھے بیلا ہی کی زبان سے پتہ چلی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔

''مقتول آخری وقت میں کچھ زیادہ ہی ..... خیر چھوڑیں، مرنے والے کی برائی نہیں کرنا چاہئے۔'' اس نے ایک خاص انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو میں سمجھ گیا، وہ کہنا چاہ رہا تھا، مقتول آخری وقت میں کچھ زیادہ ہی مسلمان ہو گئے تھے۔ بہرحال، اس نے بات مکمل نہیں کی تھی اور ظاہر یہ کیا تھا کہ اسے مرنے والے کی حرمت کا خیال آ گیا ہے لہٰذا میں نے بھی اس سخت جملے پر اس کی گوشمالی نہ کی اور قدرے جارحانہ انداز میں استفسار کیا۔

''آپ کو مقتول کی ناپسندیدگی کا بہ خوبی علم تھا، اس کے باوجود بھی آپ اس کی بیٹی سے ملنے گھر چلے جاتے تھے۔ بتائیں، اس عمل سے آپ نے خود کو ملزم کے برابر نہیں کھڑا کر دیا تھا؟ مقتول، ملزم کی اپنے گھر میں آمد و رفت کو پسند نہیں کرتا تھا ..... بقول آپ کے؟''

''ملزم کا اور میرا معاملہ قطعی مختلف تھا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''مختلف کیسے ہو سکتا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ اس طرح کے بیلا نے ملزم کو مسترد کر دیا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جب کہ وہ میرے دوستوں میں شمار ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ میں اس کے دوستوں میں شمار ہوتا ہوں۔''

''لیکن اس سے حقیقتِ حال بدل نہیں جاتی!'' میں نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ ''آپ دونوں بیلا کے لئے نامحرموں کی فہرست میں آتے ہیں۔ اس فارمولے کے تحت آپ دونوں کو مقتول کے لئے ناپسندیدہ ہونا چاہئے۔ آپ نے تھوڑی دیر پہلے خود ہی بتایا ہے ..... مقتول آخری وقت میں کچھ زیادہ ہی.....''

میں نے بھی اسی کے انداز میں جملے کو نامکمل چھوڑا تو وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''اگر ملزم، مقتول کی ناپسندیدگی کے سبب اسے قتل کر سکتا ہے تو ایسا خیال آپ کے ذہن میں بھی آنا چاہئے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

وہ چند لمحات کے لئے سوچ میں پڑ گیا پھر جواب دیا۔ ''وکیل صاحب! میں نے عرض کیا ہے نا، ملزم کا اور میرا معاملہ قطعی مختلف تھا۔ میں ایک مرتبہ پھر اپنی بات کو دہراؤں گا۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میرے ذہن میں اس قسم کا خیال آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

میں نے چوٹ کی۔ ''میں نے ذہن میں خیال آنے کے بارے میں پوچھا تھا اور آپ

نے ذہن میں سوال پیدا ہونے کی بات کر دی۔ کہیں اس کی وجہ وہی تو نہیں؟''

میں نے معنی خیز انداز میں جملہ مکمل کیا تو وہ جلدی سے مستفسر ہوا۔ ''کون سی وجہ؟''

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وجہ بہت سادہ سی ہے مسٹر جواد حسن! اور وہ وجہ یہ ہے کہ مقتول کے گھر میں آپ کی آمد و رفت سے مقتول کو آگاہی نہیں تھی۔ لہٰذا ناپسندیدگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ مقتول کے علم میں لائے بغیر اس کی غیر موجودگی میں اس کے گھر جا کر بیلا سے ملتے تھے۔ چونکہ آپ کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی لہٰذا بقول آپ کے، آپ کا معاملہ ملزم کے معاملے سے قطعی مختلف تھا۔ میں نے کچھ غلط تو نہیں کہہ دیا؟''

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ میرے استفسار کے جواب میں کیا کہے، مبہم سے انداز میں بولا۔ ''میرا خیال ہے، آپ کا خیال بڑی حد تک درست ہے!''

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر حسن! جیسا کہ آپ نے وکیل استغاثہ کو بتایا ہے کہ ملزم، مقتول کی بیٹی بیلا کے پیچھے ہی پڑ گیا تھا۔ وہ بیلا سے شادی کا خواہش مند تھا اس لئے وہ مقتول کے گھر کے چکر لگاتا تھا۔'' میں ایک لمحے کو سانس لینے کی غرض سے رکا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''کیا آپ بھی بیلا سے شادی کے خواہش مند تھے؟''

وہ بڑی بے باکی سے بولا۔ ''دیکھیں جناب! سچی بات تو یہ ہے کہ میں اور بیلا ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور ہمارے درمیان دوستی کا گہرا رشتہ ہے۔ یہی دوستی آگے چل کر اگر شادی میں بدل جاتی تو کچھ عجب نہیں تھا۔ بہرحال، ہمارے دوستانہ تعلقات کا موجودہ کیس سے کوئی تعلق نہیں۔''

میں نے سوال کیا۔ ''جواد حسن! مقتول آپ کے بقول ملزم کو سخت ناپسند کرتا تھا اس لئے وہ اپنے گھر میں اس کی آمد و رفت کو اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ اگر اس کے علم میں یہ بات ہوتی کہ آپ بھی اس کے گھر کے چکر کاٹتے ہو تو یقیناً وہ آپ کا راستہ بند کر دیتا۔ آپ سے میرا صرف اتنا سا سوال ہے کہ گھر کے باقی افراد کا آپ کے بارے میں کیا خیال تھا... میرا مطلب ہے آپ کی آمد و رفت کے بارے میں وہ کیا سوچتے تھے؟''

جواد حسن نے جواب دیا۔ ''اس گھر میں چار افراد رہتے ہیں۔ مقتول کا معاملہ رہتوں اور نہ رہتوں والا تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت اپنے ہم خیال دوست نظم الدین کے ساتھ گزرتا تھا۔ باقی تین افراد میں سے بیلا سے میری اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ جنید اپنے معاملات میں

الجھا رہتا ہے اور جہاں تک بیلا کی ممی کا تعلق ہے تو اسے میرے وہاں آنے جانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ اس کا انداز خاصا ڈرامائی تھا۔

''میں آپ کو ایک نکتے کی بات بتاؤں!''

''ضرور، ضرور... ارشاد!'' میں نے ایک خاص انداز سے کہا۔ ''عدالت میں نکتے ہی تو اٹھائے جاتے ہیں۔ آپ بھی اس کار خیر میں ضرور حصہ لیں۔''

وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''مرنے والے کی برائی تو نہیں کرنی چاہئے لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مقتول کی زندگی میں جو انقلاب برپا ہوا تھا اس سے اس کی پوری فیملی بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ بچوں کا معاملہ تو الگ ہے لیکن میں یہاں خاص طور پر آنٹی رخسانہ کا ذکر کروں گا۔ میرے خیال میں آنٹی رخسانہ مقتول کے ظلم و ستم کا سب سے زیادہ نشانہ بنی تھیں۔''

آپ کو غالباً مقتول کی بیوہ سے گہری ہمدردی ہے؟''

''وہ عورت واقعی ہمدردی کے قابل ہے۔''

میں نے کہا۔ ''شوبز کے نگر سے تعلق رکھنے والے افراد عموماً اپنی شادی اور شادی کی خبروں کو چھپا کر رکھتے ہیں۔ لیکن تھوڑی دیر پہلے آپ نے بھری عدالت میں یہ اقرار کیا ہے کہ بیلا سے آپ کی دوستی آگے جا کر شادی میں بدل سکتی تھی۔ کیا آپ کے اس بیان سے آپ کے کیریئر پر کوئی اثر پڑ سکتا ہے؟''

وہ ڈپلومیٹک انداز میں بولا۔ ''پڑ بھی سکتا ہے اور نہیں بھی پڑ سکتا۔ بہرحال، بیلا سے میری دوستی یا شادی کا زیر سماعت کیس سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ کوئی دوسرا سوال کریں۔''

''کمال کرتے ہیں آپ بھی!'' میں نے حیرت بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''آپ اس کیس کے سلسلے میں استغاثہ کی طرف سے گواہی کے لئے عدالت میں پیش ہوئے ہیں۔ آپ نے میرے مؤکل کو قاتل ثابت کرنے کے لئے یا یوں کہہ لیں کہ قتل کا جواز واضح کرنے کے لئے خاصا زور لگایا ہے اور وہ بھی محض اس لئے کہ بیلا کی آپ سے دوستی ہے اور ملزم اسی بیلا سے شادی کا متمنی تھا۔ ان حقائق کی روشنی میں آپ بھلا کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی بیلا سے دوستی یا آئندہ شادی کے امکانات کا زیر سماعت کیس سے کوئی تعلق نہیں؟''

وہ زچ ہوتے ہوئے بولا۔ ''چلیں، آپ کہہ لیں...... تعلق ہے!''

میں نے اس کی جھنجلاہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

''ذرا سوچ کر بتائیں آپ کے اور ملزم کے علاوہ مقتول کے بنگلے کے چکر کاٹنے والوں کی فہرست میں اور کون کون شامل تھا؟''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

''مطلب بہت واضح ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''آپ کے بقول ملزم، بیلا سے شادی کا خواہاں تھا اس لئے مقتول کے بنگلے میں آتا جاتا تھا۔ آپ بیلا کے دوست ہیں اور کچھ عجب نہیں کہ آپ کی اس سے شادی بھی ہو جائے۔ عرف عام میں کہا جا سکتا ہے، آپ دونوں بیلا کے امیدوار تھے۔ میں نے ایسے ہی امیدواروں کی فہرست کے بارے میں پوچھا ہے؟''

''اس حوالے سے میں اور کسی شخص کو نہیں جانتا۔'' وہ قطعیت سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''ٹرپل ایم اسٹوڈیو کے مالک کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

''کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' وہ اچھل پڑا۔

''کہیں گے تو آپ۔ میں نے تو سوال کیا ہے۔ اس سوال کا جواب دیں۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''میں نے سنا ہے، فیضان نامی وہ شخص بھی مقتول کے بنگلے پر آتا رہتا ہے؟''

''فیضان صاحب بھی بیلا کے سلسلے میں کبھی کبھار مقتول کے بنگلے پر جاتے تھے لیکن ان کا معاملہ خالصتاً کاروباری ہے۔ فیضان صاحب کی خواہش ہے کہ بیلا اسٹوڈیو کو جوائن کر لے۔''

میں نے اچانک سوالات کا زاویہ بدل دیا اور چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''میں نے سنا ہے آپ کو امریکہ جانے کا بہت شوق ہے؟''

''آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ''میں دراصل اپنے کام کے دائرے کو وسیع کرنا چاہتا ہوں اور آپ جانتے ہیں، پاکستان کی نسبت امریکہ میں میری ترقی کے امکانات زیادہ ہیں۔''

''اور اس سلسلے میں آپ نے بیلا کو استعمال کرنے کی کوشش بھی کی تھی؟'' میں نے کہا۔

اس نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو، آپ کو یہ بات کس نے بتائی ہے۔ بہرحال جواب دینا اس پر لازم تھا اس لئے نگاہ چراتے ہوئے اس نے قدرے برہمی سے کہا۔

''استعمال کرنے کے الفاظ مناسب نہیں ہیں۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں نے اس سلسلے میں اس سے مشورہ کیا تھا۔ کیونکہ وہ امریکہ اور وہاں کے شوبز کے بارے میں وسیع معلومات رکھتی ہے۔''

''مشورہ!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ مشورہ کہ چلو ہم خاموشی سے امریکہ کی طرف نکل جاتے ہیں۔ ہیں ناں؟''

''آپ بات کو غلط انداز میں پیش کر رہے ہیں وکیل صاحب۔'' وہ برہمی سے بولا۔

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''حسن صاحب! کیا آپ وقوعہ کے روز بھی مقتول کے گھر گئے تھے؟''

''جی ہاں، گیا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''آپ وہاں کتنے بجے گئے تھے اور کتنی دیر تک وہاں رہے؟''

''میں لگ بھگ چھ بجے شام وہاں گیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''اور کم و بیش ایک گھنٹہ وہاں رکا تھا۔''

''کیا آپ کے ایک گھنٹہ وہاں قیام کے دوران میں کوئی اور نامحرم بھی اس بنگلے میں آیا تھا؟'' میں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔ ''میرا اشارہ ملزم اور فیضان کی طرف ہے۔''

''جی نہیں، مجھے کوئی بھی نظر نہیں آیا۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا کبھی ایسا بھی ہوا کہ آپ وہاں گئے ہوں اور ان دونوں میں سے کوئی ایک یا وہ دونوں پہلے سے اس بنگلے میں موجود ہوں؟''

''جی نہیں، میرے ساتھ کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا ہے۔''

''حالانکہ آپ کا دعویٰ ہے، ملزم ہر وقت اس بنگلے میں گھسا بیٹھا رہتا تھا؟''

''میرا یہ دعویٰ ان معلومات کی روشنی میں ہے جو وقتاً فوقتاً بیلا مجھے فراہم کرتی رہتی ہے۔''

''گویا آپ نے اپنی آنکھوں سے ملزم کو کبھی اس بنگلے کے اندر نہیں دیکھا۔''

اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔ میں نے اپنی جرح موقوف کر دی۔

اگلا گواہ ''ٹرپل ایم'' اسٹوڈیو کا مالک فیضان تھا۔ فیضان ایک دبلا پتلا پستہ قامت شخص تھا۔ اس نے کلف دار شلوار قمیض اور سیاہ ویسٹ کوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کی مونچھوں کے بال خاصے باغی اور منتشر سے تھے اور وہ اچھی خاصی صحت مند بھی تھیں۔ لگتا تھا فیضان نے اپنی شخصیت کی کمی کو پورا کرنے کے لئے ان فربہ مونچھوں پر کلی انحصار کر رکھا تھا۔ فیضان کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔

فیضان نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا اور اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کروا دیا۔ اس کے بعد وکیل استغاثہ نے سرسری سی جرح کر کے اسے فارغ کر دیا۔ استغاثہ کی جانب سے حسن اور فیضان کو کم و بیش ایک ہی مقدمہ کے لئے عدالت میں پیش کیا گیا اور وہ دونوں کسی نہ کسی حوالے سے بیلا سے متعلق رہے تھے۔ بیلا ہی کی زبانی انہیں پتہ چلا تھا کہ ملزم اس سے شادی کرنے کے لئے اتنا بے چین ہے کہ ہر وقت ان کے گھر میں گھسا رہتا ہے جس کے سبب مقتول کو اس سے نفرت سی ہوگئی ہے۔ اس کے نتیجے میں ملزم بھی مقتول کو ناپسند کرنے لگا تھا اور یہی ناپسندیدگی اس ناخوشگوار واقعے کا سبب بن گئی۔ لیکن فیضان کو دھونے کے لئے میرے پاس کاسٹک سوڈے کی کمی نہیں تھی۔

میں اپنی باری پر گواہ والے کٹہرے کے نزدیک آ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ اصول میں پہلے بھی کئی مرتبہ بیان کر چکا ہوں کہ عدالت میں ایک وقت میں صرف ایک گواہ کو پیش کیا جاتا ہے تاکہ اس کے بیان اور ازاں بعد اس پر ہونے والی جرح سے دوسروں کی گواہی متاثر نہ ہو۔ میں نے استغاثہ کے گواہ حسن سے جو سوالات کئے تھے، فیضان ان سے قطعی ناواقف تھا۔

میں چند لحات تک ٹٹولنے والی نظر سے گواہ کا جائزہ لیتا رہا پھر جرح کے سلسلے کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''فیضان صاحب! کیا آپ ٹریل ایم اسٹوڈیو کے مالک ہیں؟''

''جی ہاں ...... بلاشرکتِ غیرے۔'' وہ فخریہ لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ورنہ پارٹنر شپ بزنس میں سو جھمیلے ہوتے ہیں۔''

''میں پارٹنر شپ کا کبھی قائل نہیں رہا۔'' اس نے قطعی لہجے میں کہا۔

میں نے پوچھا۔ ''یہاں پر آپ کا بزنس کیسا چل رہا ہے؟''

''اللہ کا شکر ہے۔'' اس نے بتایا۔

''فیضان صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پچھلے دنوں میرے سننے میں آیا تھا کہ آپ اپنا جما جمایا بزنس فروخت کر کے بیرونِ ملک منتقل ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ غالباً آپ کا امریکہ جانے کا پروگرام تھا؟''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''آپ کو یہ بات کس نے بتائی ہے؟''

''ذریعے کو چھوڑیں فیضان صاحب!'' میں نے اسے تیز نظر سے گھورا۔ ''میرے سوال کا ہاں یا نہ میں جواب دیں۔''

وہ یک لخت بہت زیادہ گھبرا گیا لیکن جلد ہی سنبھل گیا اور محتاط لہجے میں جواب دیا۔ ''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ نے بالکل غلط سنا ہے۔ لوگوں کو افواہیں اُڑانے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا اور یہ سمجھتے ہوئے کہ اس کے جواب سے میری تسلی نہیں ہوئی ہوگی، اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''آپ خود سوچیں وکیل صاحب! جس شخص کا یہاں پاکستان میں اپنا بزنس جم کر چل رہا ہو وہ کسی اور طرف کا رخ کرنے کے بارے میں کیوں سوچے گا؟''

''آپ بالکل بجا فرماتے ہیں فیضان صاحب!'' میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ ''آپ تو دل پر لے گئے۔ اب بھول بھی جائیں اس بات کو۔ میں نے تو ایسے ہی ایک سوال کر دیا تھا!''

میرے تسلی دلانے کے بعد وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگا۔ میرے استفسار پر وہ اچانک اس طرح بھڑک اٹھا تھا جیسے میں نے اس کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہو۔ حقیقت بھی کچھ ایسی ہی تھی! بہرحال میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''فیضان صاحب! کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ استغاثہ کے گواہ ہیں؟''

''جی ہاں، میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''یعنی آپ میرے مؤکل کے خلاف گواہی دینے کے لئے عدالت میں آئے ہیں؟''

''دیکھیں جناب! میں کسی کے حق میں ہوں اور نہ ہی کسی کے خلاف۔'' وہ وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں یہاں پر سچ بیان کرنے آیا ہوں ...... اور میرا خیال ہے، سب کو یہی کرنا چاہئے۔''

''میں آپ کے خیال سے متفق ہوں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اگر سب لوگ ہمارے ان خیالات سے اتفاق کر لیں تو ملک میں سچ کا بول بالا ہو جائے۔ پھر دیکھیں، پاکستان کس طرح دن دُگنی اور رات چوگنی ترقی کرتا ہے۔''

وہ الجھن بھری آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے کہ وہ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہے، آیا میں اسے بے وقوف بنا رہا ہوں یا پھر واقعی سنجیدہ ہوں! میں نے اسے تذبذب کی اسی کیفیت میں مبتلا رہنے دیا اور اپنا کام جاری رکھتے ہوئے اگلا سوال کیا۔ ''فیضان صاحب! میرے مؤکل کو آپ کب سے جانتے ہیں؟''

''آج پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔'' وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''اس سے پہلے صرف نام ہی نام سنا تھا یا پھر اس کے کارنامے!''

''اوہ!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے ملزم کے کون سے کارناموں کے بارے میں سن رکھا ہے۔ کیا آپ معزز عدالت کو اس بارے میں کچھ بتائیں گے؟''

وہ ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولا۔ ''اس شخص کا سب سے بڑا ''کارنامہ'' تو یہ ہے کہ یہ ایک ایسی لڑکی کے حصول کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا جو کئی مرتبہ بری طرح اسے مسترد کر چکی ہے۔ وہ اس کی صورت دیکھنے کی روادار نہیں بلکہ اگر مناسب الفاظ میں اس کے دلی جذبات کی عکاسی کی جائے تو کہنا مناسب ہوگا وہ لڑکی اس شخص سے نفرت کرتی ہے۔''

میں نے استفسار کیا۔ ''غالباً لڑکی سے آپ کی مراد مقتول کی بیٹی بیلا ہے؟''

''جی ہاں، میں یہی کہنا چاہ رہا ہوں۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''اور یہ ساری معلومات آپ کو بیلا ہی نے فراہم کی ہیں؟'' میں نے کہا۔ ''وہ مسلسل آپ کے لنک میں ہے۔ حالانکہ اسٹوڈیو چھوڑے ہوئے تو کافی عرصہ ہو گیا؟''

''میں آپ کی بات سے جزوی اتفاق کرتا ہوں۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ''بیلا مجھ سے واقعی لنک میں ہے اور زیادہ تر باتیں مجھے اسی کی زبانی پتہ چلی ہیں۔ لیکن یہ کہہ دینا کہ وہ اسٹوڈیو چھوڑ چکی ہے، درست نہیں۔ اس نے اپنے باپ کی وجہ سے چند دنوں تک ادھر کا رخ نہیں کیا تھا لیکن وہ جب بھی گھر سے نکلتی ہے، تھوڑی دیر کے لئے اسٹوڈیو ضرور آتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ باپ کی زندگی میں وہ اس بات کو چھپانے کی کوشش کرتی تھی۔''

پھر تھوڑا توقف کرنے کے بعد وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔

''وکیل صاحب! آپ نے سن رکھا ہوگا جس طرح مچھلی پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی بالکل اسی طرح ایک سچا آرٹسٹ فن کدے سے دور رہ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ بیلا کے اندر آرٹ کے جوہر کا ایک انمول خزانہ چھپا ہوا ہے۔ اسے فن کدے (اسٹوڈیو) سے دور رکھنا سراسر زیادتی ہوگی۔''

میں نے اس کی فلسفیانہ وضاحت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''بیلا اپنے فن کی پیاس بجھانے کے لئے آپ کے اسٹوڈیو تک آ جاتی ہے اور کبھی وہ نہ آ سکے تو آپ بہ نفسِ نفیس اس کے گھر پہنچ جاتے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نن... نہیں۔'' وہ اٹکتے ہوئے بولا۔ ''آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔ میں کبھی کبھار اس کے بنگلے پر چلا جاتا ہوں۔''

''بیلا سے ملنے کے لئے؟'' میں نے یک ٹک اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں..... جی ہاں.....'' وہ گڑبڑا کر بولا۔

''بنگلے پر آپ کسی اور سے تو گپ شپ نہیں کرتے ہوں گے؟''

''بیلا کے والد مقتول حیات اللہ تو ایسے آدمی تھے کہ ان سے چند سیکنڈ سے زیادہ گفتگو ممکن نہیں تھی۔ البتہ جنید اور بیلا کی ممی سے ہیلو ہائے ہو جاتی تھی ... اور ہوتی رہتی ہے۔''

''فیضان صاحب! کیا آپ کو مقتول کے گھریلو ماحول سے آگاہی حاصل تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''میں آپ کا اشارہ سمجھ رہا ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اس گھر کا ماحول دو رنگی تھا۔ مقتول اپنے بیوی بچوں کو جس قسم کی زندگی گزارنے کے لئے مجبور کرتا تھا، میں اس کے خلاف ہوں۔ وہ نارمل انسانوں والی زندگی نہیں۔''

''اور اس سلسلے میں آپ کی ساری ہمدردیاں مقتول کی بیوہ رخسانہ بیگم اور دونوں بچوں کے ساتھ تھیں؟'' میں نے تیکھے لہجے میں استفسار کیا۔

''نیچرل سی بات ہے۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''میں جس شے کا حامی ہوں، میری ساری ہمدردیاں اسی سلسلے میں ہوں گی۔ میں نے بتایا ہے ناں، مقتول اپنے بیوی بچوں کو جس قسم کی زندگی گزارنے کے لئے مجبور کرتا تھا، میں اس کے سخت خلاف ہوں۔ انتہا پسندی ہمیشہ نقصان پہنچاتی ہے۔ لیکن افسوس کہ مقتول کا ذہن جس انداز میں الٹ چکا تھا، اسے سمجھانا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔''

''اسی لئے آپ مقتول کا سامنا کرنے کی بجائے محض اس کی بیوی رخسانہ بیگم کو تسلیاں دیتے رہے کہ وہ فکر نہ کرے..... سب ٹھیک ہو جائے گا؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''یہ میرا حق بنتا تھا۔ آپ اسے میرا فرض بھی کہہ سکتے ہیں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''جن لوگوں سے تعلقات ہوں، ان کی بہتری کے بارے میں سوچنا چاہئے۔''

''کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مقتول سے آپ کے فیملی ٹرمز تھے؟''

''جی ہاں، اس میں شک کی کوئی گنجائش کہاں بنتی ہے۔'' وہ پُر وثوق انداز میں بولا۔ ''میں ان کا خیر خواہ تھا۔ بیلا کے اندر موجود ٹیلنٹ کو اگر زنگ لگ جاتا تو یہ ایک افسوس ناک بات ہوتی۔ میری کوشش تھی کہ وہ گھر سے نکلے اور اپنی فیلڈ میں نمایاں کارنامے انجام دے۔''

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے الٹا گھمانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے صبر و تحمل سے اس کی بات سنی اور کہا۔ ''آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا فیضان

صاحب! میں نے پوچھا تھا کہ آپ کے مقتول کی فیملی کے ساتھ ایسے تعلقات تھے جنہیں ''فیملی ٹرمز'' کہا جائے؟''

''میرا خیال ہے، میں نے آپ کے سوال کا جواب دے دیا ہے۔'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا۔ ''اگر آپ کی سمجھ میں نہیں آیا تو واضح الفاظ میں بتا رہا ہوں۔ میں نے مقتول کی فیملی کے ساتھ ویسے ہی روابط استوار کر رکھے تھے جو عرفِ عام میں فیملی ٹرمز کہلاتے ہیں۔''

''او کے فیضان صاحب!'' میں نے رسانیت سے کہا۔ ''آپ کی بات میری سمجھ میں آ گئی۔ اب آپ بھی میری یہ بات سمجھ لیں کہ فیملی ٹرمز یک طرفہ نہیں ہوتے۔ کیا مقتول یا اس کی فیملی کا کوئی فرد آپ کے گھر بھی اسی بے تکلفی سے جاتا تھا جس طرح آپ بیلا سے ملنے مقتول کے بنگلے پر آتے تھے؟''

''نہیں، ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا۔'' وہ گڑبڑا کر بولا۔ ''ادھر سے کوئی آدمی کبھی میرے گھر نہیں گیا۔''

''کیا کبھی آپ اپنی بیوی یا بچوں کو لے کر مقتول کے گھر آئے تھے؟''

''نہیں، ایسا بھی کبھی نہیں ہوا۔'' وہ الجھ کر رہ گیا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ کی فیملی خصوصاً آپ کی بیوی کو یہ بات معلوم تھی کہ آپ بیلا یا اس کی ممی سے ملنے کی خاطر مقتول کے گھر جاتے رہتے تھے؟''

اس نے جواب دینے سے پہلے امداد طلب نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔ وکیل استغاثہ نے عدالت میں اپنی موجودگی کا یقین دلانے کے لئے کھنکار کر گلا صاف کیا اور چیخ سے مشابہ آواز میں بولا۔

''آبجیکشن یور آنر!'' اس کے انداز میں مصنوعی اور بڑی یتیمانہ جارحیت کی جھلک پائی جاتی تھی۔ ''وکیل صفائی حد سے تجاوز کر رہے ہیں اپنے بے سروپا سوالات سے انہوں نے استغاثہ کے معزز گواہ کو پریشان کر رکھا ہے۔ گواہ اور مقتول کے فیملی ٹرمز کا موجودہ کیس سے کوئی تعلق نہیں۔ فاضل وکیل اس قسم کی طوالانی حرکتوں سے معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کے سوا کچھ نہیں کر رہے۔''

وکیل استغاثہ نے اس مختصر خطاب سے جج اور حاضرین عدالت کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ اس کیس کا استغاثہ زندہ ہے۔ جج نے اس کے آبجیکشن کو بہ غور سنا اور سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''بیگ صاحب! آپ اپنی جرح کو متعلقات تک محدود رکھنے کی کوشش کریں۔''

وکیل استغاثہ نے جج کے اس حکم پر فاتحانہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ اس کے خیال میں جج نے مجھے ڈانٹ پلائی تھی۔ میں نے وکیل استغاثہ کے ارمانوں کا جنازہ نکالتے ہوئے کہا۔

''یور آنر! میں استغاثہ کے معزز گواہ مسٹر فیضان سے جو کچھ بھی پوچھ رہا ہوں اس میں سے کوئی بھی بات اس کیس کے حوالے سے غیر متعلق نہیں۔ اگر وکیل استغاثہ چند منٹ تک صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنے کا وعدہ کریں تو سب کچھ واضح ہو جائے گا۔''

جج نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ جرح جاری رکھیں۔''

میں گواہ فیضان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''فیضان صاحب! آپ نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ آپ کی آسانی کے لئے میں اپنے سوال کو دہرا دیتا ہوں......''

''اس کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔'' وہ چراغ پا ہوتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یاد ہے، آپ نے مجھ سے کیا پوچھا تھا۔ آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ میری بیوی ان معاملات سے واقف نہیں تھی۔ سن لیا آپ نے!''

اس کی برہمی جج سمیت تمام حاضرین عدالت کے لئے چونکنے کا باعث تھی۔ کیونکہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس پر اتنا غصہ دکھلایا جاتا۔ اور کوئی سمجھے نہ سمجھے لیکن میں اس کی برہمی کا سبب بہ خوبی جانتا تھا۔ دراصل اس نے میرے ہاتھ میں چمکتی ہوئی تیز دھار چھری کو دیکھ لیا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ جرح جس رخ پر جا رہی ہے وہاں کسی بھی مقام پر میں اسے کہیں ذبح نہ کر ڈالوں۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''فیضان صاحب! آپ کی فیملی کا کوئی فرد کبھی مقتول کے گھر نہیں گیا۔ مقتول کی فیملی میں سے بھی کبھی کوئی آپ کے گھر نہیں گیا۔ حتیٰ کہ آپ کے گھر والوں کو اس بات کا علم ہی نہیں کہ آپ مقتول کی فیملی کے ساتھ کس قسم کے تعلقات رکھتے تھے۔ کیا ''فیملی ٹرمز'' اسی کو کہا جاتا ہے؟''

''آپ فیملی ٹرمز کو گولی ماریں۔'' وہ پاؤں پٹختے ہوئے بولا۔ ''کوئی اور بات کریں۔''

میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''فیضان صاحب! فیملی ٹرمز کو گولی مارنا بہت مشکل ہے۔ یہ ایسا آسان کام نہیں جیسا حیات اللہ کو گولی مار کر ہلاک کرنا۔ آپ کی مقتول کے گھر میں آمد و رفت محض ''فیملی ٹرمز'' کی رہینِ منت تھی ورنہ ایک ایسا گھر جہاں نامحرموں کا داخلہ ممنوع ہو، آپ کا بلا روک ٹوک وہاں جانا کیا معنی رکھتا ہے؟''

وہ میری وضاحت کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے حیات اللہ کو گولی مارنے

والی کیا بات کی ہے؟ میرا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟''

میں نے اس کی گھبراہٹ کے نتیجے میں پیغام رساں نظر سے جج کی جانب دیکھا۔ جج نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔ میں مطمئن ہوگیا کہ جج نے گواہ کے آتشی ردِ عمل کو اپنی یادداشت میں نوٹ کرلیا تھا۔ میں نے جرح کو ایک نئے زاویے پر ڈالتے ہوئے گواہ سے سوال کیا۔

''کیا وقوعہ کے روز بھی آپ مقتول کے گھر گئے تھے؟''

''جی ہاں، گیا تھا۔'' اس کے انداز سے خفگی جھلکتی تھی۔

''آپ اس روز کب اور کتنے وقت کے لئے وہاں گئے تھے؟'' میں نے استفسار کیا۔

اس نے جواب دیا۔ ''میں کم وبیش رات آٹھ بجے وہاں پہنچا تھا۔ جنید اس وقت گھر میں موجود نہیں تھا۔ میں نے بیلا اور اس کی ممی سے چند باتیں کیں اور واپس آ گیا۔ میرا خیال ہے، میں زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹہ وہاں رکا ہوں گا۔''

''اس دوران میں مقتول تو گھر کے اندر موجود نہیں ہو گا۔ کیونکہ اس سخت گیر شخص کی موجودگی میں آپ کا وہاں قدم بھی رکھنا ممکن نہیں تھا؟'' میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مقتول واقعی گھر میں موجود نہیں تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا، مقتول مغرب کی نماز سے تھوڑا پہلے گھر سے نکل جاتا تھا اور پھر عشا کی نماز کے بعد اس کی واپسی ہوتی تھی۔ سنا ہے دونوں نمازوں کے درمیان کا وقت وہ اپنے کسی دوست نظم الدین کے ساتھ گزارتا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''فیضان صاحب! جس دوران میں آپ مقتول کے گھر میں رہے، کیا ملزم بھی وہاں موجود تھا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں جس وقت وہاں سے رخصت ہو رہا تھا تو میں نے اس کی نیلی موٹر سائیکل بنگلے کے باہر کھڑی دیکھی تھی۔ البتہ بنگلے کے اندر وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔''

''آپ کے بیان کے مطابق، آپ لگ بھگ ساڑھے آٹھ بجے جائے واردات سے رخصت ہو گئے تھے۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے، ملزم ساڑھے آٹھ بجے وہیں آس پاس کہیں موجود تھا؟''

''میں اس سلسلے میں کوئی تصدیق یا تردید نہیں کرسکتا۔'' وہ سادگی سے بولا۔

''آپ یہ تو بتا سکتے ہیں ناں کہ آپ نے مقتول کی بیوہ اور بیٹی سے ایک ساتھ بات چیت کی تھی یا الگ الگ؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔

''الگ الگ۔'' اس نے جواب یا۔ ''پہلے میں نے بیلا سے بات کی اور بعد میں رخسانہ سے میری مختصر بات چیت ہوئی تھی۔''

میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔ ''مسٹر فیضان! ملزم کی چچی رخسانہ آپ کو کیسی لگتی ہے؟''

یہ سوال کرتے ہی میں نے اس کی آنکھوں میں نگاہ گاڑ دی۔ میرے سوال کے تیکھے پن نے فیضان کو بری طرح بوکھلا دیا۔ اس کی بوکھلاہٹ کو وہاں موجود ہر شخص نے محسوس کیا۔ ایک سیدھے سادے سوال پر کسی کا بوکھلا جانا خواہ مخواہ دیکھنے والوں کو شک میں مبتلا کرتا ہے۔ وہاں بھی کچھ اسی قسم کی صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ سب لوگ معنی خیز نگاہوں سے استغاثہ کے گواہ فیضان کو دیکھ رہے تھے۔ وہ اس پچویشن سے اور زیادہ کنفیوز ہو گیا۔ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے تلخی سے بولا۔

''وکیل صاحب! اس قسم کے سوال سے آپ کا مقصد کیا ہے؟''

''مقصد بہت واضح ہے فیضان صاحب!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا ایک شخص سے ملنا جلنا ہے اور ان تعلقات کو آپ فیملی ٹرمز بھی کہتے ہیں۔ میں نے محض اس شخص کے بارے میں آپ کی رائے پوچھی۔ ظاہر ہے، جس شخص کے ساتھ آپ کے فیملی ٹرمز ہوں، وہ آپ کو برا تو نہیں لگتا ہوگا۔ کیا خیال ہے آپ کا؟''

''بہت نیک خیال ہے جناب۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ مقتول کی بیوی رخسانہ بیگم ایک نستعلیق اور با اخلاق خاتون ہیں۔''

''یعنی ان ڈائریکٹ وے میں آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ بیلا کی ممی آپ کو بری نہیں لگتی تھی؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ قطعیت سے بولا۔

''اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ اچھی لگتی ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے اگلا سوال کیا۔ ''فیضان صاحب! کیا یہ درست ہے کہ آپ اپنی بیوی فرزانہ اور دو بچوں عمران اور نبیلہ کے ساتھ گلشن اقبال کے ایک بنگلے میں رہتے ہیں؟''

''جی ہاں، یہ درست ہے۔'' اس نے تائیدی انداز میں کہا۔

''آپ کی بیوی فرزانہ ایک خالص گھریلو عورت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اسے کہیں آنے جانے اور پارٹیاں اٹینڈ کرنے کا کوئی شوق نہیں۔ بس آپ کی خوشی کی خاطر باندھے پکڑے کہیں چلی جاتی ہے؟''

''آپ نے میری فیملی خصوصاً بیوی کے بارے میں لگتا ہے کوئی خفیہ سروے کرایا ہے۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''ویسے اس سروے کے نتائج سے میں انکار نہیں کروں گا۔ فرزانہ ایک پردہ دار اور گھریلو عورت ہے۔''

''جب کہ آپ کے بزنس کی نوعیت اور تقاضے اس کے برعکس ہیں۔'' میں نے اس کی پھنسی ہوئی گردن پر چھری کی دھار رکھتے ہوئے کہا۔ ''جب آپ بڑی بڑی پارٹیوں میں بیوی کے بغیر پہنچتے ہیں یا ایک لپٹی لپٹائی بیوی کے ساتھ پہنچتے ہیں تو آپ کو پارٹی کے پروٹوکول کو دیکھتے ہوئے خاصی خفت اٹھانا پڑتی ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''آپ ایک حقیقت بیان کر رہے ہیں۔'' وہ فرمانبرداری سے بولا۔

میں نے اپنے طریقۂ واردات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ایسے میں اپنے دل میں آپ اس خواہش کو شدت سے ابھرتے ہوئے محسوس کرتے ہیں کہ آپ کے قدم سے قدم ملا کر چلنے والا کوئی ایسا ساتھی ہونا چاہئے جو لگژری پارٹیوں میں آپ کو سبکی سے بچا لے۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اس کی دکھتی رگ کو ٹٹولنے کی کوشش کرتے ہوئے اضافہ کیا۔

''اور یہ آپ کا حق بھی ہے فیضان صاحب! آپ زندگی کے جس شعبے اور معاش کے جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں وہاں حُسن و رعنائی کو چھپا کر رکھنے کی بجائے اجاگر کیا جاتا ہے۔ ماشاء اللہ شوبز کی دنیا تو رنگ و نور کی چمک دمک سے مزین ہوتی ہے۔ اس کی کامیابی کا راز چھپانے میں نہیں، دکھانے میں ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''آپ ...... آپ کا تجزیہ کسی تحقیق یا تفتیش کا محتاج نہیں۔'' وہ ڈپلومیٹک انداز میں بولا۔ ''آپ تو سامنے کی ایک حقیقت بیان کر رہے ہیں۔''

''ایسے میں ...... ایسے میں ...'' میں نے مخصوص الفاظ کو دو مرتبہ پُر اسرار انداز میں دہرا کر ڈرامائی خاموشی اختیار کی اور تھوڑے توقف کے بعد دوبارہ بولنا شروع کیا۔

میرے لمحاتی توقف کے دوران عدالت میں موجود ہر شخص کی نگاہ بڑے بے تاب انداز میں مجھ پر جمی ہوئی تھی۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ پتہ نہیں، میں کون سا انکشاف کرنے والا ہوں۔ میں نے گمبھیر انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''ایسے میں جب آپ کی ملاقات مقتول کی بیوہ رخسانہ بیگم سے ہوئی تو آپ کو اس کے

حالات جان کر سخت افسوس ہوا۔ جنید، بیلا اور رخسانہ صرف ایک شخص یعنی مقتول کی سختیوں اور پابندیوں سے نالاں تھے۔ بیلا سے اگر آپ کو مختصراً اس فیملی کے مصائب کا علم ہوا تو رخسانہ سے مل کر رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔ آپ حیرت زدہ رہ گئے کہ جو لوگ امریکہ میں آزادانہ زندگی گزارتے رہتے تھے، انہیں یہاں پاکستان میں کس قسم کی زندگی سے پالا پڑا تھا۔ صرف ایک شخص کی کایا پلٹ نے اس فیملی کے تین افراد کا سانس لینا دوبھر کر دیا تھا۔ آپ نے یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی کہ مقتول اپنی جگہ پر درست ہے یا غلط۔ بس آپ کو اس فیملی سے گہری ہمدردی ہو گئی ...... اور یہ ایک فطری سی بات ہے۔''

آخری جملہ میں نے اس کے حسب منشا ادا کیا تھا، وہ جلدی سے بولا۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''میں ہمیشہ ٹھیک ہی کہتا ہوں فیضان صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گھسائی کا عمل جاری رکھا۔ ''خاص طور پر مقتول کی بیوہ کی بے بسی نے آپ کو حد درجہ متاثر کیا۔ آپ اس ''مظلوم'' عورت کے لئے اپنے دل میں بے پناہ ہمدردی محسوس کرنے لگے۔ آپ نے فیصلہ کر لیا کہ رخسانہ کو اس عذاب سے چھٹکارا دلائیں گے۔ اگر رخسانہ اس ماحول سے نکل جاتی تو لامحالہ بیلا اور جنید کو بھی نیا ماحول مل جاتا۔ میں آپ کے جذبات اور خیالات کی بالکل درست ترجمانی کر رہا ہوں ناں؟''

''میں آپ کی باتوں سے انکار نہیں کروں گا۔'' وہ حیرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''لیکن یہ تو بتائیں، آپ کو میرے ان عزائم کی خبر کیسے ہو گئی؟ میں نے اپنے خیالات کو کسی سے کبھی شیئر نہیں کیا۔ کیا آپ کو ٹیلی پیتھی آتی ہے؟''

میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بس یہی سمجھ لیں کہ مجھے ٹیلی پیتھی سے ملتا جلتا کوئی علم آتا ہے۔ یہ تو میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ مجھے آپ کے دل کے معاملات کی خبر کیسے ہو گئی۔ فی الحال اطمینان بخش بات یہ ہے کہ آپ میرے تجزیے سے انکار نہیں کر رہے۔''

وہ متذبذب نظر سے کبھی مجھے اور کبھی جج کو دیکھنے لگا۔ جج اس دوران کئی مرتبہ دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھ چکا تھا۔ اس بات کا میں نے بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں صرف پندرہ منٹ باقی تھے۔ میں نے اپنی جرح کو ٹاپ گیئر میں ڈال دیا، گواہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے میں نے کہا۔

''فیضان صاحب! آپ کو ایک ایسی مظلوم عورت سے ہمدردی ہو گئی تھی جسے آپ ..

قیمت پر ایک عذاب نازک زندگی سے نجات دلا کر راحتیں اور آسانیاں فراہم کرنے کے خواہش مند تھے اور یہ وہی حسین وجمیل عورت تھی جس کے بارے میں آپ کی بیوی کو کسی قسم کا کوئی علم نہیں تھا۔ آپ جیسے جیسے مقتول کی بیوہ کے قریب آتے گئے، آپ کی اس خواہش میں شدت بڑھتی گئی کہ آپ کو بھی ایک ایسے ہی ہم نشین کی ضرورت ہے۔ پھر رفتہ رفتہ ایک نئے زاویے سے آپ کا دل امریکہ پلٹ رخسانہ کی طرف مائل ہونے لگا۔ ان نئے جذبات واحساسات کے ساتھ وہ آپ کو پہلے سے بھی زیادہ محبوس اور مظلوم نظر آنے لگی۔ پہلے آپ نے سوچا، اس عورت کو ایک گھٹن زدہ ماحول سے نکال کر کسی دوسرے فرحت بخش ماحول میں پہنچا دیں گے۔ لیکن پھر آپ کے خیالات میں ایک نئی تبدیلی آئی۔ آپ نے پختہ فیصلہ کر لیا کہ مقتول سے کسی بھی طور نجات دلانے کے بعد آپ رخسانہ سے شادی کر لیں گے۔''

میں نے دھماکا خیز انداز میں اپنی بات کو عارضی توقف دیا تو عدالت میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ جب اس بھنبھناہٹ کی آواز بلند ہونے لگی تو مجبوراً جج کو ''آرڈر ..... آرڈر'' کے مخصوص انداز کا استعمال کر کے جج کے کمرے میں ''امن وامان'' قائم کرنا پڑا۔

میں نے محسوس کیا کہ فیضان کوئی بزدل شخص نہیں تھا۔ وہ اگرچہ نہیں جانتا تھا کہ میں اس کی بے خبری میں کھینچ کر اسے کس تاریک کنوئیں کے دھانے پر لے آیا ہوں مگر اس نے کمال بہادری کا مظاہرہ کیا اور ایک لمحے کے لئے بھی اس کے پایۂ استقامت میں، میں نے کسی قسم کی لرزش محسوس نہیں کی۔ میری بات کے جواب میں اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

''میں اس بات سے انکار نہیں کروں گا کہ جیسا آپ نے بیان کیا، میں نے ویسا سوچا نہیں تھا۔ اگر کسی طور رخسانہ کی مقتول سے جان چھوٹ جاتی تو میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس سے شادی کر لوں گا۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے عجیب سے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ ''عقدِ ثانی کوئی بری بات تو نہیں؟''

میں نے الفاظ کا ہتھوڑا نکالا اور پے در پے اس پر وار کرنا شروع کر دیے۔ ''مسٹر فیضان!'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''عقدِ اول، عقدِ ثانی، عقدِ حتیٰ کہ بیک وقت اگر آپ چار عورتوں کو بھی اپنے عقد میں رکھیں تو یہ کوئی بری بات نہیں۔'' میں نے لمحاتی توقف کیا اور پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''برائی، خرابی، گناہ اور جرم کی بات یہ ہے کہ آپ نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے جو راہ اختیار کی ہے وہ قانون کی نظر میں قابلِ گرفت ہے۔''

''مم ..... میں نے ایسا کیا، کیا ہے؟'' وہ بھونچکا ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔

''آپ نے رخسانہ کو اپنی رسائی میں لانے کے لئے مقتول سے نجات کا جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ آپ کو پھانسی کے پھندے تک لے جائے گا مسٹر فیضان! آپ نے اپنے ریوالور سے گولیاں چلا کر حیات اللہ کو قتل کیا ہے۔''

''آپ بکواس کرتے ہیں۔'' وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔ ''یہ سراسر مجھ پر الزام ہے۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔''

میں نے چڑھائی جاری رکھی اور جارحانہ انداز میں کہا۔ ''مسٹر فیضان! پولیس ابھی تک آلۂ قتل برآمد نہیں کر سکی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے صرف اتنا پتہ چلا ہے کہ مقتول کے جسم میں پیوست ہونے والی گولیاں بتیس بور کے ریوالور سے چلائی گئی ہیں۔ میں نے اپنی تحقیق سے نہ صرف یہ کہ آلۂ قتل کو تلاش کر لیا ہے بلکہ یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ وہ ریوالور کس کی ملکیت ہے۔ مذکورہ ریوالور کو میں نے بڑی حفاظت سے رکھا ہوا ہے کیونکہ اس پر آپ کی انگلیوں کے نشانات بھی موجود ہیں۔ میرا خیال ہے اب اپنے ذاتی لائسنس یافتہ اعشاریہ تین دو کے ریوالور کو دیکھتے ہی پہچان لیں گے۔''

بات ختم کرتے ہی میں نے اپنی مخصوص نشست کی جانب قدم بڑھا دیئے وہیں میز پر میرا بریف کیس رکھا تھا۔ میں نے خاموشی سے بریف کیس کھولا اور اس کے اندر یوں ہاتھ گھمانے لگا جیسے وہاں موجود روالور کو باہر نکالنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ ابھی میرا ہاتھ بریف کیس کے اندر ہی تھا کہ میری سماعت سے گواہ فیضان کی چیختی ہوئی آواز ٹکرائی۔

''مم ..... میں نے اپنا ریوالور ..... رخسانہ کو دیا تھا ..... بلکہ، رخسانہ نے مجھ سے وہ ریوالور لیا تھا۔ میں اپنا ریوالور واپس لینا بھول گیا ..... بعد میں اس سے پوچھا تو اس نے کہا کہ ..... پتہ نہیں، اس نے ریوالور کو کہاں رکھ دیا ہے ..... اگ ..... اگر .....'' اس کی آواز میں وحشت شامل ہوتی چلی گئی۔

''..... اگر اس ریوالور سے حیات اللہ کو قتل کیا گیا ہے تو ..... تو اس پر میری انگلیوں کے نشانات نہیں ہو سکتے ..... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا .....''

میں نے بریف کیس کو بند کر دیا اور گواہ کی جانب طنزیہ نظر سے دیکھا۔

''وہ ..... وہ ریوالور کہاں ہے؟'' وہ حیرت زدہ نظر سے میرے خالی ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا آپ نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا؟''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بعض اوقات سچ اتنے دبیز پردے کے پیچھے چھپ کر بیٹھ جاتا ہے کہ اسے منظرِ عام پر لانے کے لئے انسان کو جھوٹ کا سہارا لینا پڑتا

ہے اور اس حقیقت کا عملی مظاہرہ آپ نے ابھی ابھی دیکھا ہے۔ میرے بریف کیس میں کسی قسم کا کوئی ریوالور موجود نہیں لیکن میری شاطرانہ چال نے آپ کی زبان سے یہ اُگلوا لیا کہ آپ نے اپنا ریوالور مقتول کی بیوہ کو دے رکھا ہے۔''

میں ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔''یور آنر! موجودہ صورتِ حال میں یہ ضروری ہو گیا ہے کہ مقتول کی بیوہ رخسانہ پر نئے سرے سے تحقیق کی جائے۔ جو حقائق استغاثہ کے گواہ مسٹر فیضان کی زبانی سامنے آئے ہیں ان کی روشنی میں معزز عدالت مقتول کی بیوی کے سابق بیان کو حتمی نہیں سمجھ سکتی۔ انصاف کے تقاضے کسی اور جانب اشارہ کر رہے ہیں اور......'' میں نے سانس لینے کے لئے جملہ ادھورا چھوڑا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''......اور انصاف کا تقاضا ہر صورت میں پورا ہونا چاہئے۔ دیٹس آل یور آنر!''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے ایک ہفتے بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

❋❋❋

آئندہ پیشی پر میں نے رخسانہ بیگم کو اپنی جرح کی چکی میں پیس ڈالا۔ اس نے پولیس کو جو بیان دیا تھا اس کے مطابق، حیات اللہ کے قتل میں میرا مؤکل ملوث ہو سکتا تھا۔ رخسانہ ہی کی نشان دہی پر ملزم رضوان کو گرفتار کیا گیا تھا۔ رخسانہ نے یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ فیضان سے تھوڑی دیر پہلے ملزم بنگلے میں آیا تھا۔ فیضان کی آمد پر اس نے ملزم کو چلے جانے کو کہا۔ ملزم اپنی چچی کی بات مانتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔ وہ جاتے ہوئے یہ کہہ گیا تھا کہ جب چچا مسجد سے آئے گا تو وہ دوبارہ آ جائے گا۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل بنگلے کے باہر ہی کھڑی رہنے دی اور خود ادھر اُدھر ہو گیا۔

حیات اللہ کی واپسی پر ملزم دوبارہ بنگلے پر پہنچا اور چچا سے ملنے کا اصرار کیا۔ لیکن رخسانہ نے اسے اپنے چچا سے ملنے نہیں دیا۔ یہ کہہ کر ڈرائنگ روم ہی سے رخصت کر دیا کہ حیات اللہ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ اپنے بیڈ روم میں جا کر سو گیا ہے لہٰذا ملزم کل دن میں کسی وقت آ کر مقتول سے مل لے۔

چچی کی اس وضاحت پر ملزم اپنی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر ان کے بنگلے سے رخصت ہو گیا۔ وہ سادہ دل شخص یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی شاطر چچی اس کے خلاف کون سا منصوبہ بنائے بیٹھی تھی۔ رخسانہ ہی کی نشان دہی پر وقوعے کی رات میرے مؤکل کو اس کے گھر سے

لگ بھگ ساڑھے گیارہ بجے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ پولیس کو بیان دیتے ہوئے رخسانہ نے بتایا تھا کہ اس نے رات نو بجے ملزم کو مقتول کے بیڈ روم میں ملاقات کے لئے بھیج دیا تھا۔ پھر جب ملزم اپنے چچا سے مل کر واپس چلا گیا اور وہ شوہر کے پاس بیڈ روم میں پہنچی تو یہ انکشاف ہوا کہ حیات اللہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا تھا۔ اس کے سینے پر تکیہ رکھ کر ''بے آواز'' فائرنگ کر کے اسے موت کی گہری نیند سلا دیا گیا تھا۔

لیکن بعد میں، میں نے جس طرح فیضان پر کڑی جرح کر کے رخسانہ کو بے نقاب کیا اور رخسانہ کو سوالات کے ذریعے کلین بولڈ کر کے اس کے منہ سے حقیقتِ حال کو اُگلوا لیا اس کے بعد اس کیس کا پانسہ پلٹ گیا۔

آئندہ پیشی پر عدالت نے میرے مؤکل کو رہا کر دیا۔ کیونکہ رخسانہ نے اقبالِ جرم کر لیا تھا۔

رخسانہ نے اپنے شوہر کو موت کے گھاٹ کیوں اتارا، یہ ایک طویل داستان ہے۔ اس میں اس کی نفسیات اور محرومیوں کا زیادہ دخل تھا۔ میں اس کی تفصیل بیان نہیں کروں گا۔ جن قارئین نے اس کہانی کا ابتدائی حصہ پوری توجہ سے پڑھا ہے وہ ہر بات بڑی وضاحت سے سمجھ گئے ہوں گے...... جو نہیں سمجھے اور ان کا ذہن کسی وجہ سے الجھ رہا ہے تو وہ ذرا زحمت کر کے پیچھے جھانک لیں۔

جاتے جاتے یہ ضرور کہوں گا کہ انسان کو ہر صورت میں اعتدال اور میانہ روی کی متوازن راہ اختیار کرنی چاہئے۔ اسی میں بھلائی اور فائدہ پوشیدہ ہے۔ انتہا پسندی زندگی کے کسی بھی شعبے میں ہو، تباہی اور بربادی ہی لاتی ہے۔ خاص طور پر سیاست، تاریخ اور مذہب کے معاملے میں اختیار کی گئی انتہا پسندی تو کئی نسلوں کو زہریلا کر دیتی ہے۔ پھر حیات اللہ اینڈ کمپنی جیسے کردار سامنے آتے ہیں اور حالات کی بازی گری وہ طرفہ تماشا دکھلاتی ہے کہ...... پناہ!

سنگ گراں

شام کے اخبارات کا اپنا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے۔ ان میں شائع ہونے والی خبریں بڑی چٹ پٹی اور مصالحے دار ہوتی ہیں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے، ایسے اخبارات کے مالکان اپنا اکاؤنٹ اور اخبار کی اشاعت کو بڑھانے کے لئے سیدھی سادھی خبروں میں دانستہ مرچ نمک بھر کر قارئین کو بے وقوف بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ایسے اخبارات کے پبلشرز اپنے کاروبار کو چمکانے کے لئے من گھڑت اور جھوٹی خبریں شائع کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ بہرحال، یہ ”پسند اپنی اپنی، خیال اپنا اپنا“ والی بات ہے!

معقولیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر کسی کو ایک ہی لاٹھی سے نہیں ہانکنا چاہئے۔ جس طرح ایک ہاتھ کی تمام انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، بالکل ویسے ہی تمام لوگ بھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ متذکرہ بالا صفات کے حامل اخبارات اور ان کے مالکان یقیناً وجود رکھتے ہیں لیکن اس بات میں بھی کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ شام کے اخبارات میں بھی بعض ایسے ہیں جو اصول پر سودے بازی نہیں کرتے۔ صحافت کی لاج رکھتے ہوئے وہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کے مصداق خبریں شائع کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کی تعداد نسبتاً کم ہے۔

”اخبار، اخبار“ کھیلنے کے آگے بہت سے مواقع آئیں گے۔ لہٰذا اس تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف رخ کرتا ہوں۔

وہ موسم سرما کا ایک سرد ترین دن تھا۔ کراچی میں موسم سرما صرف جھلک دکھانے آتا ہے۔ اس شہر کی عوام کو بتاتا ہے کہ میں بھی ایک موسم ہوں۔ یہاں بسنے والے چونکہ سال کے گیارہ، ساڑھے گیارہ مہینے گرمی میں جلتے ہیں اس لئے بھی چند روزہ موسم سرما انہیں احساس دلائے بنا نہیں رہتا۔ اس روز میں اپنے دفتر سے اٹھنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ میری سیکرٹری نے انٹرکام پر اطلاع دی۔

”سر! ابھی ابھی ایک کلائنٹ آیا ہے۔“

تھوڑی دیر پہلے میں سیکرٹری سے کہہ چکا تھا کہ کاروبار بڑھالو، میں نکلنے ہی والا ہوں۔ فرح کا گھر میرے راستے میں پڑتا تھا اور وہ اکثر و بیشتر میرے ساتھ ہی گاڑی میں بیٹھ جاتی۔ میں اسے ڈراپ کرتے ہوئے آگے نکل جاتا۔

میں نے دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالی۔ اس وقت رات کے نو بجنے والے تھے۔ دس بجے گھر پر ایک دیرینہ شناسا مجھ سے ملنے کے لئے آ رہا تھا۔ میں نے انٹرکام کے ماؤتھ پیس میں فرح سے کہا۔

”جو آ گیا ہے اسے آگے پاس کر دو۔“

”او، کے سر۔“ فرح نے یہ کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

اگلے ہی لمحے متذکرہ کلائنٹ میرے چیمبر میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ کل تین افراد تھے۔ ایک مرد، ایک عورت اور ایک بچی۔ ظاہر ہے، میں نہیں جانتا تھا کہ ان کی آپس میں کیا رشتے داری ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ عورت یا مرد میں سے میرا کلائنٹ کون ثابت ہونے والا تھا۔ بچی اس ذیل میں نہیں آتی تھی۔

میں نے حسب معمول پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا اور اپنی میز کے سامنے بچھی کرسیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بیٹھیں!“

وہ بیٹھ گئے۔ یعنی عورت اور مرد! ان کے بیٹھنے کے انداز میں ایک خاص زاویہ پایا جاتا تھا جس سے مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا کہ وہ بہرحال، میاں بیوی نہیں تھے۔ میں نے بچی کی طرف دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

”آپ بھی بیٹھ جاؤ بیٹا!“

اس بچی کی عمر تین اور چار سال کے درمیان رہی ہو گی۔ وہ عورت والی کرسی کا پشتہ پکڑے خاموش کھڑی تھی۔ میری مشفقانہ پیشکش کے جواب میں عورت نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر خالی کرسی کی جانب گھمایا اور بولی۔

”یہاں بیٹھ جاؤ ارم!“

ارم نامی اس بچی نے چوں کی نہ چراں، بڑی فرمانبرداری سے چڑھ کر کرسی پر بیٹھ گئی اور بچوں کی عمومی نفسیات کے مطابق وہ اپنی دونوں ٹانگوں کو ایک مخصوص انداز میں آگے پیچھے حرکت دینے لگی۔ وہ ایک پُرکشش بچی تھی۔ میں اس پر سے نظر ہٹا کر مرد اور عورت کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”جی، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ میں نے باری باری انہیں دیکھتے ہوئے

کہا۔

''وکیل صاحب! بھابھی پروین ایک مصیبت میں گرفتار ہوگئی ہے۔'' مرد نے عورت کے تعارف کے ساتھ ہی اپنی آمد کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے بتایا۔ ''ہم اسی سلسلے میں آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں۔''

اس شخص کا انداز اگرچہ خاصا مہذب اور شائستہ تھا تاہم میں نے اس کی آمد کے ساتھ ہی اپنے چیمبر میں ایک مخصوص قسم کی بُو بھی محسوس کی تھی۔ جو ظاہر ہے خوشگوار نہیں تھی۔

اس کی عمر چالیس کے قریب تھی۔ وہ مناسب صحت اور درمیانے قد کاٹھ کا مالک تھا۔ چہرے پر اس نے چھوٹی داڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ اس کا حلیہ اور وضع قطع عام سی تھی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ کی تعریف؟''

''میرا نام فاروق ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے عورت کی جانب اشارہ کیا اور کہا۔ ''فاروق صاحب! آپ کی بھابھی پروین کس قسم کی مصیبت میں گرفتار ہیں ... اور میں اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟''

''آپ ایک تجربہ کار وکیل ہیں۔'' وہ توصیفی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اِدھر اُدھر سے آپ کی بہت تعریف سن رکھی ہے۔ جب انسان پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے اور اسے اس عذاب سے نجات پانے کے لئے قانون کی مدد درکار ہوتی ہے تو وہ کسی وکیل ہی کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے کیونکہ عدالت سے انصاف حاصل کرنے کے لئے آپ کا وسیلہ بہت ضروری ہے۔''

میں اس کی مربوط اور معقول باتوں سے خاصا متاثر ہوا۔ تاہم اس کی شخصیت جس ناگوار بُو میں لپٹی محسوس ہورہی تھی اس نے طبیعت کو مکدر بھی کیا مگر میں نے اس سے کوئی استفسار نہ کیا۔

''آپ کی بھابھی صاحبہ سے پولیس کو کیا شکایات پیدا ہوگئی ہیں؟'' میں نے رف پیڈ اپنے سامنے رکھتے ہوئے قلم سنبھال لیا۔ اس کے ساتھ ہی نگاہ اٹھا کر وال کلاک کو بھی دیکھا۔

فاروق نے جواب دیا۔ ''پولیس ان سے نہیں بلکہ ان کے شوہر شاکر سے خفا ہوگئی ہے!''

''اوہ!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''اس کا مطلب ہے آپ کا بھائی

مصیبت میں مبتلا ہے؟''

''شاکر میرا سگا بھائی تو نہیں لیکن ہم دونوں دوست بھائیوں سے زیادہ ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔'' فاروق نے بوجھل آواز میں بتایا۔ ''جب سے پولیس نے شاکر کو گرفتار کیا ہے، بھابی پروین کے ساتھ ہی میں بھی سخت پریشان ہوں۔''

ابھی تک پروین نامی اس عورت نے ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا تھا جبکہ اس معاملے میں سب سے زیادہ متعلق وہی تھی۔ میں نے براہ راست اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''پروین بی بی! پولیس نے آپ کے شوہر کو کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟''

پروین کی عمر کا اندازہ میں نے پینتیس کے قریب قائم کیا۔ وہ فربہ بدن کی مالک ایک سانولی عورت تھی۔ چہرے کے نقوش اگرچہ حُسن کے اعلیٰ معیار پر پورے نہیں اترتے تھے تاہم ان میں ایک تیکھا پن اور مخصوص کشش ضرور پائی جاتی تھی۔

اس نے اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور چند لمحات تک متذبذب رہنے کے بعد بولی۔ ''پولیس نے شاکر کو چوری اور قتل کے الزام میں اٹھایا ہے۔''

''اوہ!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور رف پیڈ پر قلم گھسنے لگا۔

دس سیکنڈ کے توقف کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ ''یہ کب کی بات ہے؟''

اس نے انگلیوں پر دنوں کا شمار کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''چار دن ہوگئے ہیں اس واقعے کو۔''

''یعنی تمہارے شوہر کی گرفتاری بارہ جنوری کو عمل میں آئی تھی۔'' میں نے اس کے بتائے ہوئے حساب کی روشنی میں کہا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ میں نے پوچھا۔ ''تمہارے شوہر پر کیا چرانے اور کس کو قتل کرنے کا الزام ہے؟''

وہ جواب دینے سے پہلے گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ فیصلہ کرنے کی کوشش کررہی ہو کہ اسے کیا بتانا چاہئے اور کیا نہیں۔ تھوڑے تامل اور تفکر کے بعد اس نے کہا۔

''شاکر پر شہر کے معروف کالم نویس سحر بخاری کی بیوی نازنین کے قتل کا الزام عائد کیا گیا ہے۔''

میں حیرت بھری نظر سے پروین کو تکنے لگا۔ سحر بخاری کے نام سے میں بہ خوبی واقف تھا۔ وہ شام کے ایک اخبار میں بڑے دھواں دھار سیاسی کالم لکھتا تھا۔ اخبار کے نام کا یہاں

پر ذکر کرنا مناسب نہیں۔ کسی بھی اخبار کا کالم نویس بہت طاقت ور ہوتا ہے۔ خصوصاً سیاسی کالم لکھنے والا۔ سحر بخاری کی بیوی اگر قتل ہوگئی تھی اور الزام شاکر پر آرہا تھا تو اس کا یہی مطلب تھا، یہ کیس خاصا کانٹے دار ثابت ہوتا۔

میں نے پیڈ پر چند مختصر نوٹس لئے اور پروین کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''چوری کے بارے میں آپ نے کچھ نہیں بتایا؟''

''پولیس کے مطابق، شاکر چوری کی نیت سے سحر بخاری کے بنگلے میں گھسا تھا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے مگر بوجھل لہجے میں بتانے لگی۔ ''اس نے بنگلے میں داخل ہونے کے بعد کسی طرح بیڈ روم تک رسائی حاصل کر لی۔ قیمتی زیورات اور ایک کثیر رقم سیف میں رکھی تھی۔ اس نے اپنی کسی تکنیک کو بروئے کار لا کر مذکورہ سیف کھول لیا لیکن اس کی بدقسمتی کہ وہ طلائی زیورات والے باکس اور نقدی لے کر وہاں سے فرار ہونے ہی والا تھا کہ مقتولہ نازنین کی آنکھ کھل گئی جو اسی بیڈ روم میں سو رہی تھی۔''

وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوئی پھر سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''نازنین نے کسی اجنبی کو اپنے بیڈ روم میں پراسرار حرکات کرتے دیکھا تو خوف کے مارے اس نے چیخنا شروع کر دیا۔ اس کی چیخ پکار پر سحر بخاری بھی بیڈ روم کی طرف لپکا۔ جب وہ بیڈ روم کے دروازے پر پہنچا تو یہ وہی لمحہ تھا جب شاکر افراتفری کے عالم میں بیڈ روم سے باہر نکل رہا تھا۔ پولیس اور سحر بخاری کے مطابق اس نے جھپٹا مار کر شاکر کے ہاتھ سے زیورات والے باکس اور نقد رقم کی گڈیاں چھیننے کی کوشش کی۔ اسے اپنی کوشش میں جزوی کامیابی حاصل ہوئی، یعنی اس جھپٹے نے زیورات والے باکس اس کے ہاتھ سے چھڑا دیئے تاہم نقدی والی گڈیوں کو اس نے مضبوطی سے تھامے رکھا۔ زیورات کے باکس بیڈ روم کے اندر اور باہر جا گرے۔

اس جزوی کامیابی سے سحر بخاری کا حوصلہ بڑھا اور اس نے شاکر کو دبوچنے کے لئے جست لگا دی۔ اس جست کا بڑا بھیانک نتیجہ برآمد ہوا۔ شاکر تو اس کے ہاتھ نہ آسکا تاہم وہ منہ کے بل فرش پر گرا۔ اس دوران صورتِ حال سے بوکھلا کر شاکر نے پلٹ کر عقب میں فائر کر دیا۔ سحر بخاری چونکہ زمین بوس ہو چکا تھا لہٰذا وہ گولی پلک جھپکتے میں بیڈ روم کے اندر پہنچی۔ اس کی راہ میں نازنین، وحشت زدہ انداز میں کھڑی تھی۔ اس مہلک گولی نے اس کی کھوپڑی میں لمحاتی قیام کئے بغیر آگے کی راہ لی۔ فائر چونکہ بہت قریب سے کیا گیا تھا اس لئے گولی کھوپڑی کے آر پار ہوئی تو نازنین وہیں ڈھیر ہوگئی۔ اسے موت کی آغوش میں پناہ

گزین ہونے میں چند سیکنڈ ہی لگے ہوں گے۔''

پروین نے چند توقفات کی مدد سے اپنا بیان مکمل کیا تو میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''یہ تو پولیس اور سحر بخاری کا بیان ہے۔ آپ اپنے شوہر کے بارے میں کیا کہتی ہیں؟''

''میں تو اسے بے گناہ سمجھتی ہوں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔

''یعنی شاکر نے قتل کیا ہے اور نہ ہی چوری؟'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے پورا یقین ہے، شاکر قاتل نہیں ہوسکتا!'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

میں نے استفسار جاری رکھا۔ ''اور چور ؟''

وہ جزبز ہو کر رہ گئی۔ ''چوری اور ہیرا پھیری کی عادت تو ہے اس میں۔''

''یعنی آپ یہ کہنا چاہتی ہیں، آپ کے شوہر نے سحر بخاری کے گھر سے رقم چرائی ہے؟''

اس سے پہلے کہ وہ میرے سوال کے جواب میں کچھ کہتی، فاروق بول اٹھا۔ ''وکیل صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ شاکر چھوٹی موٹی ہیرا پھیریوں میں تو ملوث رہا ہے اور ایک آدھ چوری بھی اس کے ریکارڈ پر موجود ہے لیکن یقین جانیں، اس نے سحر بخاری کی بیوی کو قتل کیا ہے اور نہ ہی اس نے سیف میں سے کوئی رقم چرائی ہے۔'' وہ لمحے بھر کو رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''پتہ نہیں، سحر بخاری اس بے چارے کو کیوں پھانسنا چاہتا ہے؟''

''تم اتنے پُر یقین کیوں ہو کہ تمہارے دوست نے چوری کی ہے اور نہ ہی قتل؟''

''میں شاکر کو اچھی طرح جانتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''وہ اتنا نڈر اور بہادر بھی نہیں ہے!''

میں نے پوچھا۔ ''سحر بخاری اور پولیس والے کتنی رقم کے چوری ہونے کی بات کر رہے ہیں؟''

''ایک لاکھ پچاس ہزار روپے۔'' اس نے دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''یعنی پورے ڈیڑھ لاکھ!''

''اوہ!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''یہ تو واقعی اچھی خاصی رقم ہے!''

''اگر شاکر نے اتنا لمبا ہاتھ مارا ہوتا تو مجھ سے نہ چھپاتا۔'' فاروق نے کہا۔

پروین بولی۔ ''وکیل صاحب! میری درخواست ہے کہ آپ شاکر سے مل لیں۔ وہ آپ کو

اس واقعے کے بارے میں زیادہ تفصیل سے بتا سکے گا۔"

"اس سے تو میں ضرور ملوں گا۔" میں نے کہا۔ "تم دونوں اس معاملے کے حوالے سے مزید جو کچھ جانتے ہو، وہ بتا دو...... لیکن ایک منٹ!"

میں نے دیوار گیر کلاک کی جانب دیکھتے ہوئے انٹرکام کا ریسیور اٹھا لیا۔ اس وقت رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ مجھے آج دس بجے تک گھر پہنچ جانا تھا لیکن کلائنٹ کو بیچ منجدھار کے چھوڑ دینا بھی مجھے گوارا نہ تھا۔ میں نے فرح سے کہا کہ وہ میرے گھر کا نمبر ملا دے۔

تھوڑی دیر بعد میں اپنے گھر میں بات کر رہا تھا۔ میرے جس دیرینہ شناسا کو ملاقات کے لئے آنا تھا وہ ابھی تک گھر نہیں پہنچا تھا۔ میں نے گھر والوں کو بتا دیا کہ مجھے آنے میں آدھا پونا گھنٹہ تاخیر ہو جائے گی۔ ریسیور کریڈل کرنے کے بعد میں فاروق اور پروین کی جانب متوجہ ہو گیا۔

انہوں نے آئندہ آدھے گھنٹے میں باری باری شاکر اور اس واقعے کے بارے میں مجھے بتایا۔ میں نے ان کی گفتگو کے تمام اہم پوائنٹس نوٹ کر لئے۔ اس کیس کی سماعت کے دوران ان نکات کا گاہے بگاہے تذکرہ ہو گا۔ آخر میں پروین نے مجھ سے پوچھا۔

"وکیل صاحب! کیا آپ ابھی شاکر سے ملنے جائیں گے؟"

شاکر کو پولیس نے عدالت میں پیش کر کے سات دن کا ریمانڈ حاصل کر لیا تھا اور وہ اس وقت متعلقہ تھانے کی حوالات میں زیر تفتیش تھا۔ پروین کے سوال کے جواب میں، میں نے بتایا۔

"پولیس تین روز بعد اسے چالان کے ساتھ عدالت میں پیش کرے گی۔ لہٰذا ہمارے پاس ہوم ورک کے لئے کافی وقت ہے۔ فی الحال تو شاکر کی طرف میرا جانا ممکن نہیں البتہ کل کسی وقت میں فرصت نکال کر اس سے ضرور ملاقات کر لوں گا۔"

اس کے بعد ہمارے درمیان فیس وغیرہ کے معاملات طے ہوئے۔ میں نے رقم کی وصولی کے ذیل میں ایک رسید بنا کر پروین کے حوالے کر دی۔

فاروق نے پوچھا۔ "ہم دوبارہ کب آپ کی خدمت میں حاضری دیں؟"

"کیس کی سماعت شروع ہونے سے پہلے ایک مرتبہ تو آپ کو ضرور آنا ہو گا۔" میں نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں کل فون کر کے تمہیں بتا دوں گا کہ تمہارا آنا کب مناسب رہے گا۔"

"ٹھیک ہے وکیل صاحب! میں بڑی شدت سے آپ کے فون کا انتظار کروں گا۔" وہ مصافحے کے لئے میرے انتہائی قریب آ گیا۔

ایک مرتبہ پھر مجھے وہ ناگوار سی بُو محسوس ہوئی لیکن میں نے اپنے چہرے کے تاثرات سے ناپسندیدگی کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور سرسری انداز میں اس سے ہاتھ ملا کر انہیں دفتر سے رخصت کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد جب میں فرح کے ساتھ دفتر والی عمارت سے نکل کر نیچے سڑک پر پہنچا تو فاروق، پروین اور ارم مجھے سڑک کے کنارے دکھائی دیئے۔ شاید وہ کسی ٹیکسی وغیرہ کا انتظار کر رہے تھے۔ مجھ پر نگاہ پڑی تو فاروق نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا۔

میں نے اسے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا اور بریف کیس فرح کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تم گاڑی کے پاس پہنچو۔ میں اس بندے سے ایک ضروری بات کر کے آ رہا ہوں۔"

فرح میرا بریف کیس تھام کر گاڑی کی طرف بڑھ گئی جو وہاں سے پندرہ بیس فٹ کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ فاروق تیز قدموں سے چلتے ہوئے میرے قریب پہنچ گیا۔

میں نے آواز کو دھیما رکھتے ہوئے اس سے استفسار کیا۔

"کیا تم چرس کا دھندا کرتے ہو؟"

وہ اس طرح اچھلا جیسے میں نے اس کے ہاتھ میں بجلی کا ننگا تار پکڑا دیا ہو۔ اس نے چور نظر سے دائیں بائیں دیکھا اور خجل سا ہو کر بولا۔ "نن...... نہیں وکیل صاحب!"

"پھر تمہارے پاس سے چرس کی مخصوص بُو کیوں آ رہی ہے؟"

"وہ جی...... کبھی کبھار ایک آدھ سگریٹ پی لیتا ہوں۔" وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا پھر کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے جلدی سے اضافہ کیا۔ "اللہ نہ کرے، میں کبھی اس دھندے میں لگ جاؤں!"

میں نے قدرے سخت انداز میں کہا۔ "فاروق! کوئی بھی دھندا ہو، لین دین کے اصول پر چلتا ہے یعنی خرید و فروخت۔ تم چرس کے کاروبار میں ففٹی پرسنٹ تو لگے ہی ہوئے ہو۔ ٹھیک ہے، تم یہ نشہ بیچتے نہیں مگر خریدتے تو ہو۔ اگر تم نے یہ روش نہ بدلی تو وہ دن دور نہیں جب تم چرس فروخت بھی کرنے لگو گے۔"

وہ شرمندہ شرمندہ سی نظر سے مجھے دیکھنے لگا پھر خاصے مضبوط لہجے میں بولا۔ "جناب! میں کوشش کروں گا کہ اس علت سے جان چھڑا لوں۔"

میں نے ضروری ہدایات کے بعد اسے رخصت کر دیا۔

چرس ایک عجیب و غریب نشہ ہے۔ نشہ تو کسی بھی شے کا ہو، بالآخر نقصان ہی پہنچاتا ہے۔ دیگر نشہ آور مستعمل اشیاء کی طرح چرس کے بھی بے شمار مضرات ہیں لیکن میں نے اسے عجیب و غریب نشہ اس لئے کہا ہے کہ بعض انتہائی سنجیدہ افراد کو میں نے اس کی تعریف بھی کرتے سنا ہے۔ ان کا مؤقف ہے کہ اگر اسے دو ہفتے، چار ہفتے میں ایک بار استعمال کر لیا جائے اور وہ بھی تمیز کے ساتھ تو یہ نقصان کے بجائے فائدہ پہنچاتی ہے۔ وہ اس ذیل میں چرس کے بعض گفتہ و ناگفتہ فوائد بھی گنواتے ہیں۔ حتیٰ کہ میرے ایک دوست جو لاہور میں اپنا نفسیاتی کلینک کامیابی سے چلا رہے ہیں، وہ بھی چرس کے بعض فوائد کی تصدیق و تائید کرتے ہیں۔ بہرحال قدرت نے کوئی بھی شے خواہ مخواہ پیدا نہیں کی۔ انسان قدرتی اشیاء سے اپنی مرضی کے مطابق دیگر اشیاء تیار کر لیتا ہے۔ جو فائدہ بھی پہنچا سکتی ہیں اور نقصان بھی!

میں اپنی گاڑی میں آ کر بیٹھا اور گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

❊❊❊

آئندہ روز میں ایک مناسب موقع نکال کر متعلقہ تھانے پہنچا اور اس کیس کے ملزم شاکر سے ایک تفصیلی ملاقات کی۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں نے اس تک رسائی حاصل کرنے کے لئے کون سا گر آزمایا۔ اس نوعیت کی مختلف ٹیکنیکس کو میں گاہے گاہے تحریر کرتا رہتا ہوں۔ لگ بھگ ایک گھنٹے کی اس ملاقات میں شاکر سے ڈھیروں باتیں ہوئیں جس سے مجھے اس کیس کو سمجھنے میں بہت مدد ملی۔ میں یہاں پر اس تفصیلی بات چیت کا خلاصہ بیان کرتا ہوں تاکہ آپ بھی پس منظر سے آگاہی حاصل کر لیں۔

اس طوالانی قصے میں سے بعض غیر ضروری امور کو میں نے حذف کر دیا ہے تاکہ آپ بوریت سے بچ جائیں۔

شاکر کی زبانی حاصل ہونے والی معلومات میں سے میں دانستہ چند باتیں فی الحال آپ سے مخفی رکھ رہا ہوں۔ یہ کہانی نویسی کا تقاضا اور مجبوری ہے۔ بہرحال، عدالتی کارروائی کے دوران مناسب مقامات پر گاہے گاہے ان باتوں کا ذکر ہوتا رہے گا۔

شاکر کی رہائش اعظم بستی میں تھی جہاں وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ اس کے دو بچے تھے۔ ارم کا ذکر ہو چکا، موسیٰ ارم سے ڈیڑھ دو سال بڑا تھا۔ شاکر کی خوش قسمتی کہ اسے پروین جیسی سگھڑ اور سمجھ دار بیوی ملی تھی۔

وہ ایک اچھا موٹر مکینک تھا اور کالا پل کے نزدیک واقع ایک ورک شاپ میں ایک

ملازم کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ اگر انسان کے ہاتھ میں ہنر ہو تو وہ بھوکا نہیں مر سکتا۔ شاکر کے گھر میں کبھی فاقوں کی نوبت تو نہیں آئی تاہم یہ گھرانا تنگ دستی کا شکار ضرور رہتا تھا اور اس کا سبب بھی وہ خود ہی تھا۔ وہ جتنا اچھا مکینک تھا، اگر ٹک کر محنت کرتا تو سال دو سال میں اپنا ورک شاپ کھول سکتا تھا مگر مستقل مزاجی سے کام کرنا اس کی عادت میں نہیں تھا لہٰذا تنگ دستی مختلف محرومیوں کا روپ دھار کر اکثر و بیشتر اس کے گھر میں ڈیرا ڈالے رہتی تھی۔

فاروق بھی اسی ورک شاپ میں کام کرتا تھا جس سے شاکر وابستہ تھا۔ میں نے جب شاکر سے اس کی مختلف ہیرا پھیریوں کے حوالے سے استفسار کیا تو تھوڑے سے تامل اور تردد کے بعد اس نے اپنی کوتاہیوں کا اقرار کر لیا۔

میں اسے تازہ ترین کیس کی طرف لے آیا اور پوچھا۔ ''کیا تم چوری ہی کی نیت سے سحر بخاری کے بنگلے میں داخل ہوئے تھے؟''

''میں آپ کو اپنا وکیل تسلیم کر چکا ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اس لئے کوئی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ یہ سچ ہے کہ میں چوری ہی کے خیال سے وہاں گیا تھا۔''

''تمہاری راست گوئی مجھے پسند آئی ہے۔'' میں نے توصیفی نظر سے اسے دیکھا۔

وہ بولا۔ ''اگر میں آپ کو اُلٹی سیدھی معلومات فراہم کروں گا تو پھر آپ کس طرح میرا کیس لڑیں گے؟''

''شاباش! تم ایک معقول اور سمجھ دار آدمی ہو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا پھر پوچھا۔ ''پولیس اور مقتول کے شوہر سحر بخاری کا دعویٰ ہے کہ تم نے اس رات وہاں سے ڈیڑھ لاکھ روپے چوری کئے۔ نازنین تمہاری گولی سے ہلاک ہوئی اور تم اس بنگلے سے فرار ہو گئے۔ پولیس اور سحر بخاری کے اس مؤقف میں کتنی حقیقت ہے؟''

''صرف اتنی کہ میں سحر بخاری کے بنگلے میں چوری کی نیت سے داخل ہوا تھا۔'' وہ مستحکم لہجے میں بولا۔

''یعنی تم نے ڈیڑھ لاکھ روپے چرائے ہیں اور نہ ہی نازنین تمہاری گولی سے ہلاک ہوئی ہے؟''

''گولی!'' اس کا لہجہ کڑوا ہو گیا۔ ''وکیل صاحب! آج تک میں نے کسی گن کو ہاتھ میں نہیں لیا، گولی چلانے کا مرحلہ تو اس کے بعد کا ہے۔''

''وقوعہ کے روز سحر بخاری کے بنگلے میں پیش آنے والے واقعے کے بارے میں تم کیا

کہتے ہو؟'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔ ''یہ تو تم بتا ہی چکے ہو کہ مذکورہ رات تم چوری کی نیت سے وہاں گھسے ضرور تھے؟''

اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور تفصیل بیان کرتے ہوئے بولا۔ ''اُس رات میں بڑی آسانی سے بنگلے میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ پھر اسی آسانی کے ساتھ بیڈ روم تک رسائی بھی حاصل ہوگئی لیکن اس سے پہلے کہ میں کوئی کارروائی ڈالتا، نازنین کی آنکھ کھل گئی اور اس نے مجھے دیکھتے ہی شور مچانا شروع کردیا۔ کہتے ہیں، چور درحقیقت بہت بزدل ہوتا ہے۔ واقعی ٹھیک کہتے ہیں۔ نازنین کی چیخ پکار سنتے ہی میں سمجھ گیا کہ گڑبڑ ہوگئی ہے چنانچہ میں الٹے قدموں اس کے بنگلے سے نکل آیا۔''

''اور وہ ڈیڑھ لاکھ روپے کی چوری ...... نازنین کا قتل......!'' میں نے ٹٹولنے والی نظروں سے اسے دیکھا۔ ''زیورات کے ڈبے وغیرہ وغیرہ ......؟''

وہ تلخی سے بولا۔ ''یہ سب بکواس باتیں ہیں، مجھ پر جھوٹے الزامات عائد کئے جارہے ہیں۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر قدرے بے بسی سے بولا۔ ''سیف تک پہنچنے اور اسے کھولنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ پھر میں زیورات کے ڈبے اور رقم کی گڈیاں کہاں سے نکالتا؟ میرے ساتھ تو کوئلوں کی دلالی والا معاملہ ہوگیا۔ حاصل وصول کچھ نہیں اور ...... ہاتھ منہ سیاہ!''

''اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں!'' میں نے ذومعنی رنگ میں کہا پھر پوچھا۔ ''تمہاری گرفتاری کب اور کیسے عمل میں آئی؟''

''مجھے اگلے روز صبح نو بجے گھر پر سے پولیس نے گرفتار کیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''یعنی بارہ جنوری کی صبح نو بجے؟''

''جی ہاں ......'' اس نے جواب دیا۔

''اس حساب سے واردات گزشتہ رات یعنی گیارہ جنوری کو پیش آئی تھی۔'' میں نے اچانک اس سے ایک اہم سوال کیا۔ ''پولیس کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ پچھلی رات تمہی سحر بخاری کے بنگلے میں نقب لگانے گئے تھے؟''

''انہیں یقیناً سحر بخاری ہی نے بتایا ہوگا!'' وہ سادگی سے بولا۔

''کیا مطلب؟'' میں چونک اٹھا۔ ''کیا سحر بخاری کو یہ بات پتہ تھی کہ اس کے بنگلے میں گھسنے والے چور تم ہو؟''

وہ بڑی رسان سے بولا۔ ''میرا خیال ہے، اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے وہ تمہارا صورت آشنا ہے؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ ''دیکھو شاکر! اگر تم چاہتے ہو کہ میں سنجیدگی سے تمہارے کیس میں ہاتھ ڈالوں تو مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش نہ کرنا۔'' وہ خاموشی سے میرے مزید بولنے کا انتظار کرنے لگا تو میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''تمہاری اور سحر بخاری کی باہمی واقفیت اور شناسائی کس نوعیت کی ہے، مجھے کھل کر بتاؤ؟''

اس نے بتایا کہ سحر بخاری اپنی گاڑی کے سلسلے میں اس ورک شاپ میں آتا رہتا تھا جہاں وہ بطور مکینک کام کرتا تھا۔ اس طرح ان میں تھوڑی بہت راہ و رسم پیدا ہوگئی۔ اسے شناسائی کی کاروباری قسم کہا جاسکتا ہے۔ ایک مرتبہ سحر بخاری کی گاڑی کسی کام کی غرض سے ان کی ورک شاپ آئی ہوئی تھی۔ سحر بخاری کسی وجہ سے گاڑی لینے نہ آسکا اور ورک شاپ کے مالک سے اس نے گاڑی گھر بھجوانے کو کہہ دیا۔ سحر بخاری کا بنگلہ وہاں سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ وہ بلوچ کالونی میں رہتا تھا۔ ورک شاپ کے مالک عبدالشکور نے اس کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ گھر جانے سے پہلے گاڑی کو سحر بخاری کے بنگلے پر چھوڑے گا۔ اس طرح شاکر کو سحر بخاری کا گھر دیکھنے کا موقع مل گیا۔ وہ اس کے عالیشان بنگلے کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا تھا۔

اس تفصیل کے اختتام پر اس نے کہا۔

''وقوعہ کی رات بیڈ روم میں مجھے دیکھ کر نازنین نے چیخنا چلانا شروع کیا تو سحر بخاری لپک کر ادھر آگیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے ہماری آنکھیں چار ہوئی تھیں۔ شک نہیں بلکہ مجھے یقین ہے کہ سحر بخاری نے اسی لمحے میں مجھے بہ خوبی پہچان لیا تھا۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ازاں بعد اس نے پولیس کو میرے بارے میں بتا دیا ہوگا۔ چنانچہ اگلی صبح پولیس والے میرے گھر پر پہنچ گئے۔ بس اتنی سی حقیقت ہے۔ اس کے علاوہ سحر بخاری اور پولیس والے مجھے جن الزامات میں جکڑنے کی کوشش کررہے ہیں ان کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں!''

میں نے پوری توجہ سے ان کی بات سنی۔ وہ میرے تجربے میں آنے والا ایک منفرد نوعیت کا مؤکل تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا تمہیں اپنے حالات کی سنگینی کا اندازہ ہے؟''

''جی ہاں۔ میں محسوس کررہا ہوں کہ مجھ پر بڑا کڑا وقت آن پڑا ہے۔''

''سحر بخاری کے بنگلے میں نقب لگانے کا خیال تمہارے ذہن میں کیونکر پیدا ہوا؟''

"میں کوئی عادی چور نہیں ہوں وکیل صاحب!" وہ آہستگی سے بولا۔ "بس ایک منظر نے میری نیت میں فتور بھر دیا تھا۔"

"کیسا منظر؟" میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔

وہ بتانے لگا۔ "گیارہ جنوری کی شام سحر بخاری اپنی گاڑی میں ہماری ورکشاپ آیا۔ اس وقت اس کے ساتھ ایک خوبصورت عورت بھی موجود تھی جو اس کے پہلو میں پسنجرز سیٹ پر بیٹھی تھی۔ میں اس عورت کے حُسن کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے کھو سا گیا تھا۔ میں نے اتنا حسین چہرہ اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔"

وہ ایک لمحے کے لئے رکا پھر اسی ٹرانس میں بولتا چلا گیا۔ "میں ایک گاڑی کی اوٹ سے اس پُرکشش عورت کو یک ٹک دیکھتا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد، ایک دوسرے مکینک نے جھنجھوڑ کر میری محویت کا خانہ خراب کر دیا۔ میں نے ہڑبڑا کر اس کی طرف دیکھا تو اس نے کہا، شکور صاحب تمہیں بلا رہے ہیں۔ میں لپک کر ورک شاپ کے مالک کے پاس پہنچ گیا۔ شکور صاحب نے میرے دل کی مراد پوری کر دی۔ میں اس وقت سب کچھ بھلا کر صرف اور صرف اسی دلکش عورت کو دیکھنا چاہتا تھا۔ شکور صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں جا کر سحر بخاری کی گاڑی کا فالٹ چیک کروں۔ گاڑی کی ڈگی کے ساتھ کوئی مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ بند ہونے میں نخرے دکھا رہی تھی۔"

اس نے ایک طویل سانس کھینچ کر اپنے پھیپھڑوں کو ہوا سے بھرا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں کشاں کشاں سحر بخاری کی گاڑی کی سمت بڑھا اور ڈگی کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ میں ڈگی کو چیک کرنے کے علاوہ اس عورت کو بھی جھانک رہا تھا۔ اس زاویے سے ان دونوں کی پشت مجھے دکھائی دے رہی تھی۔ اسی تاکا جھانکی کے دوران میں نے وہ منظر دیکھا جس کا میں نے آپ سے ذکر کیا ہے۔ اس منظر نے میرا دماغ خراب کر دیا۔"

وہ خاموش ہو کر دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ میں نے کہا۔

"اب اس دماغ خراب کر دینے والے منظر کی تفصیل بھی بتا دو؟"

اس نے بتایا۔ "میں نے دیکھا، سحر بخاری اپنے گھٹنوں پر ایک سیاہ بریف کیس رکھے اس حسینہ سے رازدارانہ انداز میں باتیں کر رہا تھا۔ پتہ نہیں، اس عورت نے سحر بخاری سے کیا کہا کہ اس نے بڑی احتیاط سے بریف کیس کھول لیا۔ میں تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر فل ٹائم ان کی جانب متوجہ ہو گیا۔ سحر بخاری نے بریف کیس کو پوری طرح نہیں کھولا تھا۔

ادھ کھلے بریف کیس میں سے اس نے ایک تہ شدہ کاغذ نکال کر اس خوب رو عورت کی طرف بڑھا دیا۔ جب وہ مذکورہ کاغذ کو بریف کیس میں سے نکال رہا تھا تو میری نگاہ ایک لمحے میں بریف کیس کے اندر جھانک آئی۔ اس نیم وا بریف کیس میں، میں نے ہیجان خیز نظارہ دیکھا۔" وہ لمحے بھر کو خاموش رہنے کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"بریف کیس نوٹوں کی گڈیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اتنی بڑی رقم کو یک جا دیکھ کر میرے اندر ہلچل مچ گئی۔ مجھے نہیں معلوم تھا، گڈیوں کی صورت میں وہ کل کتنی رقم ہو گی مگر اس وقت بڑی شدت سے میرے دل میں یہ خواہش انگڑائیاں لے رہی تھی کہ کیسے بھی ہو، مجھے یہ دولت حاصل کرنی چاہئے۔"

وہ سانس لینے کے لئے متوقف ہوا تو میں نے کہا۔ "چنانچہ اس دولت کے حصول کے لئے تم سحر بخاری کے بنگلے میں گھس گئے؟"

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔ "وکیل صاحب! دولت کسے اچھی نہیں لگتی۔ مجھے اس وقت نوٹوں کی وہ گڈیاں کچھ زیادہ ہی اچھی لگ رہی تھیں۔ میرے ذہن نے کہا کہ اس بھلی شے کو فوراً حاصل کر لینا چاہئے۔ ذہن کے فیصلے پر فوری عمل ممکن نہیں تھا۔ اتنے افراد کی موجودگی میں اگر میں چھینا جھپٹی کی کوئی کارروائی کرتا تو جلد یا بدیر گرفت میں ضرور آ جاتا۔ پھر سونے پہ سہاگا یہ کہ اسی وقت شکور صاحب نے آواز دے کر مجھے اپنے پاس بلا لیا۔

ڈگی کا مسئلہ میں نے حل کر دیا تھا لہٰذا دوبارہ اس طرف جانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ میں نے شکور صاحب کی بات سنی۔ اس دوران سحر بخاری اپنی گاڑی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ وہ گاڑی جس کی پسنجرز سیٹ پر ایک طرح دار حسینہ براجمان تھی۔ سحر کی بیوی نے تو پتہ نہیں، اپنا نام نازنین کیوں رکھا تھا۔ ایسا نام تو گاڑی میں بیٹھی اس جیسی عورتوں کے لئے ہونا چاہئے۔"

اس کے تبصرے نے بڑے واضح انداز میں مجھے بتا دیا کہ وہ مقتولہ نازنین کا بھی صورت آشنا تھا، اس کے باوجود بھی میں نے پوچھ لیا۔ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے، وہ طرح دار حسینہ سحر بخاری کی بیوی نازنین ہی ہو!"

"نہیں جناب!" وہ قطعیت سے بولا۔ "نازنین ایک دو مرتبہ گاڑی میں بیٹھ کر سحر بخاری کے ساتھ ہمارے ورکشاپ میں آ چکی ہے۔ لہٰذا میں اس دلکش عورت کو نازنین ہرگز نہیں سمجھ سکتا۔"

''اچھا خیر، آگے بتاؤ، کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا۔ ''سحر بخاری کے جانے کے بعد میں مسلسل رقم سے بھرے ہوئے بریف کیس کے بارے میں سوچتا رہا۔ ذہن میں جب ایک ہی سوچ گھر کر کے بیٹھ جائے تو انسان اس کے زیر اثر کوئی قدم اٹھانے پر مجبور ہو ہی جاتا ہے۔ میں بھی اس فیصلے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ کثیر رقم حاصل کرنے کے لئے مجھے سحر بخاری کے بنگلے میں گھس جانا چاہئے۔''

وہ ذرا دیر کو خاموش ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں ان لمحات میں شیطان کے زیر اثر آ گیا تھا۔ میری اپنی سوچ اور عقل پر اس کا قبضہ تھا لیکن اس وقت میں یہ سب کچھ سوچنے کے قابل نہیں تھا۔ شیطان مجھے آسانیاں دکھا کر اس کام کے لئے اُکسا رہا تھا۔ وہ بنگلہ اور اس کی لوکیشن میری دیکھی بھالی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں با آسانی اس رقم کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا ...... پھر میں سحر بخاری کے بنگلے میں چوری کی نیت سے گھس گیا۔''

اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور خاموش ہو گیا۔ ہارا ہوا جواری اور پٹا ہوا قماری اس قسم کی آہیں بھرنے کی بجائے اور کر بھی کیا کر سکتا ہے۔ ویسے حضرتِ انسان بڑی دلچسپ مخلوق ہے۔ یہ اپنی اکثر کوتاہیوں اور حماقتوں کو شیطان کے کھاتے میں ڈال کر بری الذمہ ہو جاتا ہے۔

شیطان کے وجود اور اس کی شیطانیوں سے انکار تو ممکن نہیں لیکن اولادِ آدم کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی الزام تراشیوں پر وہ بھی انگشت بدنداں رہ جاتا ہو گا۔

میں نے ضروری کاغذات اور وکالت نامے پر ملزم شاکر کے دستخط لئے اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''وکیل صاحب! میں نے سب کچھ کھول کر آپ کو بتا دیا ہے۔ مجھے یقین ہے، آپ مجھے اس مصیبت سے نکالنے کی پوری کوشش کریں گے۔''

میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ انشاء اللہ، میں تمہیں انصاف دلانے کے لئے اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کروں گا۔''

پھر میں نے اس سے تشفی آمیز انداز میں مصافحہ کیا اور اسے تھانے کی حوالات میں چھوڑ کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

***

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے عدالت میں چالان پیش کر دیا۔

استغاثہ کی طرف سے میرے مؤکل کے خلاف بڑا مضبوط کیس دائر کیا گیا تھا۔ اس کے مطابق ملزم شاکر ایک بہت ہی خطرناک شخص تھا۔ گیارہ جنوری کی رات وہ چوری کی نیت سے مقتولہ نازنین کے بنگلے میں گھسا۔ یہ بنگلہ اس کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ وہ پہلے بھی یہاں آ چکا تھا لہٰذا وہ بنگلے کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ اسی واقفیت کے باعث اسے معلوم ہو گیا ہو گا کہ قیمتی زیورات اور رقم کہاں رکھی ہے۔ چنانچہ وہ سیدھا اسی بیڈ روم میں پہنچا جس کے اندر موجود سیف (تجوری) میں طلائی زیورات کے ڈبے اور نقدی رکھی تھی۔

استغاثہ نے ملزم کو ایک عادی اور ماہر چور بتاتے ہوئے الزام لگایا تھا کہ اسے سیف کھولنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس نے وہاں رکھی ہوئی ڈیڑھ لاکھ کی کثیر رقم اور طلائی زیورات کے باکس نکال لئے مگر یہاں پر اس کی قسمت ساتھ چھوڑ گئی، حالات کی ایک دشمنانہ کروٹ نے اس کی راہ کھوٹی کر دی۔

مذکورہ بیڈ روم میں مقتولہ نازنین سو رہی تھی۔ جب ملزم اپنا ''کام'' کر کے وہاں سے رخصت ہونے لگا تو اچانک نازنین کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اپنی خواب گاہ میں کسی اجنبی کو دیکھا تو مارے خوف کے اس کی چیخ نکل گئی۔ ملزم جو طلائی زیورات کے باکس اور رقم کی گڈیاں سمیٹ کر وہاں سے فرار ہو رہا تھا، اس دلدوز چیخ نے اسے بوکھلا دیا۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا اس نے مالِ مسروقہ سمیت باہر کی سمت دوڑ لگا دی۔

مقتولہ کی چیخ و پکار سن کر اس کا شوہر سحر بخاری بیڈ روم کی جانب لپکا۔ ان لمحات میں ملزم بیڈ روم سے نکل رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے دونوں کی نگاہیں ملیں اور اسی ایک لمحے میں سحر بخاری نے ملزم کو پہچان لیا۔ ان کے ہاتھوں میں زیورات کے باکس اور رقم کی گڈیاں دیکھ کر اسے صورتِ حال کو سمجھنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا۔ وہ جان گیا، موٹر مکینک اس کے بنگلے میں نقب لگا کر فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ نازنین کی وحشت زدہ چیخ نے اسے مزید تشویش میں مبتلا کر دیا تھا لہٰذا وہ میکانکی انداز میں ملزم پر جھپٹ پڑا۔

سحر بخاری نے ملزم کو پکڑنے کی کوشش کی تھی مگر ملزم اس سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا۔ تاہم اس کوشش میں سحر بخاری کو ادھوری کامیابی حاصل ہو گئی۔ وہ ملزم کو گرفت میں تو نہ لا سکا مگر اس کے جھپٹنے نے کام کر دکھایا۔ زیورات والے باکس اس کے ہاتھ سے نکل کر اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ سحر بخاری نے ملزم کو روکنے اور دبوچنے کی ایک اور کوشش کی۔ وہ کسی چیتے کی

مانند اس پر جھپٹنا۔

یہ جست بیکار ثابت ہوئی۔ ملزم تو اس کے ہاتھ نہ آسکا مگر وہ منہ کے بل فرش پر آ رہا۔ ملزم نے اس صورتِ حال سے بوکھلا کر ریوالور نکال لیا۔ وہ یہ جان گیا تھا کہ سحر بخاری نے اسے پہچان لیا ہے۔ اگر وہ رقم لے کر وہاں سے فرار بھی ہو جاتا تو اس کا بچنا ممکن نہیں تھا۔ سحر بخاری کی نشان دہی پر جلد یا بدیر اسے گرفتار کرلیا جاتا۔ اس کا تحفظ اسی میں تھا کہ وہ سحر بخاری کو قتل کر دے۔ چنانچہ اس نے پلٹ کر سحر بخاری پر فائر کر دیا۔

اس دوران میں جست لگاتے ہوئے سحر بخاری زمین بوس ہو چکا تھا۔ لہٰذا ریوالور سے چلنے والی گولی نے اس کا تو کچھ نہ بگاڑا مگر نازنین کی زندگی کو چاٹ گئی۔ وہ بیڈ روم کے اندر دروازے کے پاس کھڑی یہ چھینا جھپٹی دیکھ رہی تھی۔ ملزم کا نشانہ خطا ہوا تو گولی سحر بخاری کی بجائے نازنین کو جا لگی۔ گولی اس کی کھوپڑی کو توڑتے ہوئے نکل گئی لہٰذا وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گئی۔

استغاثہ کی طویل ترین رپورٹ میرے مؤکل کے بیان سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ ملزم شاکر نے پولیس کو بھی وہی بیان دیا تھا جو حقائق اس نے مجھے بتائے تھے۔ استغاثہ نے سحر بخاری کے تعاون سے کہانی کے آخری باب میں بڑی خطرناک رنگ آمیزی کر کے اس کے انجام کو بدل ڈالا تھا۔ اب مجھے صورتِ حال کی حقیقت کو منظرِ عام پر لانا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں ضروری تیاری کر لی تھی۔

اب ذرا پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا ذکر بھی ہو جائے۔ اس رپورٹ کے مطابق مقتولہ نازنین کی موت گیارہ جنوری کی رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ موت کا سبب وہ گولی بنی تھی جو اس کی کھوپڑی میں عقب سے گھس کر پیشانی سے باہر نکل گئی تھی۔ گولی لگنے اور اسے موت کی آغوش میں جانے کے درمیان چند سیکنڈ کا فاصلہ حائل تھا یعنی اس کی موت فوراً ہی واقع ہو گئی تھی۔

جج کی آمد سے پہلے میں نے استغاثہ، پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور دیگر ضروری کاغذات کی کاپیاں حاصل کر لیں جن میں فنگر پرنٹس کی رپورٹ بھی شامل تھی۔ اس روز میں ذرا جلدی عدالت میں پہنچ گیا تھا لہٰذا مجھے ان کاغذات کے مطالعے کے لئے اچھا خاصا وقت مل گیا۔

جج کرسی انصاف پر آ کر بیٹھا تو میں نے اپنے وکالت نامے کے ساتھ ہی ملزم کی درخواست ضمانت بھی پیش کر دی۔ قتل کے ملزم کی ضمانت بڑی مشکل سے ہوتی ہے۔ اگر

استغاثہ انتہائی بوگس اور کمزور ہو تو دوسری بات ہے۔ میرے مؤکل کے خلاف بڑا مضبوط کیس بنایا گیا تھا چنانچہ مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

جج نے آئندہ پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔ ملزم شاکر کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا۔

اس کارروائی نے ملزم کی بیوی پروین کو خاصا افسردہ کر دیا۔ میں عدالت کے کمرے سے باہر نکلا تو وہ میرے قریب آ گئی۔ حسب معمول فاروق بھی اس کے ساتھ تھا۔ تاہم ارم کو آج وہ گھر پر چھوڑ آئی تھی۔

''وکیل صاحب! آپ نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔'' وہ شاکی لہجے میں بولی۔

''کیا کیس ختم ہو گیا ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے نرم لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''پروین بی بی! آج اس کیس کا پہلا دن تھا یعنی میرا کام آج سے شروع ہوا تھا اور آپ پہلے ہی مرحلے پر اتنی مایوس ہو گئی ہیں۔ میں اس کیس میں کیا کرتا ہوں، یہ تو آگے چل کر پتہ چلے گا۔''

''بھابی! آپ حوصلہ رکھیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' فاروق نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''بیگ صاحب ماشاء اللہ بہت تجربہ کار وکیل ہیں۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ یہ شاکر کا کیس لڑنے پر تیار ہو گئے۔ شاکر بے گناہ ہے۔ آپ فکر نہ کریں، انشاء اللہ وہ بہت جلد بری ہو جائے گا۔''

فاروق آج خاصا چمکا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میری طرف آنے کے لئے، لگتا تھا وہ گھس گھس کر نہایا ہے۔ لباس بھی اس نے اُجلا پہن رکھا تھا۔ اس نے کوشش کی تھی کہ میں کوئی ناگوار بُو محسوس نہ کروں۔

واقعی آج مجھے اس کے قرب سے وہ مخصوص ناگوار بُو محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن چونکہ اس کی شخصیت کے حوالے سے مذکورہ بُو میری یادداشت میں محفوظ ہو چکی تھی لہٰذا کچھ کچھ احساس بہرحال مجھے ہو رہا تھا۔ یہ میرے احساسات کا عین فطری ردِعمل تھا۔

پروین نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وکیل صاحب! وہ لوگ شاکر کو اپنے ساتھ جیل لے گئے ہیں۔ وہاں تو اس پر بہت زیادہ ظلم کیا جائے گا!''

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ تھانے کی بہ نسبت وہاں آرام سے رہے گا۔ اگر اس کے ساتھ کوئی تھوڑی بہت سختی روا رکھی بھی گئی تو وہ تھانے والے سلوک کے پہاڑ کے

سامنے رائی سے زیادہ اہمیت کی حامل نہیں ہوگی۔''

میری اس تسلی تشفی سے وہ خاصی مطمئن نظر آنے لگی۔

میں گزشتہ چند روز کے دوران سحر بخاری کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل کر چکا تھا۔ ان معلومات کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ فاروق ہی تھا۔ وہ اپنے دیرینہ دوست کی خاطر جی جان سے محنت کر رہا تھا جس کے نتیجے میں سحر بخاری کی زندگی کے کئی پہلو کھل کر میرے سامنے آ گئے تھے۔ وہ شام کے ایک معروف اخبار میں کالم نویسی کے ساتھ ساتھ ٹی وی کے لئے بھی کام کرتا تھا۔ اس کے لکھے ہوئے چھوٹے موٹے دو تین ڈرامے اور دیگر پروگرام ٹیلی کاسٹ ہو چکے تھے۔ اس نے بچوں کے لئے چند دلچسپ کھیل بھی لکھے تھے، جنہیں بے حد مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ گویا وہ شو بزنس اور صحافت سے بیک وقت منسلک تھا۔

ملزم شاکر نے مجھے بتایا تھا کہ وقوعہ کی شام اس نے سحر بخاری کی گاڑی میں ایک حسین و جمیل عورت کو بڑے رازدارانہ انداز میں سحر بخاری سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ مجھے یقین تھا اس عورت کا تعلق بھی شو بزنس ہی سے ہوگا۔ اب میں فاروق کے ذریعے مذکورہ عورت کے بارے میں بھی تفصیلی معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ آئندہ پیشی میں لگ بھگ دس دن کا وقفہ تھا۔ یہ وقت مجھے کیش کرنا تھا۔

میں نے اس سے کہا۔ ''فاروق! آج شام تم میرے دفتر آ جاؤ۔ مجھے تم سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

وہ بے اختیار پروین کی جانب دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ''انہیں ساتھ لانے کی ضرورت نہیں۔''

وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے، میں حاضر ہو جاؤں گا۔''

میں انہیں رخصت کر کے اپنی گاڑی کی سمت بڑھ گیا۔

اس روز حسب وعدہ فاروق دفتر میں مجھ سے ملنے کے لئے آیا۔ میں نے دس منٹ تک اس سے ملاقات کی اور ضروری ہدایات دے کر رخصت کر دیا۔

فاروق خاصا چلتا پرزہ قسم کا شخص ثابت ہوا۔ آئندہ پیشی سے قبل ہی اس نے میری مطلوبہ معلومات حاصل کر لیں۔ ان میں بعض بہت ہی اہم باتیں تھیں جو میرے مؤکل کو بے گناہ ثابت کرنے کا مؤثر ذریعہ ثابت ہو سکتی تھیں۔ ان مفید نکات کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران مناسب مواقع پر ہوگا۔

اگلی پیشی پر عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ اس روز عدالت کے کمرے میں نسبتاً زیادہ رش تھا۔ جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ میرے پڑھائے ہوئے سبق کے مطابق ملزم شاکر نے صحت جرم سے صاف انکار کر دیا۔

اس کے بعد ملزم کا حلفیہ بیان عدالت کے ریکارڈ پر لایا گیا۔ اس بیان میں وہ تمام باتیں شامل تھیں جو میرے مؤکل نے مجھے بتائی تھیں۔ اسی سے ملتا جلتا بیان اس نے پولیس کو بھی دیا تھا۔ ملزم کا بیان ریکارڈ ہو چکا تو وکیل استغاثہ جرح کے لئے اس کے قریب پہنچ گیا۔

اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ملزم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے استفسار کیا۔ ''مسٹر شاکر! کیا تم معزز عدالت کو بتاؤ گے کہ مقتول کے گھر میں کی جانے والی چوری کا نمبر کیا تھا؟''

وکیل استغاثہ نے چھوٹتے ہی بڑا ٹیڑھا سوال کر دیا تھا۔ عدالت کے کمرے میں ملزم کی حیثیت سب سے زیادہ قابل رحم ہوتی ہے۔ حلفیہ بیان کے بعد اسے کچھ کہنے، کوئی اعتراض اٹھانے کا حق نہیں ہوتا۔ اسے وکیل استغاثہ اور دیگر لوگوں کے استفسارات کے جوابات دینا ہوتے ہیں اور وہ بھی نہایت ہی صبر و سکون کے ساتھ۔ اس کا مشتعل ہونا بجائے خود اس کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ ملزم کی حیثیت سے سر جھکائے کٹہرے میں کھڑے رہنا اور نہایت ہی سنجیدگی سے وکیل مخالف کی جرح کا مقابلہ کرنا بالآخر اسے فتح کے قریب لے جاتا ہے کیونکہ دوسرے اینڈ پر اس کا وکیل دھواں دھار انداز میں اسٹروک کھیل رہا ہوتا ہے۔

ملزم شاکر نے میری ہدایات کو ذہن میں رکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میں کوئی عادی چور نہیں ہوں جناب۔ بس یہ غلطی ہو گئی۔''

ملزم کے لئے یہ تسلیم کرنا مفید ثابت ہوتا کہ وہ چوری کی غرض سے سحر بخاری کے بنگلے میں داخل ہوا تھا لیکن مقتول کی آنکھ کھل جانے کے باعث اسے ناکام لوٹنا پڑا۔ چوری والی بات سے انکار ممکن نہیں تھا کیونکہ بنگلے کے بیڈ روم کے دروازے پر اور دیگر اندرونی کئی مقامات پر سے اس کے فنگر پرنٹس حاصل کئے جا چکے تھے۔

وکیل استغاثہ ملزم کا جواب سن کر برہمی سے بولا۔ ''تم شرافت سے اپنے کارناموں کی تعداد بتاؤ گے یا میں تمہارا کچا چٹھا کھول کر رکھ دوں؟''

''آبجیکشن یور آنر!'' میں نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر بہ آواز بلند کہا۔ ''اس وقت عدالت میں جو کیس زیر سماعت ہے اس کے مطابق میرے مؤکل پر ڈیڑھ لاکھ روپے کی چوری اور

نازنین کے قتل کا الزام ہے۔ وکیلِ استغاثہ کو چاہئے کہ وہ اصل موضوع سے اِدھر اُدھر ہونے کی کوشش نہ کریں۔''

جج نے پوری توجہ سے میرا اعتراض سنا اور سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا زیر سماعت کیس کا ملزم کے ماضی سے بھی کوئی تعلق ہے؟''

''بڑا گہرا تعلق ہے جناب عالی!'' وہ ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ''ملزم ایک عادی چور ہے۔ یہ اپنے چہرے کی معصومیت سے لوگوں کو دھوکا دیتا ہے۔''

''اوہ!'' جج نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے ملزم کو کڑی نظر سے گھورا۔

میں نے کہا۔ ''میرے فاضل دوست! کیا آپ ملزم کے ماضی سے پوری طرح آگاہ ہیں؟ آپ کی دعوے دار باتوں سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ملزم چوری کے بعد آپ کے پاس آ کر اپنا اسکور نوٹ کرواتا رہا ہے؟''

وکیلِ استغاثہ میری اس کاری چوٹ پر تلملا کر رہ گیا۔ خفگی آمیز لہجے میں بولا۔ ''اس کے ماضی کے زریں کارناموں کے بہت سے گواہ موجود ہیں۔ موقع آنے پر میں انہیں عدالت میں پیش کر سکتا ہوں۔''

''یہ آپ کا حق ہے۔'' میں نے جلتی پر تیل ڈالتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال مناسب یہی ہوگا کہ آپ اپنی جرح کو سحر بخاری کے بنگلے میں ہونے والی چوری تک محدود رکھیں۔'' پھر میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دیٹس آل یور آنر!''

جج نے وکیل استغاثہ کو چند ضروری ہدایات سے سرفراز فرمایا۔ وہ ناپسندیدہ نگاہ سے میری طرف دیکھنے کے بعد ملزم کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''مسٹر شاکر!'' اس نے ملزم کو مخاطب کرتے ہوئے سخت لہجے میں دریافت کیا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ تم عبدالشکور نامی ایک شخص کی ورک شاپ میں بطور مکینک کام کرتے ہو؟''

اس سوال کا جواب دینے میں کوئی قباحت نہیں تھی لہٰذا ملزم نے نہایت ہی سادگی سے کہہ دیا۔ ''ہاں، یہ درست ہے۔''

''کچھ عرصہ پہلے ورک شاپ میں سے عبدالشکور کے ڈیڑھ ہزار روپے غائب ہو گئے تھے۔'' وکیل استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ''تحقیق اور تفتیش کے بعد یہ ثابت ہوا تھا کہ مذکورہ رقم تم نے چرائی تھی۔''

''ہاں، یہ کوتاہی مجھ سے ہوئی تھی۔'' ملزم نے جواب دیا۔

جج کی تنبیہ کے باوجود بھی وکیلِ استغاثہ اپنی حرکت سے باز نہ آیا تو مجھے دوبارہ مداخلت

کرنا پڑی۔ میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے احتجاجی لہجے میں کہا۔

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی! یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے اس وقت معزز عدالت میں ماضی میں عبدالشکور کے چوری ہونے والے ڈیڑھ ہزار روپے کے کیس کی سماعت ہو رہی ہے؟''

میرا اٹھایا ہوا اعتراض بڑا جان دار تھا۔ جج نے ناگواری سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا اور تاکیدی لہجے میں کہا۔ ''وکیل صاحب! آپ اپنی جرح کو زیر سماعت کیس تک محدود رکھنے کی کوشش کریں۔''

وکیل استغاثہ نے سر جھکا کر یہ ظاہر کیا کہ آئندہ وہ جج کی ہدایت کو یاد رکھے گا۔ پھر وہ زیادہ جارحانہ انداز میں اکیوزڈ باکس کی طرف مڑ گیا۔ وہ چند لمحات تک معاندانہ نظر سے ملزم کو گھورتا رہا پھر کڑے لہجے میں اس سے استفسار کیا۔

''مسٹر شاکر! کیا تم تسلیم کرتے ہو کہ مقتولہ تمہارے لئے اجنبی نہیں تھی؟''

''جی، میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں مقتولہ اور اس کے شوہر سحر بخاری کا صورت آشنا ہوں۔'' ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''تم چوری والی رات سے پہلے بھی ان کے بنگلے پر جاتے رہے ہو نا؟''

''مجھے صرف ایک مرتبہ ان کے بنگلے پر جانے کا اتفاق ہوا تھا۔''

''اتفاق یا سازش؟'' وکیل استغاثہ نے اسے تیز نظر سے گھورا۔

ملزم نے الجھن زدہ نظر سے میری طرف دیکھا اور وکیل استغاثہ سے کہا۔ ''میں سمجھا نہیں!''

وکیل استغاثہ نے کہا۔ ''میں نے اپنے سوال میں صرف دو اہم الفاظ استعمال کئے ہیں یعنی ''اتفاق'' اور ''سازش'' ..... یہ دونوں الفاظ اتنے مشکل نہیں ہیں کہ تمہاری سمجھ میں نہ آ سکیں۔'' وہ ایک لمحے کو رکا پھر ڈرامائی انداز میں دہرانے لگا۔

''اتفاق یا سازش..... اتفاق یا سازش.....؟''

''میں بتا چکا ہوں کہ ایک اتفاق مجھے وہاں لے گیا تھا۔'' ملزم نے برہمی سے جواب دیا۔ ''اس میں سازش کا کون سا پہلو نکلتا ہے؟''

''اگر کسی سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے تحت اتفاق پیدا کیا جائے تو اسے سازش ہی کہا جائے گا مسٹر شاکر!'' وکیل استغاثہ نے معنی خیز نظر سے ملزم کو گھورا۔ ''کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

"آپ درست فرما رہے ہیں اور آپ غلط کہہ رہے ہیں۔"

ملزم شاکر بڑی ثابت قدمی سے وکیلِ استغاثہ کی جرح کے سامنے ڈٹا ہوا تھا۔ اس کے تلخی بھرے ذومعنی جواب نے وکیلِ استغاثہ کو سلگا دیا۔ تیز لہجے میں اس نے استفسار کیا۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"میں نے نہایت ہی سادہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔" ملزم نے وکیلِ استغاثہ کی ایک چوٹ کا بدلہ لیتے ہوئے کہا۔ "میرے الفاظ اتنے مشکل نہیں ہیں کہ آپ کی سمجھ میں نہ آ سکیں۔"

شاکر کی اس کراؤنڈنگ اور میچنگ سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اعلیٰ درجے کا مکینک تھا۔ وکیلِ استغاثہ اس کے لگائے ہوئے چرکے پر تلملا کر رہ گیا۔ اس سے قبل کہ وہ کوئی سخت بات کرتا، جج نے براہِ راست ملزم کو مخاطب کیا۔

"مسٹر شاکر! تمہاری بات میں گہرا تضاد پایا جاتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص ایک وقت میں کسی ایک سلسلے میں غلط بھی کہہ رہا ہو اور درست بھی؟"

مجھے ملزم شاکر کی جرأت پر خاصی حیرت ہوئی۔ وہ جج کی جانب دیکھتے ہوئے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "جنابِ عالی! وکیلِ استغاثہ بہت پہنچے ہوئے قانون دان ہیں۔ ان کے لئے سب کچھ ممکن ہے۔"

جج نے بھنویں سکیڑ کر ملزم کو دیکھا۔ تاہم ڈانٹ پلانے کی بجائے اس نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔ "تم اپنی بات کو کس طرح ثابت کرو گے؟"

"بہت آسانی سے جنابِ عالی!" میرے مؤکل نے پُر اعتماد انداز میں کہا۔ "میں نے وکیلِ استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں عرض کیا تھا کہ آپ درست فرما رہے ہیں۔ میرا یہ بیان اس ذیل میں تھا کہ اگر کسی منصوبہ بندی کے ذریعے کوئی اتفاق پیدا کر لیا جائے تو وہ سوچی سمجھی سازش کہلائے گا۔" وہ لمحہ بھر کو سانس لینے کی غرض سے متوقف ہوا پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"میں نے چونکہ کسی قسم کی پلاننگ کر کے کوئی اتفاق پیدا نہیں کیا۔ لہٰذا وکیل استغاثہ کی بات باطل ہو جائے گی یعنی یہ جو کچھ بھی فرما رہے ہیں وہ غلط ہو گا۔"

جج اس مدلل وضاحت کو سننے کے بعد معنی خیز انداز میں سر ہلانے لگا۔

وکیلِ استغاثہ چیخ سے مشابہ آواز میں بولا۔ "میں ثابت کر سکتا ہوں کہ تم نے مقتولہ کے گھر تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ایک مخصوص پلاننگ کے تحت راہ نکالی تھی۔"

"آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں وکیل صاحب؟" جج حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

جج نے وکیلِ استغاثہ سے یہ سوال اس انداز میں کیا جیسے کہہ رہا ہو، ثابت کر کے دکھاؤ!

وکیل استغاثہ نے نفرت انگیز انداز میں ملزم پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالی اور روئے سخن جج کی جانب موڑ لیا۔ پھر وہ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔

"جناب عالی! ملزم نہایت ہی مکار اور چالباز شخص ہے۔ اس نے مقتولہ کے گھر تک رسائی حاصل کرنے کے لئے بڑی ہوشیاری سے منصوبہ بندی کی تھی۔ وقوعہ سے کچھ عرصہ قبل وہ مقتولہ کے بنگلے کا جائزہ لینے کے لئے ایک بہانے کے کندھوں پر سوار ہو کر وہاں پہنچا تھا۔ یہ اس کے منصوبے کا پہلا حصہ تھا۔"

"لیکن ملزم اس الزام کی سختی سے تردید کر چکا ہے!" میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی تیز آواز میں کہا۔ "آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ وہ کسی سازش کے تحت مقتولہ کے بنگلے تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا؟"

"ثبوت ہے میرے پاس۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "جو مناسب موقع پر عدالت میں پیش کر دیا جائے گا۔"

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "تو پھر اس مناسب موقع تک اس سوال کو اٹھا رکھیں!"

جج خاموشی سے عدالتی کارروائی کو دیکھ اور سن رہا تھا۔ گاہے گاہے وہ میز پر اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات پر کچھ نوٹ بھی کرتا جاتا تھا۔ وکیل استغاثہ نے گھما پھرا کر ملزم سے مزید اسی قسم کے چند سوالات کئے پھر جرح کے سلسلے کو موقوف کرتے ہوئے وہ ایک جانب کھڑا ہو گیا۔

اپنی باری پر میں ملزم والے کٹہرے کے قریب چلا گیا پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "مسٹر شاکر! میں تم سے جو بھی سوال کروں اس کا بہت سوچ سمجھ کر جواب دینا۔" وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔ میں نے سوال کیا۔ "وقوعہ کی رات سے پہلے تمہیں مقتولہ کے بنگلے میں جانے کا کتنی مرتبہ اتفاق ہوا ہے؟"

"صرف ایک مرتبہ!" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ "وکیلِ استغاثہ کو تمہارے بیان اور نیت پر شک ہے۔ کیا تم معزز عدالت کے روبرو بتا سکتے ہو کہ تم کیوں اور کس سلسلے میں مقتولہ کے بنگلے پر گئے تھے؟"

"جی ہاں، بالکل بتا سکتا ہوں۔" وہ ترت بولا۔ پھر ایک لمحے کا وقفہ دینے کے بعد ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ "جنابِ عالی!" اس کا روئے سخن منصف کی جانب تھا۔

''وکیل استغاثہ نے ابھی اسی انداز میں مجھ سے سوال کیا تھا۔لہٰذا میں وضاحت کرتا ہوں۔''
وہ سانس لینے کی غرض سے رکا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''جناب عالی! میں مقتولہ کے بنگلے پر کیوں گیا؟ اس کا سیدھا اور آسان جواب تو یہ ہے کہ مجھے ورک شاپ کے مالک شکور صاحب نے وہاں بھیجا تھا، اس لئے گیا۔ اور جہاں تک تعلق اس بات کا ہے کہ میں کس سلسلے میں وہاں گیا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی سحر بخاری کی گاڑی ہماری ورک شاپ میں مرمت کے لئے آئی ہوئی تھی۔ جب گاڑی تیار ہو گئی تو سحر بخاری نے کہا، وہ کسی مصروفیت کے باعث گاڑی لینے نہیں آ سکتا لہٰذا گاڑی کو اس کے بنگلے پر بھیج دیا جائے۔ چنانچہ عبدالشکور صاحب کے حکم پر میں وہ گاڑی لے کر مقتولہ کے بنگلے پر گیا تھا۔''

''یعنی تمہارے وہاں جانے میں کسی سوچی سمجھی سازش یا مخصوص پلاننگ کا کوئی ہاتھ نہیں؟'' میں نے سادہ سے لہجے میں دریافت کیا۔

''قطعی نہیں۔'' وہ چٹانی لہجے میں بولا۔ ''اگر میری بات کا یقین نہ ہو تو آپ شکور صاحب سے اس بارے میں تصدیق کر سکتے ہیں۔''

''شکور صاحب کو یہ زحمت ضرور دی جائے گی۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر جج کی جانب مڑتے ہوئے اضافہ کیا۔

''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مخصوص وقت ختم ہو گیا۔

جج نے چند روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

✲✲✲

آئندہ پیشی پر عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا تو میں نے جج سے درخواست کی۔ ''جناب عالی! اس سے پہلے کہ استغاثہ کے مزید گواہ شہادت کے لئے حاضر ہوں میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں!''

عموماً عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوتا ہے تو سب سے پہلے تفتیشی افسر سے ہی ''مذاکرات'' ہوتے ہیں۔ میں نے پچھلی پیشی پر اس سے سرسری جرح کی تھی۔ کچھ باتیں میں اب پوچھنا چاہتا تھا۔ تفتیشی افسر ہر پیشی پر عدالت کے کمرے میں موجود ہوتا ہے۔ میری ''فرمائش'' پر جج نے کوئی اعتراض نہ کیا۔

میں اگر چاہتا تو گزشتہ پیشی پر ہی تفتیشی افسر کو نمٹا دیتا لیکن بعض اوقات میں دانستہ بھی

اس قسم کے بے ربط ہتھکنڈے آزماتا ہوں۔ اس سے مخالف پارٹی پر بڑے ''مفید'' اثرات برآمد ہوتے ہیں۔ خصوصاً سب سے زیادہ تکلیف وکیل مخالف کو ہوتی ہے۔ وہ میری ایسی حرکتوں سے جھنجلا جاتا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں جھنجلائے ہوئے شخص کو ٹریپ کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ جھنجلاہٹ اعصاب کو کشیدہ اور خیالات کو منتشر کر دیتی ہے۔

میں جج کی اجازت پانے کے بعد انکوائری آفیسر کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس دوران وہ گواہوں والے کٹہرے میں آ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور نہایت ہی سنجیدگی سے کہا۔

''آپ کو دوبارہ زحمت دینے کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ دراصل میں آپ کا نام بھول گیا ہوں۔ آپ نے اپنا نام کیا بتایا .....؟''

''خاور!'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی کھٹک سے بولا۔

''شکریہ!'' میں نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ عہدے کے اعتبار سے ایک سب انسپکٹر ہیں۔ کیا میں آپ کو ''سب انسپکٹر صاحب'' کہہ کر مخاطب کر سکتا ہوں؟''

میری اس لطیف چھیڑ چھاڑ کا زیر سماعت مقدمے سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن اس قسم کا انداز اپنا کر میں بہت سی مفید باتوں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔ میرے آغاز پر ہی وکیل استغاثہ کو تکلیف شروع ہو گئی۔

''آبجیکشن یور آنر!'' اس نے قدرے کمزور مگر احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''میرے فاضل دوست اس طرح کی چھیڑ خانی کے لئے خاصے مشہور ہیں۔ انہیں عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے سے روکا جائے۔''

''چھیڑ خانی!'' میں نے وکیل استغاثہ کے ادا کئے ہوئے ان الفاظ کو دہرایا اور طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اگر انکوائری آفیسر کو میرے اس انداز پر اعتراض ہو تو میں اپنا سوال واپس لینے کو تیار ہوں۔''

جج نے مستفسرانہ نظر سے سب انسپکٹر خاور کو دیکھا۔ وہ جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔
''میں ایک سب انسپکٹر ہوں۔ کوئی بھی مجھے میرے عہدے کے حوالے سے مخاطب کر سکتا ہے۔'' پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ بھی اپنا شوق پورا کر لیں۔''

''شکریہ سب انسپکٹر صاحب!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ خشمگیں نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں اپنے ابتدائی حربے میں صد فی صد کامیاب رہا تھا۔

انکوائری آفیسر اور وکیل استغاثہ کی اکتاہٹ اور بیزاری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''خاور صاحب! آپ کو اس واقعے کی اطلاع کب اور کتنے بجے دی گئی تھی؟''

''گیارہ جنوری کو رات ایک بجے کے قریب۔'' اس نے بتایا۔

''رات ایک بجے کا مطلب ہے بارہ جنوری کے دن کا آغاز ہو چکا تھا؟''

''جی ہاں، حساب کتاب تو یہی بتاتا ہے۔'' وہ سادگی سے بولا۔

''آپ بتائیں، جائے وقوعہ پر آپ کتنے بجے پہنچے تھے؟''

''ڈھائی بجے۔'' اس نے بتایا۔

''اتنی تاخیر کیوں؟'' میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔ ''حالانکہ پولیس اسٹیشن جائے واردات سے زیادہ فاصلے پر بھی نہیں!''

''آدھی رات کے بعد کسی سنگین واردات کی اطلاع ملتی ہے تو جائے وقوعہ کی طرف جانے کے لئے ہمیں کوئی تیاری وغیرہ بھی کرنا ہوتی ہے۔ لہٰذا بعض اوقات دیر ہو جاتی ہے۔'' وہ اپنی کوتاہی کا احمقانہ جواز پیش کرتے ہوئے بولا۔

''خیر، میں آپ سے ''تیاری'' کی تفصیل نہیں پوچھوں گا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''کیونکہ یہ دو طرفہ معاملہ ہے۔''

میں نے آخری جملہ معنی خیز اور پُراسرار انداز میں ادا کیا تو سب انسپکٹر چونک کر دائیں بائیں دیکھنے لگا پھر اس کی سوالیہ نظر مجھ پر ٹک گئی۔ وہ کچھ پریشان ہو گیا تھا۔ اس کی الجھن خاصی محظوظ کن تھی۔

میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ''خاور صاحب! آپ کے دائیں بائیں کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے جس دو طرفہ گڑبڑ کا ذکر کیا ہے اس سے میری مراد پولیس اور سحر بخاری ہے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ نازنین کی موت گیارہ جنوری کی رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اگر موت کا اوسط وقت ساڑھے گیارہ بجے بھی مقرر کر لیا جائے تو اس وقت سے رات ایک بجے تک پورا ڈیڑھ گھنٹہ بنتا ہے۔''

میں لمحہ بھر کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے پولیس اور سحر بخاری کے درمیان ٹھن گئی تھی۔ وہ ''تاخیر تاخیر'' کھیلنے لگے۔ بالآخر یہ ''مقابلہ'' برابر چھوٹا۔ آپ لوگ بھی ٹھیک ڈیڑھ گھنٹہ دیر سے جائے وقوعہ پر پہنچے تھے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''آپ غلط نہیں کہہ رہے، ایک بجے سے ڈھائی بجے تک ڈیڑھ گھنٹہ ہی بنتا ہے!'' اس نے ایسے گول مول انداز میں جواب دیا کہ اسے کسی بھی خانے میں فٹ کیا جا سکتا تھا۔

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آئی۔ او صاحب! آپ جائے وقوعہ پر پہنچے تو آپ نے وہاں کیا دیکھا؟''

''مقتولہ نازنین کی لاش بیڈ روم... ''

''لاش نہیں نعش!'' میں نے اسے ٹوکا۔ ''لاش حیوان کی ہوتی ہے۔ انسان کی ڈیڈ باڈی کے لئے مناسب لفظ نعش ہے۔''

اس نے گھور کر ناپسندیدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میری یہ مداخلت اسے سخت ناگوار گزری تھی تاہم اس نے اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''مقتولہ کی لاش ...... یعنی کہ نعش بیڈ روم کے اندر پڑی تھی۔ اس کے جسم کا بالائی حصہ خون آلود تھا۔ کھوپڑی میں سے گزرنے والی گولی نے اسے چند سیکنڈ میں موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا اور یہ خون سر ہی میں سے نکل کر جسم کے باقی حصوں تک پہنچا تھا۔''

''کھوپڑی میں سے گزرنے والی گولی!'' میں نے تفتیشی افسر کے کہے ہوئے الفاظ کو پُرسوچ انداز میں دہرایا۔ ''کیا آپ کو یقین ہے کہ ملزم کی چلائی ہوئی گولی مقتولہ کی کھوپڑی کے آر پار ہو گئی تھی؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''جی ہاں، مجھے پکا یقین ہے۔''

''یہ یقین مقتولہ نازنین کی نعش کو دیکھتے ہی قائم ہو گیا تھا یا پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے آپ کی سوچ کو یہ راہ دکھائی ہے؟''

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے تو بعد میں اس امر کی تصدیق کی ہے جب کہ میری تجربہ کار آنکھیں لاش ...... میرا مطلب ہے، نعش کو دیکھتے ہی اس حقیقت تک رسائی حاصل کر چکی تھیں۔''

''ماشاء اللہ! آپ کی آنکھیں بڑی باریک بین ہیں!'' میں نے کھلے الفاظ میں اس کی تعریف کر ڈالی۔

وہ اپنی تعریف سن کر خوش ہو گیا۔ وکیل استغاثہ اس دوران ایک ناقابلِ بیان کرب میں مبتلا رہا۔ اسے اعتراض کا کوئی موقع نہیں مل رہا تھا اس لئے مجبوراً برداشت کر رہا تھا۔ میں اسے یکسر نظر انداز کرتے ہوئے انکوائری آفیسر کے سامنے مصروف رہا۔

''آئی او صاحب!'' میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ نے پوسٹ

مارٹم کی رپورٹ کا توجہ سے مطالعہ کیا ہے؟''

''جی ہاں! میں نے اسے تفصیل سے دیکھا ہے۔'' اس نے میرے بچھائے ہوئے جال میں قدم رکھ دیا۔

میں نے کہا۔ ''مذکورہ رپورٹ میں بڑی وضاحت کے ساتھ اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ ملزم کے ریوالور سے چلنے والی گولی مقتولہ کی کھوپڑی میں عقب سے گھس کر پیشانی سے باہر نکل گئی تھی۔ کیا آپ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے اتفاق کرتے ہیں؟''

''جی ہاں ... جی ہاں!'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ''میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ گولی واقعی مقتولہ کی کھوپڑی میں عقب سے گھسی اور پیشانی پر عین اس مقام سے خارج ہوئی جہاں سے سر کے بال شروع ہوتے ہیں۔''

''پھر آپ اس بات سے بھی اتفاق کریں گے کہ فائر انتہائی قریب سے کیا گیا تھا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے استفسار کیا۔ ''کیونکہ انسانی کھوپڑی کی ہڈی خاصی سخت ہوتی ہے۔ اگر دور سے کسی شخص کے سر پر ریوالور سے فائر کیا جائے تو زیادہ امکان اس بات کا ہوتا ہے کہ گولی کھوپڑی کے اندر ہی پھنس کر رہ جائے گی!''

وہ ایک مرتبہ پھر تائیدی انداز میں سر کو ہلاتے ہوئے بولا۔ ''واقعات وشواہد اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ مجموعی طور پر یہی ظاہر کرتے ہیں کہ قاتل اور مقتولہ کے درمیان بہت ہی کم فاصلہ رہا ہوگا۔''

وہ بے خبری میں رفتہ رفتہ میرے چنگل میں پھنستا چلا جا رہا تھا۔ میں نے غیر محسوس انداز میں اپنے جال کو پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''سب انسپکٹر صاحب! آپ نے جن واقعات وشواہد کا ذکر کیا ہے ان سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مقتولہ نازمین پر عقب سے فائر کیا گیا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

وہ روانی میں بول گیا۔ ''نہیں، آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔''

''لیکن استغاثہ تو اس حقیقت کی نفی کرتا ہے!'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''کک..... کیسے.....؟'' وہ بری طرح الجھ کر رہ گیا۔

''ایسے.....'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''استغاثہ کی رپورٹ میں بڑی وضاحت سے یہ درج ہے کہ جب اچانک مقتولہ کی آنکھ کھلی اور اس نے اپنے بیڈ روم میں کسی اجنبی شخص کو دیکھا تو چیخنا شروع کر دیا۔ اس کے چلانے کی آواز سن کر سحر بخاری لپک

کر بیڈ روم میں پہنچا۔ یہ وہ موقع تھا جب ملزم وہاں سے فرار ہونے کے لئے بیڈ روم سے نکل رہا تھا۔ ملزم نے اپنے ہاتھوں میں طلائی زیورات والے باکس اور رقم کی گڈیاں اٹھا رکھی تھیں۔ ان دونوں کی باہمی مڈبھیڑ اور ہاتھا پائی وغیرہ میں زیورات والے باکس ملزم کے ہاتھ سے نکل کر ادھر ادھر بکھر گئے۔ سحر بخاری ہر شے کی پرواہ کئے بغیر ملزم پر جھپٹ پڑا لیکن ملزم اس کے ہاتھ نہ آیا اور اسی لمحے ملزم نے پلٹ کر سحر بخاری پر فائر کر دیا۔ سحر بخاری اس لپک جھپٹ میں زمین بوس ہو چکا تھا لہٰذا گولی اسے شکار کرنے کی بجائے اسی سیدھ میں بیڈ روم کے اندر پہنچی اور مقتولہ نازمین کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔''

میں سانس لینے کے لئے تھوڑا متوقف ہوا پھر سلسلۂ تنقید وجرح کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمام تر سیٹ اپ ظاہر کرتا ہے کہ مقتولہ فائر کے وقت اپنے بیڈ روم میں کھڑی تھی اور ملزم بیڈ روم سے باہر، مقتولہ سے خاصے فاصلے پر موجود تھا۔ اگر ہم اس فاصلے کو تھوڑی دیر کے لئے نظر انداز کر دیں کہ چلو، ٹھیک ہے کہ گولی کتنے بھی فاصلے سے چلی، بہرحال مقتولہ کی کھوپڑی کے آر پار ہو گئی۔ مگر ایسی صورت میں گولی مقتولہ کے جسم کے سامنے والے حصے میں لگنی چاہئے تھی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟''

اس نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ بہرحال اسے اتنا احساس ضرور ہو گیا تھا کہ کوئی بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ میں نے اس کے تذبذب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''آئی۔ او صاحب! آپ خاموش کیوں ہیں؟''

''آں..... ہو سکتا ہے، مقتولہ کا رخ اس لمحے دوسری جانب ہو۔''

''نہیں ہو سکتا سب انسپکٹر خاور صاحب!'' میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

''کیوں..... کیوں نہیں ہو سکتا؟'' بوکھلاہٹ اور سٹپٹاہٹ میں وہ الٹا مجھ سے پوچھنے لگا۔

اس موقع پر وکیل استغاثہ نے اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ میرے اور آئی۔ او کے درمیان انتہائی سنجیدہ سوالات و جوابات کا سلسلہ چل رہا تھا۔ وہ رنگ میں بھنگ ڈالتے ہوئے با آواز بلند بولا۔

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی! میرے فاضل دوست جرح کو طولانی بنا کر خواہ مخواہ عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر وہ اسی رو میں جاری رہے تو استغاثہ کے گواہوں کو پیش کرنے کی باری کبھی نہیں آئے گی۔''

میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''میرے دوست! تفتیشی افسر استغاثہ کا والی وارث ہوتا ہے۔

استغاثہ کے کسی بھی گواہ سے زیادہ اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ باتیں مجھ سے زیادہ آپ کو معلوم ہونی چاہئے وکیل صاحب!'' میں نے تھوڑا توقف کر کے طنزیہ نظر سے اسے گھورا اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے ابھی تک انکوائری آفیسر سے ایک بھی غیر متعلقہ سوال نہیں کیا۔'' اب میرا روئے سخن جج کی جانب مڑ چکا تھا۔ ''اس موقع پر جب کہ اس کیس کے پوشیدہ گوشے رفتہ رفتہ بے نقاب ہو رہے ہیں، میری کوشش کے راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی کرنا یا میری جرح پر کوئی قدغن لگانا انصاف کے اصولوں کے منافی ہوگا!''

جج نے یکے بعد دیگرے وکیلِ استغاثہ اور انکوائری آفیسر کو دیکھا پھر اثبات میں سر کو جنبش دیتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔''

میرے لئے اتنا سا اشارہ ہی کافی تھا۔ میں تفتیشی افسر کی جانب پلٹ پڑا۔ ''آئی۔ او صاحب! آپ نے تھوڑی دیر پہلے مجھ سے پوچھا تھا...... کیوں نہیں ہوسکتا؟ آپ کے اس ''کیوں'' کا جواب یہ ہے کہ استغاثہ کی رپورٹ اس امر کی نفی کرتی ہے۔''

وہ چونک کر میری جانب دیکھنے لگا۔ میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ ماشاء اللہ! اس کیس کے تفتیشی افسر ہیں۔ ایک طرح سے آپ کا کردار مدعی جیسا ہے۔ استغاثہ کی رپورٹ آپ کی ہی تیار کردہ ہے۔'' میں نے اپنی فائل میں نظر دوڑانے کے لئے لمحاتی توقف کیا پھر مزید کہا۔

''آپ نے معزز عدالت میں جو چالان پیش کیا ہے اس میں واضح طور پر لکھا ہوا ہے ... جب ملزم نے سحر بخاری پر گولی چلائی تو مقتولہ نازنین بیڈروم کے اندر، دروازے کے پاس کھڑی یہ چھینا جھپٹی دیکھ رہی تھی۔ ''دیکھ رہی تھی'' کا صرف ایک ہی مطلب ہوتا ہے آئی۔ او صاحب! اور وہ یہ کہ اس کا رخ سحر بخاری اور ملزم کی جانب تھا۔ ایسی صورت میں ...''

میں نے ڈرامائی انداز میں تھوڑا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ایسی صورت میں گولی مقتولہ کے جسم کے سامنے والے حصے میں لگنا چاہئے تھی۔ پھر وہ کس طرح گھوم کر کھوپڑی کے عقبی حصے میں جا گھسی؟''

میرے اعتراضات میں اتنی جان تھی کہ عدالت میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ لگتا تھا وکیل استغاثہ، تفتیشی افسر سمیت وہاں موجود ہر شخص کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ صرف دو افراد وہاں پورے طمطراق سے حاضر تھے..... میں اور جج!

جج نے تشویش بھری نگاہ سے دیوار گیر کلاک کو دیکھا۔ لامحالہ میری نظر بھی اسی سمت اٹھ گئی۔ عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں پندرہ بیس منٹ باقی رہ گئے تھے۔ اگر تفتیشی افسر سے ''گفتگو'' ادھوری رہ جاتی تو سارا مزہ کنکریلا ہو جاتا۔ استغاثہ کی بعض خامیوں کو میں عدالت کے ریکارڈ پر لا چکا تھا لہٰذا جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''آئی۔ او صاحب! آپ نے جائے وقوعہ پر پہنچ کر ضروری کارروائی کی اور اپنی کوشش سے آلۂ قتل کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اگرچہ استغاثہ میں اس بات کا ذکر موجود ہے لیکن میں پھر بھی آپ کو زحمت دوں گا۔ کیا آپ بتائیں گے کہ آپ کو آلۂ قتل کہاں سے ملا؟''

''مقتولہ کے بنگلے کے باہر دیوار کے ساتھ ساتھ آٹھ فٹ چوڑا اور بنگلے کے عرض کے برابر لمبا ایک چھوٹا سا لان بنا ہوا ہے جس میں گھاس کے علاوہ کناروں پر پھول دار پودے بھی اُگائے گئے ہیں۔'' وہ آلۂ قتل کی بازیابی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں وہیں ایک پودے کی جڑ کے پاس مذکورہ ریوالور پڑا ہوا ملا تھا۔''

''اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے، فرار ہوتے وقت ملزم اسے وہاں پھینک گیا تھا؟''

''جی ہاں، واقعات کے پیش نظر یہی ظاہر ہوتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''آپ نے اس ریوالور کا معائنہ بھی کرایا تھا؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

میں نے پوچھا۔ ''آلۂ قتل کے معائنے کی رپورٹ ظاہر کرتی ہے کہ اسی ریوالور سے چلنے والی ایک گولی سے مقتولہ نازنین کی موت واقع ہوئی ہے لیکن اس ٹیسٹ رپورٹ میں کہیں آلۂ قتل پر سے فنگر پرنٹس اٹھانے کا ذکر نہیں ہے جب کہ بنگلے کے اندرونی حصے میں مختلف مقامات پر خصوصاً بیڈروم کے دروازے پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔''

میں ایک لمحے کو رکا پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا آپ آلۂ قتل پر سے ملزم کے فنگر پرنٹس اٹھانا بھول گئے تھے یا وہاں پر فنگر پرنٹس دستیاب نہیں ہو سکے؟''

''میں نے اس ریوالور پر سے بھی فنگر پرنٹس اٹھانے کی پوری کوشش کی تھی۔'' وہ کمزور سی آواز میں بولا۔ ''لیکن وہاں ایسے کوئی آثار نہیں مل سکے۔''

''کیوں..... اس کی کوئی خاص وجہ؟'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔

''ہوسکتا ہے، بنگلے سے نکلتے وقت اس نے ریوالور کو صاف کر دیا ہو'' اس نے کہا۔

''حالات و واقعات سے تو یہ ممکن نظر نہیں آیا۔'' میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''سحر بخاری

نے ملزم سے نگاہیں چار کرتے ہی اسے پہچان لیا تھا۔ نہ صرف پہچان لیا تھا بلکہ اسے روکنے کی کوشش بھی کی تھی۔ استغاثہ کی رپورٹ میں یہی سب لکھا ہوا ہے۔ لکھا ہوا ہے یا نہیں؟'' میں نے بات ادھوری چھوڑ کر اس سے کڑا استفسار کیا۔

وہ اپنے کئے کو جھٹلا نہیں سکتا تھا لہٰذا تسلیم کرتے ہی بنی۔ اس نے کہا۔ ''جی ہاں، لکھا ہوا ہے۔''

''اگر لکھا ہوا ہے تو اس کا یہی مطلب ہے کہ ایسا ہوا بھی ہوگا۔ اب آپ خواہ مخواہ جھوٹی معلومات فراہم کرنے سے تو رہے۔'' میں نے کٹیلے انداز میں کہا۔

میں توقع کر رہا تھا کہ وہ میرے استفسار کے جواب میں فوراً کہے گا، جناب! وقوعہ کے وقت میں جائے واردات پر موجود تھا اور نہ ہی میں نے اپنی آنکھوں سے یہ قتل ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے استغاثہ کی رپورٹ سحر بخاری کے بیان کی روشنی میں تیار کی ہے...... لیکن اس نے ایسی کوئی حماقت نہیں کی اور خاموش کھڑا رہا۔ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''آئی۔ او صاحب! جرائم پیشہ لوگوں سے نمٹتے ہوئے آپ کو بھی کافی عرصہ ہو گیا ہوگا اور ماشاء اللہ! بقول آپ کے آپ کا مشاہدہ بھی بہت قوی ہے۔ استغاثہ کا موقف ہے کہ ملزم نے سحر بخاری پر محض اس لئے فائر کیا تھا کہ وہ اسے پہچان گیا تھا اور فائر کرتے ہی ملزم بنگلے سے فرار ہو گیا تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ ایسی صورت حال میں ملزم کے پاس اتنی فرصت ہو کہ وہ بنگلے سے نکلتے وقت آلۂ قتل کو صاف کر کے لان کے اندر پھینکتا ہوا چلا جائے۔'' میں ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''کسی بھی قتل کے کیس کو حل کرنے کے لئے دو چیزیں سب سے زیادہ اہم ہوتی ہیں۔ قتل کا محرک اور آلۂ قتل کی بازیابی۔ اس کیس میں استغاثہ نے قتل کا محرک یہ بیان کیا ہے کہ ملزم نے محض اس خوف سے کہ سحر بخاری نے اسے پہچان لیا ہے، اس پر گولی چلا دی۔ اگر اس محرک کو درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر ریوالور کی دستیابی اس سے لگا نہیں کھاتی۔ ان حالات میں تو ملزم پر لازم تھا، وہ آلۂ قتل کو ہر صورت اپنے ساتھ لے کر جائے اور اس کا کوئی ایسا بندوبست کر دے کہ وہ پولیس کے ہتھے نہ چڑھے۔ یہ بات ہضم ہونے والی نہیں کہ ملزم بنگلے سے فرار ہوتے وقت اپنے جرم کے سب سے بڑے سراغ یعنی آلۂ قتل کو بھی جائے وقوعہ پر پھینک کر چلا گیا۔ آپ کیا فرماتے ہیں اس مسئلے کے بارے میں؟''

ان دنوں اچھا خاصا ٹھنڈا موسم تھا لیکن میں نے دیکھا کہ میری جرح کی تپش نے

انکوائری آفیسر کی پیشانی کو عرق آلود کر دیا تھا۔ وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

خاور کی زبان سے انکار یا اقرار سننے کی مجھے ضرورت نہیں تھی۔ دراصل میں وہ تمام اہم نکات درجہ بہ درجہ معزز عدالت کے علم میں لانا چاہتا تھا جو آگے چل کر میرے لئے مفید و معاون ثابت ہوتے اور میں نے جج کے تاثرات سے یہ اندازہ لگا لیا کہ مجھے اس کوشش میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ وقت بہت کم باقی بچا تھا لہٰذا میں نے انکوائری آفیسر کو نمٹانے کا فیصلہ کر لیا۔

''آئی۔ او صاحب! آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔'' میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم آپ کی رپورٹ کے اختتامی حصے کو دیکھتے ہیں۔''

وہ قدرے مطمئن ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ جج اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کو بڑی دلچسپی سے نوٹ کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''آپ نے کس کی نشان دہی پر ملزم کو گرفتار کیا تھا؟''

''ظاہر ہے، سحر بخاری کی نشان دہی پر۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''ملزم کی گرفتاری کتنے بجے عمل میں آئی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''بارہ جنوری نو بجے صبح۔'' اس نے بتایا۔

''آپ نے ملزم کو کہاں سے گرفتار کیا؟''

''اس کے گھر واقع اعظم بستی سے۔''

میں نے کہا۔ ''استغاثہ کے مطابق چوری اور قتل کی یہ واردات گیارہ جنوری کی رات کو گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان پیش آئی۔ آپ لگ بھگ ڈھائی بجے رات جائے وقوعہ پر پہنچ گئے لیکن ملزم کی گرفتاری کے لئے اگلی صبح نو بجے کا انتظار کیوں کیا گیا؟ آپ کو چاہئے تھا کہ راتوں رات ہی ملزم پر ہاتھ ڈال دیتے؟''

''اس کی ایک خاص وجہ تھی۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''سحر بخاری، ملزم کو ورک شاپ کے حوالے سے جانتا تھا اور آدھی رات کے وقت وہ ورک شاپ بند پڑی تھی ہم بے بس ہو کر رہ گئے۔ بہرحال ہم نے اگلی صبح، سورج طلوع ہوتے ہی ورک شاپ پر ڈیرا ڈال دیا اور جیسے ہی ایک بندے نے پونے نو بجے ورک شاپ کھولا، ہم نے اسے پکڑ لیا وہ ملزم اور اس کے گھر کے پتے سے واقف تھا۔ ہم نے اسے ساتھ لیا اور سیدھے اعظم بستی پہنچ گئے۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات آگے بڑھاتے ہوئے افسوس ناک لہجے میں بولا۔

''اس تاخیر کے باعث ہمیں بھی بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ اگر ہم رات ہی میں اسے چھاپ لیتے تو صورتِ حال قدرے مختلف ہوتی۔''

''خیریت ..... آپ کو کون سا نقصان اٹھانا پڑا؟'' میں نے چونک کر اس سے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''ملزم کو اچھا خاصا وقت مل گیا اور اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر اس نے رقم کو کہیں اِدھر اُدھر کر دیا ہے۔ ہزار کوشش کے باوجود بھی ہم مسروقہ رقم برآمد نہیں کر سکے۔''

''ملزم لگ بھگ ایک ہفتہ ریمانڈ پر آپ کی کسٹڈی میں رہا ہے۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ''تفتیش کے دوران آپ نے اس سے رقم کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا؟ ڈیڑھ لاکھ ایک اچھی خاصی رقم ہوتی ہے۔''

اس زمانے میں ڈیڑھ لاکھ روپے کی ایک حیثیت ہوا کرتی تھی۔ خاص طور پر ملزم جیسے موٹر مکینک کے لئے تو یہ ایک کثیر رقم تھی۔ انکوائری آفیسر نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔

''ہم نے اس کی زبان کھلوانے کی اپنی سی کوشش کر کے دیکھ لی۔'' وہ قدرے مایوسی سے بولا۔ ''لیکن یہ بڑا ڈھیٹ ثابت ہوا ہے۔ اس نے ڈیڑھ لاکھ کی چوری کا اقرار نہیں کیا۔''

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''کمال ہے، یہ بات آپ کہہ رہے ہیں۔ ورنہ پولیس کے بارے میں تو آج تک یہی سنتے، دیکھتے اور پڑھتے آئے ہیں کہ ان کی کسٹڈی میں پہنچ کر تو پتھر بھی بولنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔''

وہ کٹہرے میں خاموش کھڑے میرے مؤکل کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ اس سلسلے میں بہت ہی سخت جان ثابت ہوا ہے۔''

''آپ نے جس طرح ''سخت جان'' کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس سے تو یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے ملزم سے اقرار جرم کرانے کے لئے اس پر بہت سختی کی ہوگی۔''

''تفتیش کے دوران تھوڑی بہت سختی تو کرنا ہی پڑتی ہے نا جناب۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''ورنہ شرافت سے کون مجرم اپنا جرم قبول کرتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ بھی تو ہو سکتا ہے ملزم نے مقتولہ کے گھر سے کوئی رقم چرائی ہی نہ ہو؟''

''رقم تو گئی ہے جناب!'' وہ پھنکار سے مشابہہ انداز میں بولا۔

''پھر ممکن ہے، اس نے آلۂ قتل کی طرح وہ رقم بھی فرار ہوتے وقت کہیں پھینک دی ہو۔'' میں نے اس کے چٹکی لیتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ نے بنگلے کے باہر بنے ہوئے مختصر

سے لان میں کسی پھول دار پودے میں اس رقم کو تلاش کرنے کی کوشش کی؟''

''جی، ہم نے وہاں رقم کو تلاش کیا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن ہمیں اس تلاش میں کامیابی نہیں ہو سکی۔''

''کہیں اس نے وہ رقم کسی خفیہ گوشے میں تو نہیں چھپا دی؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ کو پتا پتا، بوٹا بوٹا تلاش کرنا چاہئے تھا۔''

''جناب! وہ ڈیڑھ لاکھ روپے کی رقم گڈیوں کی صورت میں تھی۔ کوئی سوئی نہیں جو ہمیں دکھائی نہ دیتی۔'' وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ ''ملزم نے رقم کو لان میں نہیں چھپایا۔''

میں نے اچانک اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا ملزم نے سحر بخاری پر گولی چلانے کا اقرار کر لیا ہے؟''

''نہیں.....'' وہ سر کو جنبش دیتے ہوئے بولا۔

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میرے مؤکل نے مقتولہ کے بنگلے سے ایک پائی چرانے کا اقرار نہیں کیا اور نہ ہی اس نے فائرنگ کی ذمے داری قبول کی ہے۔ ایسی صورت میں آپ نے عدالت میں جو استغاثہ دائر کیا ہے، اس کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے، کچھ اندازہ ہے آپ کو؟''

انکوائری آفیسر نے فوری طور پر میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں اس کے منہ سے کوئی جواب سننے کا خواہش مند بھی نہیں تھا۔ میں نے ایک خاص مقصد کے تحت اس پر کڑی جرح کی تھی اور میرا وہ مقصد پورا ہو گیا تھا۔ جج پوری توجہ اور دلچسپی سے ان نکات کو نوٹ کرتا جا رہا تھا جو اس کیس کے حوالے سے سامنے آ رہے تھے۔ میں عدالتی کارروائی کو اپنی مرضی کے ٹریک تک لانے میں کامیاب رہا تھا۔

اس سے قبل کہ تفتیشی افسر میرے سوال کے جواب میں کوئی معقول یا نامعقول جواز پیش کرتا، عدالت کا مخصوص وقت ختم ہو گیا۔ جج نے اگلی پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔ آئندہ پیشی دس روز بعد تھی۔

میرے مؤکل کی بیوی پروین جو کیس کی ابتداء میں نا امید اور مایوس نظر آ رہی تھی، اب اس کی ذہنی کیفیت میں نمایاں اور مثبت تبدیلی دیکھنے میں آ رہی تھی۔ وہ فاروق کے ساتھ میرے دفتر بھی آئی۔ میں نے تسلی اور حوصلہ دلانے والی باتوں کے بعد اسے مطمئن مطمئن رخصت کر دیا۔

ان دس روز میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔

***

آئندہ پیشی پر استغاثہ کی طرف سے تین گواہ عدالت میں پیش ہوئے۔ میں ان کے بیانات اور ازاں بعد ان پر ہونے والی جرح کا احوال آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

سب سے پہلے محمد لطیف نامی ایک شخص گواہی دینے کے لئے کٹہرے میں آیا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کروا دیا۔ محمد لطیف کی عمر پچپن کے قریب تھی۔ صحت اچھی، سر کے بال آدھے سے زیادہ ندارد اور رنگت گہری سانولی۔ اس نے آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا لیکن چشمے کے اندر سے اس کی آنکھوں کا عیب واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ وہ بہ قول شخصے، بہ یک وقت مشرق و مغرب میں دیکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ لطیف کو سحر بخاری کے سامنے والے بنگلے میں قیام پذیری کا اعزاز حاصل تھا۔

وکیل استغاثہ جرح کے لئے اس کے کٹہرے کے قریب پہنچ گیا۔ اس کی جانب دیکھتے ہوئے وکیل استغاثہ نے پہلا سوال کیا۔

''لطیف صاحب! آپ مقتولہ کے سامنے والے بنگلے میں رہتے ہیں اور وقوعہ کے روز آپ اپنے گھر کے لان میں ٹہل رہے تھے۔ اس رات آپ نے مقتولہ کے بنگلے میں فائرنگ کی آواز سنی تھی؟''

''فائرنگ نہیں، فائر کی آواز!'' وہ اپنی دانست میں تصحیح کرتے ہوئے بولا۔ ''صرف ایک گولی چلنے کی آواز آئی تو میں چونک اٹھا۔''

''پھر آپ نے کیا، کیا تھا؟'' وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''فائر کی آواز چونکہ سامنے والے بنگلے کے اندر سے ابھری تھی اس لئے میں تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ کیونکہ یہ پڑوس کا معاملہ تھا۔''

''کیا آپ نے اس سلسلے میں کوئی خاص قدم اٹھایا تھا؟''

''میں گیٹ کھول کر اپنے بنگلے سے باہر نکل آیا۔'' گواہ نے بڑے فخر سے بتایا۔

وکیل استغاثہ بڑے ڈرامائی انداز میں مستفسر ہوا۔ ''باہر آنے کے بعد آپ نے کیا دیکھا؟''

''میں نے اسے دیکھا'' وہ دوسرے کٹہرے میں کھڑے ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ شخص سامنے والے بنگلے سے نکل کر فرار ہو رہا تھا۔''

''اس سے آپ نے کیا اندازہ قائم کیا؟''

''یہی کہ اس بنگلے میں ہونے والے فائر میں اسی کا ہاتھ ہوگا۔''

''اس کے بعد آپ نے کیا، کیا؟'' وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

گواہ نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ''میں صورتِ حال جاننے کے لئے سامنے والے بنگلے میں چلا گیا اور وہاں جا کر مجھے معلوم ہوا کہ سحر بخاری کی بیوی کو قتل کر دیا گیا ہے۔''

دو تین مزید سوالات کے بعد وکیل استغاثہ نے جرح موقوف کر دی۔

اپنی باری پر میں وٹنس باکس کے قریب چلا گیا اور گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے دوستانہ انداز میں سوال کیا۔ ''لطیف صاحب! آپ کا شغل کیا ہے؟''

''میں شیر شاہ میں آٹو اسپیئر پارٹس کا بزنس کرتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''وقوعے کی رات آپ اپنے بنگلے کے لان میں چہل قدمی فرما رہے تھے۔'' میں نے عام سے لہجے میں کہا۔ ''آج کل رات میں موسم خاصا خنک ہو جاتا ہے۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک تھی نا؟''

وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''موسم خنک ہو یا گرم، میں اپنی عادت سے مجبور ہوں۔ رات کے کھانے کے بعد اگر میں آدھے گھنٹے تک واکنگ نہ کرلوں مجھے سکون نہیں ملتا۔ اس کے بعد بڑی گہری نیند آتی ہے۔''

''ویری نائس!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''صبح ناشتے سے پہلے اور رات کے کھانے کے بعد واکنگ واقعی بہت مفید ثابت ہوتی ہے۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے گواہ سے پوچھا۔ ''آپ عموماً رات کو کھانا کتنے بجے کھا لیتے ہیں؟''

''ہم کاروباری لوگ ہیں جناب! اور محنت کے بعد خاصے تھک جاتے ہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں رات آٹھ بجے تک گھر آ جاتا ہوں۔ رات کا کھانا ہمارے یہاں نو بجے رات کھایا جاتا ہے۔''

''کیا وقوعہ کی رات بھی آپ نے نو بجے ہی کھانا کھایا تھا؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔

''اس کا مطلب ہے، آپ کم و بیش ساڑھے نو بجے ٹہلنے کے لئے اپنے لان میں نکل آئے تھے؟''

''جی ہاں، میں روزانہ لگ بھگ اسی وقت چہل قدمی کرتا ہوں۔''

"آپ کا لان بنگلے کے سامنے والے حصے میں ہے یا عقبی جانب؟" میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ "میں جس لان میں رات کے کھانے کے بعد ٹہلتا ہوں وہ بنگلے کی فرنٹ سائیڈ میں ہے۔ یہ خاصا کشادہ لان ہے۔" پھر وہ رک کر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"ویسے ایک چھوٹا سا لان بنگلے کی عقبی سمت میں بھی ہے لیکن وہاں چہل قدمی کرنا مجھے کبھی اچھا نہیں لگا۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ بنگلے کے پچھواڑے گندی گلی ہے۔ اگرچہ اس گندی گلی میں کچرا وغیرہ تو نہیں ہوتا تاہم گندی گلی کا تصور ہی طبیعت مکدر کرنے کے لئے کافی ہے۔"

اس کی طولانی وضاحت نے تھمنے کا نام لیا تو میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لطیف صاحب! ذرا سوچ کر بتائیں، جب آپ نے گولی چلنے کی آواز سنی تو اس وقت آپ اپنی چہل قدمی کے کس مرحلے میں تھے؟"

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ "میں سمجھ نہیں سکا وکیل صاحب!"

"میں سمجھاتا ہوں۔" میں نے بڑی رسانیت سے کہا۔ "آپ عموماً ساڑھے نو بجے رات چہل قدمی کی غرض سے اپنے لان میں نکل آتے ہیں اور آپ کا معمول ہے کہ کم و بیش آدھے گھنٹے کی چہل قدمی کے بعد یعنی لگ بھگ دس بجے رات آپ یہ سلسلہ موقوف کر دیتے ہیں۔" میں لمحہ بھر کو سانس لینے کی غرض سے رکا، پھر کہا۔

"آپ سے میرا سوال یہ ہے کہ جب آپ نے سحر بخاری کے بنگلے میں گولی چلنے کی آواز سنی اس وقت آپ نے چہل قدمی شروع کی تھی یا ختم کرنے والے تھے یا پھر یہ سلسلہ وسط میں تھا؟ میں دراصل وقت کا تعین کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ تھوڑے تامل کے بعد بولا۔ "میرا خیال ہے، میں اس وقت چہل قدمی ختم کرنے ہی والا تھا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس وقت کم و بیش رات دس بجے کا وقت رہا ہوگا۔"

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "جی ہاں ... جی ہاں۔"

"اور اپنے بنگلے سے باہر آتے ہی آپ نے ملزم کو سحر بخاری کے بنگلے سے نکلتے اور فرار ہوتے دیکھا تھا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔

"تھینک یو لطیف صاحب!" میں نے کہا۔

"آپ کس بات پر میرا شکریہ ادا کر رہے ہیں؟"

"درست معلومات فراہم کرنے پر۔" میں نے مبہم انداز میں کہا۔

"تو کیا آپ مجھ سے کسی غلط بیانی کی توقع کر رہے تھے؟" اس نے برہمی سے پوچھا۔

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "آپ وکیل استغاثہ کے سوالات کے جواب میں ایسا کر چکے ہیں!"

اس نے گھور کر میری طرف دیکھا اور قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "میں نے آپ کے خیال میں کیا غلط کیا ہے؟"

استغاثہ کے معزز گواہ مسٹر لطیف کی غلط بیانی کی نشان دہی ضروری ہوگئی تو میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"لطیف صاحب! آپ نے وکیل استغاثہ کی جرح کے جواب میں بتایا ہے کہ سحر بخاری کے بنگلے سے ابھرنے والی فائر کی آواز سن کر آپ اپنے بنگلے سے باہر نکل آئے تھے اور اس وقت آپ نے ملزم کو سحر بخاری والے بنگلے سے نکل کر فرار ہوتے دیکھا۔ اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے ملزم نے فائر کیا اور اس کے بعد وہ جائے وقوعہ سے فرار ہوگیا۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟"

گواہ نے متذبذب نظر سے مجھے دیکھا اور حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ "تو کیا ایسا نہیں ہوا تھا؟ آپ کے خیال میں ملزم پہلے فرار ہوا اور بعد میں اس نے گولی چلائی ہوگی؟"

"جی، میرے خیال میں حقیقت یہی ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں کہ آپ نے وقوعہ کی رات لگ بھگ دس بجے ملزم کو سحر بخاری کے بنگلے سے فرار ہوتے دیکھا تھا لیکن بعد ازاں آپ نے جو فائر کی آواز سنی اس کا میرے مؤکل سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"آپ بالکل الٹی بات کر رہے ہیں۔" وہ الجھ کر بولا۔

"آپ کی سمجھ کا پھیر ہے لطیف صاحب!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

وہ مزید الجھ کر وکیل استغاثہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہ میں امداد کی پکار تھی۔ میں سمجھ گیا کہ گواہ کے بیان کے سلسلے میں وکیل استغاثہ نے بھی کوئی اہم کردار ادا کیا ہے۔ میں نے گواہ کو سوچنے سمجھنے کا موقع نہ دیا اور قدرے جارحانہ لہجے میں استفسار کیا۔

"لطیف صاحب! آپ کو پتہ ہے، جھوٹی گواہی پر آپ کو عدالت سے سزا بھی ہو سکتی ہے؟"

وہ گھبرا گیا اور نروس لہجے میں بولا۔ "میں نے کون سا جھوٹ بولا ہے؟"

"گولی چلنے کی آواز کو ملزم کے فرار کے ساتھ نتھی کرنا۔"

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ گڑبڑا گیا۔

''مطلب بھی مجھے ہی بتانا ہوگا؟''

''آپ ہی بتا دیں۔''

میں نے بتایا۔''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ نازنین کی موت گیارہ اور بارہ جنوری کی درمیانی شب گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اسی رپورٹ میں بڑی وضاحت اور وثوق کے ساتھ یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ گولی کھانے کے بعد چند سیکنڈ کے اندر ہی مقتولہ کی موت واقع ہوگئی۔ کیا آپ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کو چیلنج کر رہے ہیں؟''

''میں نے تو ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔'' وہ ڈھٹائی سے بولا اور امداد طلب نظر سے ایک مرتبہ پھر وکیل استغاثہ کی طرف دیکھنے لگا۔

اس سے پہلے کہ وکیل استغاثہ کسی قسم کی چیخ و پکار کے لئے پَر تولتا، میں نے گواہ کو آڑے ہاتھوں لیا۔''لطیف صاحب! یا تو آپ حالات کی سنگینی سے واقف نہیں ہیں اور یا پھر آپ دانستہ ڈھٹائی پر اترے ہوئے ہیں اس لئے آپ کے متعدد جھوٹ سامنے آرہے ہیں۔'' میں لمحے بھر کے لئے سانس لینے کی غرض سے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جھوٹ نمبر ایک ... آپ نے سامنے والے بنگلے میں گولی چلنے کی آواز سنی اور جب باہر جا کر دیکھا تو ملزم وہاں سے فرار ہو رہا تھا۔ جب آپ اپنے بنگلے سے باہر آئے تو رات کے دس بج رہے تھے جبکہ مقتولہ نازنین کی موت گیارہ بجے کے بعد واقع ہوئی ہے۔''

وہ ہکا بکا میری طرف دیکھتا چلا گیا۔ میں نے اس پر اٹیک جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''جھوٹ نمبر دو ...... ملزم کو فرار ہوتا دیکھنے کے بعد جب آپ صورتِ حال جاننے کے لئے سحر بخاری کے بنگلے میں داخل ہو گئے تو آپ کو معلوم ہوا کہ سحر بخاری کی بیوی نازنین کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ آپ کو کس نے بتایا کہ نازنین کو قتل کر دیا گیا ہے؟''

''سا... سحر بخاری نے...'' وہ لرزیدہ آواز میں بولا۔ اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

''اس کا مطلب ہے آپ اس کے بنگلے میں ضرور داخل ہوئے تھے؟'' میں نے کہا۔

وہ جلدی سے بولا۔''جی ہاں، جی ہاں ... میں وہاں گیا تھا۔''

''اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ آپ گیارہ بجے کے بعد وہاں گئے ہوں گے؟''

''جی، ایسا ہی ہوا ہوگا۔'' وہ فرمانبرداری سے بولا۔

''آپ میری بات پر صاد نہ کریں۔'' میں نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔''عدالت کی نظر میں ''ایسا ہوا ہوگا'' یا ''ویسا ہوا ہوگا'' کی کوئی اہمیت نہیں۔ درحقیقت جو ہوا تھا، آپ اس پر بات کریں۔''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔''میرا خیال ہے، میں گیارہ بجے کے بعد ہی سحر بخاری کے بنگلے پر گیا تھا۔''

''اور وہ جو آپ نے دس بجے کے قریب ملزم کو مقتولہ کے بنگلے سے نکلتے دیکھا تھا؟''

''میرا خیال ہے، میں نے ملزم کو گیارہ، سوا گیارہ بجے ہی دیکھا تھا۔''

''آپ کو معلوم ہے بیان بدلنا بھی جھوٹی گواہی کے زمرے ہی میں آتا ہے؟'' میں نے اسے کڑے تیوروں سے گھورا تو وہ بغلیں جھانکنے لگا۔

گواہ کی اس حرکت پر وثوق سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کس وقت، کس سمت میں جھانک رہا تھا۔ کیونکہ وہ بیک وقت مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں دیکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ میں نے ایک دو مزید سوالات کے بعد اپنی جرح ختم کر دی۔

اگلا گواہ سلیم تھا۔ استغاثہ کے اس گواہ نے خاصے لمبے بال رکھ چھوڑے تھے۔ وہ اختر کالونی کے ایک موٹر گیراج میں کام کرتا تھا۔ سلیم کی عمر چالیس کے قریب رہی ہوگی۔ وہ چھریرے بدن کا مالک ایک ہوشیار شخص تھا۔ اس کی آنکھیں مسلسل حرکت میں رہتی تھیں جس سے اس کی تیزی و طراری کا سراغ ملتا تھا۔

سلیم حلفیہ بیان ریکارڈ کرانے کے بعد فارغ ہوا تو وکیل استغاثہ نے اسے گھیر لیا۔

''مسٹر سلیم! کیا یہ سچ ہے کہ ملزم پہلے تمہارے ساتھ کام کرتا تھا؟''

''جی ہاں، ہم اختر کالونی والے گیراج پر کام کرتے تھے۔''

''ملزم نے وہاں سے کام کیوں چھوڑا تھا؟''

''اس نے خود کام نہیں چھوڑا تھا۔''

''پھر...؟'' وکیل استغاثہ کا انداز ڈرامائی رنگ اختیار کر گیا۔

گواہ نے اس کے ''پھر'' کے جواب میں بتایا۔''گیراج کے مالک صمد خان صاحب نے اسے نوکری سے نکال دیا تھا۔''

''آئی سی!'' وکیل استغاثہ اپنے چہرے پر زمانے بھر کی حیرت سجاتے ہوئے بولا پھر پوچھا۔''کیا تم ملزم کی وہاں سے برخاستگی کی وجہ جانتے ہو؟''

''میں کیا، اس گیراج میں کام کرنے والا بچہ بچہ جانتا ہے۔'' وہ پُر وثوق انداز میں بولا۔

وکیل استغاثہ نے کہا۔ ''معزز عدالت بھی وہ وجہ جاننے میں دلچسپی رکھتی ہے!''

گواہ سلیم نے ناپسندیدہ نظر سے اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم کی طرف دیکھا اور ناگواری سے بولا۔ ''اس بندے کی حرکتیں ہی ایسی تھیں کہ کسی بھی ورک شاپ یا گیراج کا مالک زیادہ عرصہ تک اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے تو حیرت ہے شکور صاحب اسے اور اس کی عادتوں کو کیسے برداشت کر رہے ہیں؟''

''ابھی تم نے ملزم کی جن حرکتوں کا ذکر کیا ہے، اس کی تفصیل کیا ہے؟'' وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

''یہ شخص ایک نمبر کا چور اور چکر باز ہے۔'' گواہ نے نفرت آمیز لہجے میں جواب دیا۔

وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو موقوف کر دیا۔

اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ میرا مؤکل چھوٹی موٹی چوریوں اور ہیرا پھیریوں میں ملوث رہا تھا۔ یقیناً اس نے اختر کالونی والے صمد کے گیراج میں بھی ایسی کوئی حرکت کی ہو گی لیکن ملزم کے ماضی کا زیرِ سماعت مقدمے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ اس سے پہلے کیا کرتا رہا تھا اور کیا نہیں کرتا رہا تھا، یہ ایک الگ کہانی تھی۔ فی الحال اس پر ڈیڑھ لاکھ روپے کی چوری اور نازنین کے قتل کا الزام تھا۔ اور مجھے ان الزامات سے بری الذمہ ثابت کر کے اپنے مؤکل کو آزاد کرانا تھا۔ میں اپنے مقصد میں کامیابی کے قریب پہنچ چکا تھا۔

وکیل استغاثہ کے بعد میں گواہ والے کٹہرے کے پاس پہنچ گیا اور وہاں موجود شخص کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''مسٹر سلیم! کیا آپ کا تعلق مغلیہ خاندان سے ہے؟''

وہ اچھل پڑا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کہاں میں اور کہاں مغلیہ خاندان!''

''دراصل، آپ نے بالکل شہزادہ سلیم کے سے انداز میں بال رکھ چھوڑے ہیں اور اتفاق سے آپ کا نام بھی سلیم ہی ہے۔'' میں نے مذاق کی بات کو سنجیدہ انداز میں پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''اس لئے مجھے شک ہوا تھا!''

وکیل استغاثہ فوراً میری شرارت کو سمجھ گیا۔ اس نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے اعتراض اٹھایا۔ ''آئی آبجیکٹ یور آنر! اس وقت معزز عدالت میں ایک انتہائی سنجیدہ کیس کی سماعت جاری ہے لیکن میرے فاضل دوست مغلیہ خاندان کے تذکرے کو درمیان میں لا کر عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ یہ عدالت کے تقدس کو پامال کرنے والی بات ہے۔ معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ وہ وکیل صفائی کو ایسی حرکتوں سے باز رہنے کی تاکید

کرے۔''

میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''جنابِ عالی! مغل شہنشاہوں نے ایک طویل عرصے تک متحدہ ہند پر حکمرانی کی ہے۔ مغلیہ تاریخ بڑی اہمیت کی حامل ہے لہٰذا مغلیہ خاندان کا تذکرہ کسی بھی زاویے سے معزز عدالت کے تقدس کو پامال کرنے کا موجب نہیں ہو سکتا!''

جج نے پوری توجہ سے میری بات سننے کے بعد اثبات میں سر ہلایا اس کے ساتھ ہی مجھے تاکید بھی کر دی۔ ''بیگ صاحب! گواہ پر جرح کے دوران آپ اس کی ذات کو ڈسکس کرنے کی بجائے عدالتی کارروائی کو آگے بڑھائیں۔ کوشش کریں کہ آپ کے سوالات زیرِ سماعت کیس سے متعلق ہی ہوں۔''

جج خاموش ہوا تو وکیل استغاثہ نے عجیب سی نظر سے مجھے دیکھا۔ اس کی نگاہ میں تحقیر کا عنصر نمایاں تھا۔ وہ اپنی فہم میں یہ سمجھا تھا کہ جج نے مجھے سخت قسم کی ڈانٹ پلا دی ہے۔ میں نے اسے اسی خوش فہمی میں مبتلا رہنے دیا اور جج کی ہدایت کے مطابق گواہ کی خبر لینے لگا۔

''سلیم صاحب! آپ جس گیراج میں کام کرتے ہیں، کیا وہاں پر کام کرنے والوں میں زیادہ تعداد بچوں کی ہے؟'' میں نے اس کے چہرے کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

اس نے استعجابیہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''آپ سے کس نے یہ بات کہہ دی؟''

''تھوڑی دیر پہلے آپ ہی نے تو بتایا تھا۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا یہ بھی کسی قسم کا مذاق ہے؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''میں بالکل سنجیدہ ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا۔''

''میں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کچھ دیر پہلے وکیل استغاثہ نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ کیا آپ ملزم کی اس گیراج سے برخاستگی کی وجہ جانتے ہیں تو آپ نے جواب دیا تھا، اس گیراج میں کام کرنے والا بچہ بچہ یہ بات جانتا ہے۔''

''آپ تو حد کر رہے ہیں وکیل صاحب!'' وہ برہمی سے بولا۔ ''اس بات سے میرا مطلب یہ تھا کہ کہاں کام کرنے والے تمام افراد ملزموں کی حرکتوں اور اسے گیراج سے نکالے جانے کے اسباب سے واقف ہیں۔ آپ الفاظ پکڑ کر مجھے خواہ مخواہ ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''آپ کو ہراساں کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں سلیم صاحب!'' میں نے قدرے بے تکلفی سے کہا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ الفاظ پکڑنے سے جملہ گرفت میں آتا ہے۔ پھر بولنے والے کو گرفتار کرنا آسان ہو جاتا ہے۔''

پتہ نہیں، وہ میری بات کی گہرائی کو سمجھ سکا کہ نہیں، معاندانہ نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ایک بات سچ سچ بتائیں سلیم صاحب! آپ ملزم کے دشمن کیوں بنے بیٹھے ہیں؟''

''میں نے کیا، کیا ہے؟'' الٹا وہ مجھ سے مستفسر ہوا۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے کہا۔ ''کیا آپ نے کبھی قربانی کی ہے؟''

''آپ یہ بات کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔

''پہلے آپ میری بات کا جواب دیں، پھر بتاؤں گا۔''

''اللہ کے فضل سے میں ہر سال قربانی کرتا ہوں۔'' وہ فخریہ لہجے میں بولا۔

میں نے زچ ہونے والے سوالات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کوئی بڑا جانور قربان کرتے ہیں یا بکرا وغیرہ؟''

''میں ہر سال بکرے کی قربانی دیتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''کسی سال ایسا بھی ہوا کہ قربانی دینے سے پہلے ہی آپ کا بکرا چوری ہو گیا ہو؟''

''میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا ہوں وکیل صاحب!'' گواہ سلیم بے حد الجھن سے بولا۔

میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''پھر تو آپ خواہ مخواہ میرے مؤکل سے دشمنی کر رہے ہیں۔''

''یہ کس قسم کی جرح ہو رہی ہے جناب عالی؟'' وکیل صفائی میری مسلسل چھیڑ چھاڑ پر خاموش نہ رہ سکا۔ ''میرے فاضل دوست نے عدالت کے قیمتی وقت کو کتنا ارزاں بنا کر رکھ دیا ہے؟''

اس کا اعتراض بجا تھا لہٰذا اس آبجیکشن پر جج نے تنبیہی نظر سے مجھے دیکھا۔ تاہم زبان سے کچھ نہ کہا۔

میں نے کہا۔ ''مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!''

استغاثہ کے گواہ مسٹر سلیم کو کٹہرے سے خارج ہونے کی اجازت مل گئی۔ اگلے ہی لمحے اس کی جگہ ملزم کی ورکشاپ کا مالک عبدالشکور کھڑا دکھائی دیا۔ اسے وکیل استغاثہ بڑی محنت

سے ارینج کر کے لایا تھا۔ لہٰذا اس کا حلفیہ بیان ریکارڈ پر آ چکا تو وکیل استغاثہ سوالات کے لئے اس کے قریب پہنچ گیا۔ میں اچھی طرح سمجھ سکتا تھا کہ وہ گواہ عبدالشکور سے کس زاویے کے سوالات کرے گا۔ لہٰذا میں خاموشی کے ساتھ ان کی باہمی ''گفتگو'' سننے لگا۔

''شکور صاحب!'' وکیل استغاثہ نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ملزم آپ کی ورکشاپ میں کتنے عرصے سے کام کر رہا ہے؟''

''لگ بھگ ایک سال سے۔'' گواہ نے جواب دیا۔ اس کے جواب میں ایک خاص قسم کا ٹھہراؤ تھا۔

عبدالشکور کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ پستہ قامت کا مالک ایک متین شخص نظر آتا تھا۔ وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ''کیا یہ صحیح ہے کہ کچھ عرصہ پہلے آپ کی ورکشاپ میں سے آپ کی کچھ رقم چوری ہو گئی تھی؟''

''جی ہاں، یہ بالکل صحیح ہے۔'' شکور نے بتایا۔

''اور بعد میں پتہ چلا تھا، وہ رقم ملزم نے چرائی تھی؟''

''آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔'' گواہ نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

وکیل استغاثہ نے استفسار کیا۔ ''آپ کے کتنے پیسے گئے تھے؟''

''وہ پورے ڈیڑھ ہزار روپے تھے۔'' گواہ نے بتایا۔

''آپ نے اس چوری پر کیا ایکشن لیا تھا؟''

''میں نے ملزم کو تادیب کر دی تھی۔''

''لیکن آپ کی تادیب کا الٹا اثر ہوا۔'' وکیل استغاثہ نے کہا۔ ''آپ کو چاہئے تھا، ملزم کے خلاف کوئی تعزیری کارروائی کرتے تاکہ اسے ضرب دینے کی جرأت نہ ہوتی۔''

وکیل استغاثہ کے انداز کو گواہ سمجھ نہ سکا اور پوچھ بیٹھا۔ ''ضرب سے آپ کی کیا مراد ہے وکیل صاحب؟''

''ملزم نے آپ کی ورک شاپ میں پندرہ سو یعنی ڈیڑھ ہزار کی چوری کی تھی۔ آپ نے اسے تنبیہہ کی اور سوکھا چھوڑ دیا۔ اس سے اس کا حوصلہ بڑھا اور اگلی واردات میں اس نے مسروقہ رقم کو سو گنا بڑھا دیا۔ میرا اشارہ سحر بخاری کے سیف سے چرائی جانے والی ڈیڑھ لاکھ کی رقم کی طرف ہے۔''

''اوہ... اب سمجھا!'' گواہ نے بھنوئیں اچکاتے ہوئے کہا۔ ''دراصل میں اپنی ورک شاپ میں کام کرنے والوں کے ذاتی معاملات میں نہیں پڑتا ہوں۔ وہ باہر جا کر کیا کرتے

ہیں اس سے مجھے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ میں اپنے کام سے کام رکھنے والا بندہ ہوں۔ میری تادیب کے بعد ملزم نے ورک شاپ کی حدود میں ایسی کوئی حرکت نہیں کی جس پر مجھے کوئی اعتراض ہوتا لہٰذا میں مطمئن ہو گیا۔''

''لیکن اب آپ کو مطمئن نہیں رہنا چاہئے۔'' وکیل استغاثہ نے کہا۔ ''نازنین کا قتل اور سحر بخاری کے بنگلے میں ہونے والی ڈیڑھ لاکھ کی چوری آپ کا اندرونی مسئلہ بن گیا ہے۔ ملزم کا تعلق آپ کی ورک شاپ سے ہے اور سحر بخاری آپ کا مستقل کلائنٹ ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں وکیل صاحب!'' گواہ سنجیدگی سے بولا۔ ''میں ملزم کی طرف سے بہت محتاط رہوں گا اور آئندہ کے لئے اسے ملازمت پر رکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

گواہ کے ان زریں عزائم کے ساتھ ہی وکیل استغاثہ نے جرح کا سلسلہ موقوف کر دیا۔

اپنی باری پر میں اٹھ کر کھڑا ہوا اور عبدالشکور والے کٹہرے کے پاس پہنچ گیا۔ پھر کھنکار کر گلا صاف کرنے کے بعد اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''شکور صاحب! آپ نے بتایا ہے، ملزم اس واقعے سے پہلے لگ بھگ ایک سال سے آپ کی ورک شاپ میں کام کر رہا تھا۔ اس دوران وہ کتنی مرتبہ چوری چکاری کا مرتکب ہوا؟''

''صرف ایک بار۔'' وہ حتمی لہجے میں بولا۔

''یعنی جب آپ کے پندرہ سو روپے چوری ہوئے تھے؟''

''جی ہاں ..... میں اسی ایک واقعے کا ذکر کر رہا ہوں۔'' اس نے بتایا۔

میں نے کہا۔ ''ایک بات بالکل ٹھیک بتائیں۔''

وہ ہمہ تن گوش ہو گیا تو میں نے پوچھا۔

''آپ نے اس ناخوشگوار واقعے کے بعد ملزم کو نوکری سے کیوں نہیں نکال دیا؟''

وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''مجھ میں اور صمد میں کچھ فرق بہر حال ہے۔''

''ذرا اس فرق کی وضاحت فرمائیے گا؟'' میں نے کہا۔

''دودھ دینے والی گائے کی لات تو کھانا ہی پڑتی ہے!''

''آپ نے بات کو آسان کرنے کی بجائے اور زیادہ مشکل کر دیا ہے۔''

وہ بڑی رسانیت سے بولا۔ ''بات دراصل یہ ہے وکیل صاحب! کہ کام کے بندے آج کل بہت مشکل سے ملتے ہیں لہٰذا میں نے اس چوری پر ملزم کو محض سرزنش کر کے چھوڑ دیا

تھا۔ ویسے بھی کسی شخص کو کم از کم ایک موقع ضرور دینا چاہئے تا کہ وہ اپنی اصلاح کر سکے۔ انہی وجوہات کی بناء پر میں نے ملزم کو اپنی ورک شاپ سے خارج نہیں کیا تھا۔''

''آپ کا اصول لائق تحسین ہے شکور صاحب!'' میں نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ''گویا آپ ملزم کے لئے یہ سرٹیفکیٹ جاری کر رہے ہیں کہ وہ بندہ کام کا ہے؟''

''بے شک! اس کی ٹکر کے بہت کم مکینک ہوں گے شہر میں۔'' اس نے جواب دیا۔

''آپ اس بات کی بھی تصدیق کرتے ہیں کہ آپ کی سرزنش کے بعد ملزم نے ویسی کوئی حرکت نہیں کی؟''

''جی ہاں!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''کم از کم میری ورک شاپ کی حد تک تو نہیں کی۔''

''اور آپ کا یہ اصول کہ کسی بیرونی معاملے سے آپ کوئی سروکار نہیں رکھتے؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ کیونکہ اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔''

''میں بھی آپ سے کوئی بیرونی معاملہ ڈسکس نہیں کروں گا۔''

وہ پوری توجہ سے میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے سوال کیا۔ ''مقتولہ کا شوہر سحر بخاری کتنے عرصے سے آپ کی ورک شاپ کی خدمات سے استفادہ کر رہا ہے۔ کہیں یہ غیر متعلق سوال تو نہیں؟''

اس نے میرے سوال کے دوسرے حصے کا پہلے جواب دیا۔ ''بالکل نہیں وکیل صاحب!'' پھر وہ پہلے حصے کے سلسلے میں گویا ہوا۔ ''سحر بخاری کافی عرصے سے میری ورک شاپ آ رہا ہے۔''

''مثلاً کتنے عرصے سے؟'' میں نے کرید جاری رکھی۔

''لگ بھگ آٹھ سال سے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے، ملزم کی جوائننگ سے بھی بہت عرصہ پہلے؟''

''جی ہاں، اس کا یہی مطلب نکلتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''کیا ان آٹھ سالوں میں ایسا ہوتا رہا ہے کہ سحر بخاری کسی کام سے اپنی گاڑی آپ کی ورک شاپ پر چھوڑ گیا ہو لیکن واپس لینے نہ آ سکا ہو؟'' میں نے جرح کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے سوال کیا۔

گواہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''ہاں، ایسا کئی مرتبہ ہو چکا ہے۔'' پھر مزید وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اور یہ سلسلہ صرف سحر بخاری تک ہی محدود نہیں۔ اکثر گاہک

مجھ پر اور میری ورک شاپ پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ میں نے کبھی ان کے بھروسے کو ٹھیس نہیں لگنے دی۔''

''میں چونکہ آپ سے وعدہ کر چکا ہوں کہ غیر متعلق افراد کو گفتگو کا موضوع نہیں بناؤں گا اس لئے میں واپس سحر بخاری کی طرف آتا ہوں۔'' میں نے اتنا کہنے کے بعد لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے گواہ سے پوچھا۔

''شکور صاحب! معزز عدالت کو پلیز، یہ بتائیں کہ جب کبھی سحر بخاری اپنی گاڑی لینے کے لئے خود آپ کی ورک شاپ نہ آ سکا تو آپ نے گاڑی کے ساتھ کیا، کیا؟''

''میں نے کام مکمل کرانے کے بعد گاڑی کو اس کے بنگلے پر پہنچوا دیا۔'' گواہ نے جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے، ملزم کوئی پہلی مرتبہ گاڑی لے کر مقتولہ کے بنگلے پر نہیں گیا تھا؟''

وہ شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''قطعی نہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا پچھلے دنوں سحر بخاری کی گاڑی اس کے بنگلے پر پہنچانے کے لئے آپ نے ملزم کو حکم دیا تھا یا یہ اس کی خواہش تھی؟''

استغاثہ کی رپورٹ میں دیگر الزامات کے علاوہ میرے مؤکل پر ایک یہ بھی چارج تھا کہ وہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت باقاعدہ پلاننگ کر کے اس روز سحر بخاری کی گاڑی اس کے بنگلے پر پہنچانے گیا تھا۔ وہ دراصل مذکورہ بنگلے کی لوکیشن کو ذہن نشین کرنا چاہتا تھا تاکہ جب وہ واردات کے لئے بنگلے میں گھسے تو اسے کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

مجھے اپنے مؤکل کی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے اس سنگین الزام کی کاٹ کرنا تھی۔ اسی مقصد کے لئے میں نے ورک شاپ کے مالک عبدالشکور سے وہ سوال کیا تھا۔ اس نے نہایت ہی سادگی سے جواب دیا۔

''اس میں ملزم کی کسی خواہش کا کوئی دخل نہیں۔''

میں نے فاتحانہ نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا۔ اس وقت وہ مجھے ہی گھور رہا تھا اور اس کی نگاہ میں کینہ ہلکورے لے رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں کا مالک تھا اور ان کے استعمال پر بھی اسے اختیار حاصل تھا لہٰذا میں نے اس کے انداز کو لائق توجہ نہ جانا اور استغاثہ کے گواہ کی جانب منہ پھیر لیا۔ میرے لئے یہ بڑی خوشی اور کامیابی کی بات تھی کہ میں نے اپنے مؤکل کو ایک اور الزام کے حلقے میں سے کھینچ کر باہر نکال لیا تھا۔

''شکور صاحب!'' میں نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''وقوعہ کے روز یعنی گیارہ جنوری کی شام کو سحر بخاری آپ کی ورک شاپ میں آیا تھا۔ آپ کو کچھ یاد آ رہا ہے؟''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس واقعے کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا اس لئے مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ سحر بخاری اس شام گاڑی کی ڈگی کا فالٹ دور کرنے آیا تھا۔ ڈگی بند ہونے میں ذرا گڑبڑ کر رہی تھی۔''

''اللہ آپ کا بھلا کرے، ماشاءاللہ آپ کی یادداشت بہت اچھی ہے۔''

''یادداشت کی مضبوطی مجھے وراثت میں ملی ہے۔'' اس نے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ کی ورک شاپ میں کتنے افراد کام کرتے ہیں؟''

''لگ بھگ نو دس۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا یہ درست ہے کہ سحر بخاری کی گاڑی کی ڈگی کا فالٹ دور کرنے کے لئے آپ نے ملزم ہی کو چنا تھا؟'' میں نے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔ ''اس کی کوئی خاص وجہ تھی؟''

''خاص وجہ تو کوئی نہیں تھی البتہ عام وجوہ دو تھیں۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''مثلاً کون کون سی دو وجوہات؟''

''پہلی وجہ تو یہ تھی کہ ملزم اس وقت ایک جانب فارغ کھڑا تھا۔'' گواہ نے بتایا۔ ''اور دوسری وجہ اس کی کارکردگی سمجھ لیں۔ یہ اپنے کام کا ماسٹر بندہ ہے۔ مہنگی اور لگژری گاڑیوں کا کام میں عموماً اس سے کرواتا ہوں۔ سحر بخاری کی جس گاڑی کی ڈگی ناز دکھلا رہی تھی وہ اس نے حال ہی میں نئی خریدی تھی۔ وہ ایک نئے ماڈل کی گاڑی تھی۔''

''یہ آپ نے خوب بتایا کہ آپ کی یادداشت بہت قوی ہے۔'' میں نے جرح کی گاڑی کو ایک نئی پٹری پر چڑھاتے ہوئے گواہ سے سوال کیا۔ ''یہ بتائیں کہ مذکورہ شام سحر بخاری اپنی گاڑی میں اکیلا ہی آپ کی ورک شاپ آیا تھا یا......؟''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے بولا۔ ''وہ اکیلا نہیں تھا، بلکہ ایک خوبصورت عورت بھی گاڑی میں موجود تھی۔''

وہ اسی عورت کا تذکرہ کر رہا تھا جس کے نظارے نے ملزم کو بے چین کر دیا تھا اور وہ ایک طرف کھڑا ہو کر یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا کہ شکور نے اسے فارغ سمجھ لیا۔ میں نے رازدارانہ انداز میں شکور سے پوچھا۔

''اور وہ خوبصورت عورت سحر بخاری کے پہلو میں پسنجرز سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی؟''

گواہ نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھنے لگا۔ ''یہ بات تو آپ اتنے وثوق

سے کہہ رہے ہیں جیسے آپ بھی وہاں موجود ہوں؟''

میری سماعت تک وکیل استغاثہ کا جلا بھنا یہ تبصرہ رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔''یہ بیگ صاحب ہیں۔ انہیں کہیں بھی جانے سے کوئی نہیں روک سکتا!''

وکیل استغاثہ اگرچہ بڑی دھیمی آواز میں بڑبڑایا تھا لیکن میں نے اپنے بارے میں اس کے خیالات سے آگاہی حاصل کر لی تاہم میں نے اس کے اس واہیات تبصرے کو نظر انداز کرتے ہوئے گواہ سے پوچھا۔

''شکور صاحب! کیا وہ خوبصورت عورت سحر بخاری کی بیوی تھی؟''

''نہیں!'' اس نے قطعی لہجے میں نفی کر دی۔

میں نے پوچھا۔''پھر کون تھی؟''

میرے پُراسرار انداز کو دیکھتے ہوئے وہ چونکا ضرور لیکن اس نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔''میں اس عورت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اس سے قبل میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔''

''کیا آپ اس کے بارے میں جاننا پسند کریں گے؟''

''اس کا مطلب ہے، آپ کو معلوم ہے؟''

''بہت کچھ معلوم ہے جناب!''

''تو پھر بتا دیں۔''

میں نے بتا دیا۔''اس دلکش عورت کا نام شبانہ قمر ہے!''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

٭٭٭

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں استغاثہ کا آخری گواہ، مقتولہ کا زندہ شوہر سحر بخاری کھڑا تھا۔ اس کیس کو عدالت میں لگے کم و بیش چار ماہ ہو چکے تھے، اس دوران عدالتی کارروائی بڑے ہموار انداز میں مرحلہ وار آگے بڑھ رہی تھی۔ آخری گواہ بھی بھگت جاتا تو پھر دلائل کی باری آتی۔ دونوں وکیلوں کے آرگومینٹس سننے کے بعد ہی عدالت کسی فیصلے تک پہنچتی۔

سحر بخاری کی عمر پچاس کے اریب قریب تھی۔ وہ درمیانے قد کا مالک، ایک واجبی سی صورت کا شخص تھا۔ جسم نہ زیادہ ڈُبلا اور نہ ہی فربہ۔ تاہم بھرے بھرے بدن کے ساتھ اس کی توند قدرے باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ اس نے بہترین تراش کا ایک ٹو پیس سوٹ پہن رکھا

تھا۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ دکھائی دیتا تھا جس کے گلاسز خاصے بڑے تھے۔

سحر بخاری نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا۔ اس کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرا دیا۔ وکیل استغاثہ جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد گواہ کی جانب بڑھ گیا۔ میں بڑے تحمل سے اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔

وکیل استغاثہ نے کم و بیش پندرہ منٹ تک گواہ سے مختلف نوعیت کے سوالات کیے۔ ان میں کوئی بھی ایسی بات نہیں تھی کہ میں اعتراض اٹھاتا۔ دراصل، وکیل سرکار اس سوال و جواب کے ذریعے ''استغاثہ کے پلندے'' کو جسٹی فائی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ استغاثہ کی رپورٹ کا میں تفصیلی ذکر کر چکا ہوں لہٰذا وکیل استغاثہ کے استفسارات سے جمپ کرتے ہوئے میں آگے بڑھتا ہوں۔

اپنی باری پر میں گواہوں والے کٹہرے کے قریب پہنچ گیا۔ چند لمحات تک میں پُر ستائش نظر سے اسے دیکھتا رہا۔ دیکھنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے میں کسی عبقری یا نادر الوجود ہستی کا دیدار کر رہا ہوں۔ اس کے بعد میں نے اپنے مخصوص انداز میں گواہ کو گھسنا شروع کیا۔ یہ گویا میٹھی چھری سے کسی کو غیر محسوس انداز میں ذبح کرنے کے مترادف تھا۔

''سحر بخاری صاحب!'' میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔''میری یہ خوش قسمتی ہے کہ آپ جیسی شخصیت سے ملاقات ہو رہی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے اس بات کا افسوس بھی ہے کہ یہ ملاقات خوش گوار حالات میں نہیں ہو رہی۔''

وہ میری اس تمہید پر خاموش کھڑا ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا۔

میں نے پوچھا۔''کیا میں آپ کو محض بخاری صاحب کہہ کر مخاطب کر سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں۔'' وہ مختصر سا جملہ بول کر خاموش ہو گیا۔

''بخاری صاحب!'' میں نے اپنے ذہن کو ایک خاص زاویے پر سیٹ کرتے ہوئے گواہ سے سوال کیا۔''جس بنگلے میں آپ کی بیوی کو قتل کیا گیا وہاں آپ کتنے عرصے سے رہ رہے ہیں؟''

''کم و بیش پانچ سال سے۔'' اس نے جواب دیا۔

''آپ دونوں کے علاوہ اس بنگلے میں اور کون رہتا تھا؟''

''کوئی نہیں۔'' اس نے بتایا۔

''کیا مطلب؟'' میں دانستہ چونک اٹھا۔

''مطلب یہ کہ ہم میاں بیوی ہی اس بنگلے میں رہتے تھے۔''

''اور آپ کی اولادیں وغیرہ؟'' میں نے پوچھا۔

''ہماری کوئی اولاد نہیں۔''

''آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا تھا؟''

''اتنا ہی عرصہ جب سے ہم اس بنگلے میں رہ رہے تھے۔''

''اوہ!'' میں نے مصنوعی تاسف کا اظہار کیا۔ ''یہ سن کر افسوس ہوا کہ آپ بے اولاد ہیں۔''

میں یہ تمام باتیں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کر رہا تھا۔ میں نے گواہ سحر بخاری پر جرح کے لئے دو مخصوص زاویوں کا انتخاب کیا تھا۔ ایک زاویہ اس کی ذات کا احاطہ کرتا اور دوسرا اس کی صفات پر روشنی ڈالتا۔ اس وقت میں ذات والے زاویے کو استعمال کر رہا تھا۔

''مجھے پتہ چلا ہے، آپ کی مقتولہ بیوی نازنین ایک ابھرتے ہوئے سیاست دان کی بہن تھی؟''

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ نے اپنے وجود کا یقین دلاتے ہوئے نعرہ لگایا۔ ''وکیل صفائی استغاثہ کے گواہ پر جرح کر رہے ہیں یا کسی شادی دفتر میں بیٹھے کوئی فارم بھر رہے ہیں؟''

جج نے سحر بخاری کی طرف دیکھا اور سوال کیا۔ ''کیا آپ کو وکیلِ صفائی کے سوالات پر کوئی اعتراض ہے؟''

وہ خود کو بہت مضبوط ثابت کرنے کے چکر میں ایک فاش غلطی کر بیٹھا۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس نے جج کے سوال کا جواب دیا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں جناب! کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے اور متعدد لوگ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ نازنین ایک معروف سیاست دان کی چھوٹی بہن ہے۔''

''بیگ صاحب! آپ اپنی جرح جاری رکھیں۔'' جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس اجازت سے جج کی گہری دلچسپی کا اظہار ہوتا تھا۔ میں نے سحر بخاری کو اس کی ''غلطی'' کی سزا دینے کا فیصلہ کر لیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا یہ سچ ہے کہ اس شادی کے پس منظر میں باہمی افہام و تفہیم کی ایک خفیہ سودے بازی چھپی ہوئی تھی؟''

''آپ کس سودے بازی کا ذکر کر رہے ہیں؟'' وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ سودے بازی کہ آپ مذکورہ سیاست دان کو اور

اس کی پارٹی کو اپنے کالموں کے ذریعے آسمانوں کی راہ دکھانے کی کوشش کریں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ اس کی بہن کو ایک مشہور شخصیت کی بیوی ہونے کا اعزاز بخشیں گے۔ نازنین کی خواہش تھی کہ اس کا شوہر صحافت اور شوبز سے متعلق ہو۔'' میں ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اس کے بدلے میں آپ کو وہ سب کچھ ملے گا جس سے آپ ہمیشہ محروم رہے تھے مثلاً قیمتی گاڑی، عالیشان بنگلہ، بھاری بینک بیلنس وغیرہ وغیرہ۔ مسٹر بخاری! آپ بھی جانتے ہیں کہ آپ ٹی وی اور اخبار سے جو کچھ کماتے ہیں اس میں ایسے ٹھاٹھ سے زندگی بسر نہیں کی جا سکتی جو زندگی آپ اس وقت گزار رہے ہیں اور شادی سے پہلے آپ ساٹھ گز کے کرائے کے ایک کوارٹر میں رہتے تھے!''

اس نے ناپسندیدہ نظر سے مجھے دیکھا اور ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''شادی انسان کی زندگی میں بڑی بڑی تبدیلیاں لاتی ہے جس میں ایک تبدیلی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انسان کا سوشل اسٹیٹس شوٹ کر جائے!''

''ہاں، یہ ہو سکتا ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''اور جہاں ایسا ہوتا ہے وہاں نیچے سے اوپر آنے والی پارٹی کو کچھ قربانیاں بھی دینا پڑتی ہیں۔ آپ نے اپنی معاشرتی حیثیت کو بلند کرنے کے لئے کیا قربانی دی تھی بخاری صاحب؟''

''اللہ کا شکر ہے کہ میں نے اس سلسلے میں کوئی کمپرومائز نہیں کیا۔'' وہ با آواز بلند بولا۔ ''مجھے جو کچھ ملا وہ میرے نصیب میں تھا۔ بلاشبہ میں ایک خوش قسمت انسان ہوں۔''

''آپ کو شاید یاد نہ ہو یا آپ یاد رکھنا نہ چاہتے ہوں یا پھر آپ کو یاد تو سب کچھ ہو مگر اس کا اظہار اور اقرار کرنے سے ڈرتے ہوں لیکن میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ نے یہ شان و شوکت اور آسائشات حاصل کرنے کے لئے ایک بہت بڑی قربانی دی تھی!'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کون سی قربانی؟'' وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

اس نے پوچھا تو بتانا مجھ پر لازم ہو گیا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''اولاد سے محرومی کی قربانی!''

''اولاد سے محرومی کا میری شادی سے کیا تعلق ہے؟'' وہ اچھل پڑا۔

''بڑا گہرا تعلق ہے بخاری صاحب!'' میں نے پُرمعنی انداز میں کہا۔ ''آپ نے مذکورہ

نہیں ہے۔''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وکیلِ استغاثہ فوراً اس کی مدد کو دوڑا۔ اس نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے اعتراض کر دیا۔ ''جنابِ عالی! وکیلِ صفائی غیر ضروری اور غیر متعلق باتوں میں الجھ کر اصل موضوع سے ہٹ گئے ہیں۔ کیا معزز عدالت کا وقت اتنا ہی ارزاں ہے کہ ایسے قصے کہانیوں کی نذر کر دیا جائے؟''

جج کے بولنے سے پہلے ہی میں نے کہا۔ ''جنابِ عالی! میں نے اب تک گواہ سے ایک بھی غیر ضروری سوال نہیں پوچھا۔ میں آگے چل کر یہ ثابت کر دوں گا کہ میرے تمام تر سوالات انتہائی متعلقہ تھے!''

''آپ کسی کی نیت کو کیسے جان سکتے ہیں؟'' وکیلِ استغاثہ نے براہِ راست مجھ سے استفسار کیا۔ ''اگر معزز گواہ نے ایک بیوہ اور بانجھ عورت سے شادی کر کے اپنا گھر بسایا تھا تو آپ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ اس نے یہ شادی کسی سودے بازی کے نتیجے میں کی تھی؟''

''بے شک! نیتوں کا احوال صرف وہی قادرِ مطلق جانتا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن انسان کے عمل اور فعل کو دیکھتے ہوئے اس کے ارادے کو بھانپنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔''

''آپ نے میرے ارادے سے کیا بھانپا ہے وکیل صاحب؟'' بخاری نے مجھ سے سوال کیا۔

میں نے کہا۔ ''آپ کا عمل یہ ثابت کرتا ہے کہ آپ نے اس معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے ..... بلکہ ایک عرصہ سے کرتے چلے آ رہے ہیں جو اس سیاست دان اور آپ کے درمیان ہوا تھا۔ آپ اپنا عیش و آرام تو برابر حاصل کرتے رہے لیکن بدلے میں معاہدے کا ایک حصہ پورا نہیں کیا۔''

''کون سا حصہ؟'' اس نے دریافت کیا۔

میں نے کہا۔ ''دونوں پارٹیوں کے درمیان جو کچھ طے پایا تھا اس کی رو سے آپ نے مذکورہ سیاست دان اور اس کی پارٹی کو اپنے کالموں میں پروجیکٹ کرنا تھا۔ یہ کام آپ اکثر و بیشتر کرتے رہتے ہیں لیکن سیاست دان کی بہن کے حوالے سے جو طے ہوا تھا اس کی مسلسل خلاف ورزی کر رہے ہیں۔''

''میں نے ایسا کیا کر دیا ہے وکیل صاحب؟'' اس نے پوچھا۔

''آپ اپنی بیوی سے بے وفائی کے مرتکب ہوتے رہے ہیں!''

''یہ جھوٹ ہے۔ آپ مجھ پر بہتان باندھ رہے ہیں۔'' وہ چیخ کر بولا۔

لیکن میں اس کی چیخ و پکار سے متاثر ہونے والا نہیں تھا۔ فاروق نے بڑی جاں فشانی سے مجھے بخاری کی زندگی کے بارے میں معلومات اکٹھی کر کے دی تھیں۔ یہ شخص انتہائی گھناؤنے کردار کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ میں اس کو چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اس کے چیخنے کے جواب میں، میں نے بھی کڑک کر کہا۔

''میں الزام تراشی نہیں کر رہا بلکہ حالات کی حقیقی تصویر کو معزز عدالت کے سامنے لا رہا ہوں بخاری صاحب!''

وکیلِ استغاثہ موجودہ صورتِ حال پر خاصا بوکھلایا ہوا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر مجھ سے استفسار کیا۔ اس کے استفسار میں جارحانہ پن پایا جاتا تھا جو منتشر الخیالی کا مظہر تھا۔

''ڈیئر ڈیفنس کونسلر! آپ کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ استغاثہ کا گواہ کسی عہد شکنی یا بے وفائی کا مرتکب ہو رہا تھا؟''

سحر بخاری نے بھی اکھڑے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ''ہاں، ہاں بتائیں۔ میں نے کون سی بے وفائی کی ہے؟''

''یہ شبانہ قمر کون ہے؟'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''میں کسی شبانہ قمر کو نہیں جانتا!'' وہ سٹپٹائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میں اس خوب صورت مہ رخ کا تذکرہ کر رہا ہوں جو گیارہ جنوری کی شام آپ کی گاڑی کی پسنجر سیٹ پر براجمان تھی۔ آپ نے اسے اپنے بریف کیس میں سے ایک تہہ شدہ کاغذ نکال کر دیا تھا۔ اس کاغذ کے نیچے بریف کیس نوٹوں کی گڈیوں سے بھرا ہوا تھا۔ کچھ یاد آیا کہ نہیں؟''

جج نے گہری دلچسپی سے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''بیگ صاحب! کیا اس شبانہ قمر کا زیرِ سماعت مقدمے سے کوئی تعلق بنتا ہے؟''

''بڑا گہرا تعلق بنتا ہے جناب!'' میں نے پُراسرار انداز میں کہا۔ ''آگے چل کر میں اس کردار کو ایکسپوز کروں گا۔''

جج گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''مسٹر سحر بخاری! وکیل صفائی آپ سے کچھ پوچھ رہے ہیں۔''

بخاری ''نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' والی صورتِ حال میں گھر گیا تو اسے جواب دیتے ہی بنی۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے برہمی سے بولا۔ ''میں ٹی وی کے لئے چھوٹی

موٹی چیزیں لکھتا رہتا ہوں اس لئے شوبز کے اکثر لوگوں سے میری یاد اللہ ہے۔ آپ نے جس عورت کا ذکر کیا ہے وہ بھی خود کو ایک ٹی وی آرٹسٹ کے طور پر منوانا چاہتی ہے لیکن ابھی تک اسے اسکرین پر آنے کا موقع نہیں مل سکا۔ میں اس کے لئے کوشش کر رہا ہوں اس لئے وہ میرے ساتھ نظر آ جاتی ہے۔'' ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''آپ کو ہمارے میل جول پر کوئی اعتراض ہے وکیل صاحب؟''

''میں کون ہوتا ہوں اعتراض کرنے والا۔'' میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''جسے اعتراض تھا وہ تو منوں مٹی کے نیچے دب گئی!''

سحر بخاری کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ وکیل استغاثہ نے مجھ سے پوچھا۔ ''آپ کس کا ذکر کر رہے ہیں؟''

''مقتولہ نازنین کا ذکر کر رہا ہوں مائی ڈیئر کونسلر!''

جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! یہ سب کیا چکر ہے؟''

میں نے چھیڑنے والے انداز میں وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ کی اجازت ہو تو بتا دوں؟''

وہ کسی قسم کا اعتراض کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا کیونکہ استفسار بذاتِ خود جج کر رہا تھا لہٰذا وہ خاموش رہا۔ میں نے اس کی ''خاموشی'' کو ''رضامندی'' سے تعبیر کرتے ہوئے جج سے کہا۔

''جنابِ عالی! چکر بہت ہی سادہ اور روایتی سا تھا۔ مقتولہ نازنین کو بخاری صاحب کی غیر نصابی سرگرمیوں کا پتہ چل گیا تھا۔ اس نے اپنے تئیں شوہر کو سدھارنے کی کوششیں شروع کر دیں لیکن اس نے اپنے اور شبانہ کے تعلق کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ بیوی کی حس شوہر کے معاملے میں بہت تیز ہوتی ہے۔ نازنین کو یقین تھا کہ ان دونوں کے بیچ کوئی کھچڑی پک رہی ہے۔ مگر بخاری اسے کوئی سرا نہیں پکڑا رہا تھا۔ نازنین نے اس سلسلے میں اپنے سیاست دان بھائی کو بھنک بھی نہیں پڑنے دی۔ وہ ایسی ہی ایک کوشش کا نتیجہ بھگت رہی تھی۔ شادی شدہ زندگی اسے پہلے راس آئی تھی اور نہ ہی اب آ رہی تھی۔ اس کا پہلا شوہر بھی کچھ ایسی ہی صفات کا مالک تھا۔ نازنین نے شوہر کو راہِ راست پر لانے کے لئے بھائی کی طاقت کا سہارا لیا تو چند روز بعد اس کا شوہر ایک حادثے کا شکار ہو کر موت کے منہ میں چلا گیا۔

میں نے سانس لینے کے لئے لمحاتی توقف کیا۔ پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''نازنین نے بخاری کے سلسلے میں سابق تلخ تجربے کو نہیں دہرایا اور بھائی کو اپنے حالات سے بے خبر رکھتے ہوئے اپنی سی کوشش کرتی رہی مگر یہ کوشش رائیگاں گئی۔ اسی دوران ایک اور تماشا رونما ہوا۔ جس اخبار میں سحر بخاری سیاسی کالم لکھتا ہے، اس میں گاہے گاہے شبانہ سحر کے نام سے بھی کالم شائع ہونے لگے۔ وہ اخبار چونکہ باقاعدگی کے ساتھ گھر بھی آتا تھا اس لئے یہ بات نازنین سے پوشیدہ نہ رہ سکی اور اس نے حالات کی کڑیاں ملاتے ہوئے ایک کہانی مکمل کر لی۔ وہ کہانی جس کا بیشتر حصہ حقائق پر مبنی تھا۔ لیکن جذبات میں آ کر نازنین نے اسے اپنے خدشات کا عکاس انجام دے ڈالا۔ اسے یقین ہو گیا کہ سحر بخاری نے شبانہ قمر سے خفیہ شادی کر لی ہے اور اسی کے کالم گاہے گاہے شبانہ سحر کے نام سے بھی شائع ہو جاتے ہیں۔ جب کہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔

بیویوں کے ذہن میں اگر شوہر کے حوالے سے کوئی بات سما جائے تو وہ آسانی سے تلف یا حذف نہیں ہوتی۔ اس نے ایک روز سحر بخاری سے اس سلسلے میں دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کے درمیان یہ مسئلہ زیر بحث آیا اور بخاری نے نازنین کے الزام کی نہ صرف تردید کر دی بلکہ اگلے روز وہ اسے اپنے ساتھ اخبار کے دفتر بھی لے گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اسٹاف سے گواہی دلا کر نازنین کو مطمئن کر دے گا۔ کیونکہ سب جانتے تھے، شبانہ سحر اپنی ایک ذاتی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ شوقیہ کالم لکھتی تھی اس لئے باقاعدہ اس کے کالم شائع نہیں ہوتے تھے لیکن سوئے اتفاق کہ اس روز اصلی شبانہ سحر دفتر میں موجود تھی۔ یہ صورتِ حال سحر بخاری کے لئے خاصی حوصلہ افزا تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اصلی شبانہ سحر سے ملنے کے بعد اس کی بیوی کا ذہن صاف ہو جائے گا لیکن نتیجہ بالکل الٹ ہو گیا۔

نازنین کے ذہن میں چونکہ شک کا پودا جڑ پکڑ چکا تھا لہٰذا وہ یہی سمجھی کہ بخاری نے اسے اطمینان دلانے کے لئے کسی فرضی شبانہ سحر کا بندوبست کیا ہے۔ اس کا شک اور زیادہ پختہ ہو گیا۔ اس کے بعد گھر میں ان کے درمیان اکثر جھگڑا رہنے لگا اور ''

وٹنس باکس میں کھڑے سحر بخاری کی برداشت جواب دے گئی۔ قطع کلامی کرتے ہوئے اس نے بڑے جارحانہ انداز میں مجھ سے پوچھا۔

''آپ کو یہ ساری فضول باتیں کس نے بتائی ہیں؟''

''واصف علی نے!'' میں نے نہایت ہی متحمل لہجے میں جواب دیا۔

وہ بپھرے ہوئے انداز میں چیخ اٹھا۔ ''کون واصف علی؟''

''کمال ہے، آپ واصف علی کو نہیں جانتے سحر بخاری صاحب؟'' میں نے کہا۔

''اس شہر میں سینکڑوں ہزاروں واصف اِدھر سے اُدھر جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں!''

''میں سینکڑوں ہزاروں کی نہیں بلکہ اس واصف کی بات کر رہا ہوں جو آپ کے اخبار میں کام کرتا ہے۔ سب ایڈیٹر واصف علی!''

''اچھا وہ... جو سبنگ کرتا ہے۔'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا۔

اس کے انداز نے مجھے بتا دیا کہ وہ واصف علی کے لئے اپنے دل و دماغ میں بے پناہ عناد رکھتا تھا۔ میں نے سلگانے والے لہجے میں کہا۔ ''بخاری صاحب! سب ایڈیٹر سبنگ نہیں کرے گا تو پھر کیا کرے گا؟''

''اب تو میں اسے بتاؤں گا کہ سبنگ کیا ہوتی ہے!'' وہ پھنکارا۔

''بخاری صاحب! یہ نہ بھولیں کہ آپ اس وقت ایک عدالت کے کمرے میں کھڑے ہیں اور جج صاحب بھی یہاں موجود ہیں۔'' میں نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ ''آپ کے ان سخت الفاظ میں سے دھمکی کی بُو آ رہی ہے۔''

وہ یک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ صورتِ حال کی سنگینی کو اس نے فوراً محسوس کر لیا تھا اور اسے اپنی نازک پوزیشن کا احساس ہو گیا تھا۔ جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

''بیگ صاحب! آپ شبانہ قمر والی کہانی کو زیرِ سماعت مقدمے کے ساتھ نتھی کرنے والے تھے، اس کا کیا ہوا؟''

''جناب! میں اسی طرف آ رہا ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

اس کے بعد میں نے اپنے سوالات کے زاویے کو تبدیل کر دیا۔ اب موجودہ کیس اور بخاری کی ذات میرا خصوصی ٹارگٹ تھے۔

''بخاری صاحب! کیا یہ درست ہے کہ وقوعہ کی رات آپ ایک بھاری رقم لے کر گھر آئے تھے؟''

''ہاں، درست ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''کل کتنی رقم تھی اور نوٹ کس مالیت کے تھے؟''

''وہ سو روپے والی گڈیوں پر مشتمل ڈیڑھ لاکھ کی رقم تھی۔''

''آپ کا خیال ہے ملزم وہ تمام کی تمام رقم چرا کر لے گیا تھا؟''

''خیال کیا، میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے نوٹوں کی گڈیاں اٹھا کر فرار ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اسے احساس نہ ہونے دیا کہ وہ میرے بچھائے ہوئے جال میں قدم ڈال چکا تھا۔ میں نے کہا۔ ''کیا آپ کو پتہ نہیں، اتنی بڑی رقم گھر میں نہیں رکھنی چاہئے؟''

''رقم کو بینک میں رکھا جاتا ہے یا پھر تجوری میں۔'' وہ تلخی سے بولا۔ ''آپ کے خیال میں مجھے وہ رقم روڈ پر رکھ دینا چاہئے تھی؟''

''آپ ناراض نہ ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''آپ کی رقم تھی، آپ جہاں بھی رکھیں، مرضی آپ کی۔''

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''آپ نے پولیس کو اور معزز عدالت کے رو بہ رو یہ بیان دیا ہے کہ آپ مقتولہ کی چیخ و پکار سن کر بیڈ روم کی طرف لپکے تو آپ نے ملزم کو نوٹوں کی گڈیاں اور زیورات کے باکس کے ساتھ اندر سے نکلتے دیکھا۔ آپ کی جرأت کے طفیل زیورات والے باکس تو اس کے ہاتھ سے گر گئے لیکن وہ نوٹوں والی گڈیاں لے کر رفو چکر ہو گیا۔ میں کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟''

''آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔''

''اور اس بات پر بھی آپ ڈٹے ہوئے ہیں کہ ملزم آپ کی ساری رقم چرا کر لے گیا تھا؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ میں نے اسے چھیلنا شروع کیا۔

''بخاری صاحب! اب ذرا ہم نوٹوں کی گڈیوں کی طرف آتے ہیں۔ سو کے نوٹوں والی ایک گڈی میں دس ہزار روپے ہوتے ہیں یعنی ایک لاکھ کی رقم دس گڈیوں میں سمائے گی اور اسی حساب سے ڈیڑھ لاکھ روپے پندرہ گڈیوں میں آئیں گے۔ اب ذرا سوچ سمجھ کر منہ کھولیں اور معزز عدالت کو بتائیں کہ کیا عملاً یہ ممکن ہے ...''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا اور تھوڑے توقف کے بعد قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص اپنے دونوں ہاتھوں کو استعمال کرتے ہوئے پندرہ گڈیاں نوٹوں کی اور چند زیورات کے ڈبے لے کر فرار ہو رہا ہو تو ایک دھکا کھا کر اس کے ہاتھوں سے زیورات والے ڈبے تو چھوٹ جائیں لیکن پندرہ گڈیاں اس کے ہاتھوں میں موجود رہیں۔ اور پھر وہ افراتفری کے عالم میں ان پندرہ گڈیوں کے ساتھ پلٹ کر فائر بھی کر

دے۔ کیا ایسی صورتِ حال میں وہ اپنی کسی جیب میں سے ریوالور نکال سکتا ہے؟ بھاگتے ہوئے ایک شخص سے ڈیڑھ لاکھ کی رقم اور وہ بھی پندرہ گڈیوں کی شکل میں سنبھالنا کیسے ممکن ہے؟''

''انسان ارادہ کر لے تو سب کچھ ممکن ہو جاتا ہے۔'' وہ کمال ڈھٹائی سے بولا۔

''کیا آپ معزز عدالت کے سامنے ایسی ہی ایک کوشش کر کے دکھا سکتے ہیں؟''

وہ متاملانہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس روز میں عدالت جاتے ہوئے ایک بیگ بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس بیگ میں، میں نے خاص آئٹمز تیار کر رکھے تھے۔ میں نے وہ بیگ کھول لیا اور اس کے آئٹمز کو باہر نکال کر میز پر رکھ دیا۔ وہ طلائی زیورات کے چار خالی باکس تھے۔ اس کے علاوہ سو کے نوٹوں کے سائز کی پندرہ گڈیاں تھیں۔ وہ تمام گڈیاں اخبار کو کاٹ کر تیار کی گئی تھیں اور اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ گڈیوں کا سائز اور وزن اصل گڈیوں کے برابر رہے۔ ایک تیسری چیز بھی بیگ میں موجود تھی۔ اور وہ تھا ایک کھلونا ریوالور۔ میں نے جج کی طرف روئے سخن موڑتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں ایک چھوٹا سا دلچسپ کھیل پیش کرنا چاہتا ہوں۔''

وکیل استغاثہ فوراً بول اٹھا۔''یہ عدالت کا کمرہ ہے۔ کوئی تماشا گاہ نہیں۔''

اس کی مریل سی آواز سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ ان نتائج کی سنگینی کو اچھی طرح محسوس کر چکا تھا جو میرے بتائے ہوئے کھیل کے آخر میں برآمد ہوتے۔ تاہم جج نے اس کے اعتراض کو توجہ کے لائق نہ سمجھا اور مجھے اپنی خواہش پوری کرنے کی اجازت دے دی۔

میں نے استغاثہ کے گواہ سحر بخاری کو کٹہرے سے باہر بلایا اور خود بھی میز کے قریب پہنچ گیا۔ جب وہ میرے پاس آیا تو میں نے وہ کھلونا ریوالور اس کی پتلون کی جیب میں ٹھونس دیا پھر تحکمانہ انداز میں کہا۔

''تم میز پر موجود زیورات والے خالی باکس اور پندرہ نوٹوں کی گڈیاں دونوں ہاتھوں میں سمیٹ کر دروازے کی جانب بڑھو۔ میں تمہارے ہاتھوں پر جھپٹ کر ان چیزوں کو چھیننے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم اپنی آسانی کے لئے زیورات والے باکس ہاتھوں سے گرا دینا اور پندرہ نوٹوں کی گڈیاں سنبھال کر اس طرح عدالت کے کمرے سے فرار ہونے کی کوشش کرنا کہ پلٹ کر تم کو جیب سے کھلونا ریوالور نکال کر مجھ پر فائر بھی کرنا ہے۔''

ایک لمحے کے توقف سے میں نے مذاق کے رنگ میں کہا۔''مسٹر بخاری! کہیں تمہاری

کسی جیب میں کوئی اصل ریوالور تو موجود نہیں؟ تمہاری نظر میں، میں اس وقت تک جتنا خطرناک ہو چکا ہوں، اس کے پیشِ نظر تم مجھے شوٹ بھی کر سکتے ہو جیسا کہ تم نے۔۔۔''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا اور اس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔''کم آن مسٹر بخاری!''

جج چونکہ اس کھیل کو پیش کرنے کی اجازت دے چکا تھا اس لئے بخاری کے پاس کوئی جائے فرار نہیں تھی۔ اس کے بیان نے خود اس کے پاؤں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا دی تھی۔ وہ چاروناچار آگے بڑھا اور میرے احکام کی تعمیل کرنے لگا۔

وہ بڑا مضحکہ خیز منظر تھا۔ وہ چار ڈبوں اور پندرہ گڈیوں کو دونوں ہاتھوں میں سمیٹنے کی کوشش کرتا اور وہ اس کے قابو میں نہیں آ رہے تھے۔ دس منٹ کی جان توڑ کوشش کے بعد وہ اس مشن میں اس طور کامیاب ہو گیا کہ اس نے چاروں باکس اوپر تلے رکھ کر ان کے اوپر وہ تمام گڈیاں رچا دیں اور انہیں دونوں ہاتھوں کی باہمی مدد سے اینٹوں کی مانند اٹھا لیا۔

میں نے کہا۔''بخاری! اس سامان کو اس طرح اٹھا کر بھاگنا تو درکنار، تم آہستہ آہستہ بھی آگے نہیں بڑھ سکتے اور جہاں تک میرے جھپٹا مارنے کا تعلق ہے تو یہ تو دور کی بات ہے، مجھے یقین ہے اگر میں تمہیں صرف جھکائی بھی دوں تو تم بازی ہار جاؤ گے۔ کہو تو میں جھکائی دوں؟''

اس نے یک بہ یک وہ تمام چیزیں کمرے کے فرش پر پھینک دیں اور چراغ پا ہوتے ہوئے بولا۔''یہ آپ نے مجھے کس مصیبت میں پھنسا دیا ہے؟''

''جس مصیبت میں تم نے میرے مؤکل کو گزشتہ چار ماہ سے پھنسا رکھا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔''تمہیں کچھ احساس بھی ہے کہ تم نے اپنے ایک جھوٹ سے اس غریب کی زندگی کو کس سولی پر چڑھا رکھا ہے؟''

اس کے پاس میرے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا لہٰذا وہ خجالت آمیز نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھنے لگا جو اس وقت خلا میں کسی نامعلوم نقطے کو گھور رہا تھا۔ میں نے جج کی طرف رخ پھیرتے ہوئے باآوازِ بلند کہا۔

''جنابِ عالی! ایک چھوٹے سے تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ میرے مؤکل کے خلاف جو استغاثہ عدالت میں پیش کیا گیا ہے وہ جھوٹ کے پلندے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ میں معزز عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ مقتولہ کے شوہر اور استغاثہ کے سب سے بڑے گواہ

مسٹر سحر بخاری کو پولیس کی کسٹڈی میں دینے کے احکام جاری کئے جائیں تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس نے اپنی غلط بیانی سے اتنے لوگوں کو کیوں مشکل میں ڈال رکھا ہے؟''

میں ایک لمحے کے لئے سانس لینے کو رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔''جناب عالی! میرا مؤکل بے گناہ اور بے قصور ہے۔ اسے ایک گہری سازش کے تحت چوری اور جھوٹ کے مقدمے میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر پولیس سحر بخاری پر سختی کرے تو اس کیس کی ایک اور ہی شکل نکل کر سامنے آئے گی۔''

''پولیس مجھے ہاتھ بھی نہیں لگائے گی۔'' بخاری دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔''کیوں......؟ کیا تمہارے اندر چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ دوڑ رہا ہے یا تم بخاری سے بخار میں بدل چکے ہو؟''

اس نے میرے استفسارات پر کوئی تبصرہ نہ کیا اور اچانک دروازے کی جانب دوڑ لگا دی۔ اس کی یہ اضطراری حرکت ثابت کرتی تھی کہ اس نے اپنے انجام کو برپا ہونے سے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ کمرے کے دروازے پر موجود عدالتی پولیس کے عملے نے اسے فوراً گرفتار کر لیا۔

پولیس کی کسٹڈی میں سحر بخاری نے جو بیان دیا وہ میرے اندازوں اور دلائل پر پورا اترتا تھا۔ اس نے اپنی بیوی نازنین کے قتل کا اعتراف کرتے ہوئے بتایا کہ نازنین اس کی راہ کا سب سے بھاری پتھر ثابت ہو رہی تھی۔ شبانہ قمر کی طرف سے کسی بھی صورت اس کا ذہن صاف نہیں ہو رہا تھا اور اس نے بخاری کو دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے ایک ہفتے کے اندر اندر شبانہ قمر کو طلاق دے کر اس سے ہر تعلق قطع نہ کیا تو وہ اپنے طاقتور سیاست دان بھائی کو صورتِ حال سے آگاہ کر دے گی۔

سحر بخاری، مقتولہ کے سابق شوہر کے انجام سے آگاہ تھا۔ اگر اس کے سالے کو اس کے کرتوتوں کی خبر ہو جاتی تو اس کی زندگی ایک دردناک عذاب سے دوچار ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے نازنین جیسے سنگِ گراں کو اپنے راستے سے صاف کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ پھر جب میرا مؤکل چوری کی نیت سے اس کے بنگلے میں داخل ہوا تو اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی بیوی کو شوٹ کر دیا۔

شاید وہ یہ سوچ رہا تھا کہ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔ لیکن بانسری کا تو کام ہی بجنا ہے، وہ ہر حال میں بج کر رہتی ہے اور بعض اوقات ایسی دھوم دھام سے بجتی ہے کہ بندے کا باجا بجا کر رکھ دیتی ہے۔

میرا مؤکل شاکر سزا سے بچ نہ سکا۔ تاہم یہ سزا بہت معمولی سی تھی اور اس کو اقدامِ سرقہ کے ذیل میں سنائی گئی تھی۔ وہ قتل کے الزام میں جیل میں سڑنے سے بچ گیا تھا۔ اب اس چھوٹی سی سزا کا ذکر کر کے میں اسے شرمندہ نہیں کرنا چاہتا۔

ویسے ایک بات میں آپ کو بتاتا چلوں کہ اس نے آئندہ کے لئے چوری چکاری اور ہیرا پھیری سے پکی توبہ کر لی تھی۔ سحر بخاری کے لئے سنگِ گراں ثابت ہونے والی مقتولہ نازنین شاکر کے لئے ایک مثبت اور خوشگوار زندگی کا وسیلہ ثابت ہوئی تھی۔
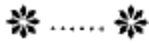
شامتِ مال

شخصیت کے تاثر سے انکار ممکن نہیں!

بعض لوگوں کو دیکھتے ہی فرحت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ آپ کے شناسا ہوں یا نہ ہوں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان سے ملنے، بات کرنے اور تعلق بڑھانے کو جی چاہتا ہے۔ اس کے برخلاف ایسے افراد کی بھی کمی نہیں جن کی صورت پر نگاہ پڑتے ہی دل بجھ جاتا ہے۔ طبیعت میں بیزاری اور اُکتاہٹ اُبھرنے لگتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کسی نہ کسی مجبوری کے تحت انہیں برداشت کر رہے ہوں۔ اس عورت کی شخصیت بھی ایسی ہی تھی۔

وہ بڑی رعونت سے میرے چیمبر میں داخل ہوئی، نگاہ دوڑا کر در و دیوار کا جائزہ لیا پھر پیور لیدر بیگ کو ایک ادا سے میری میز پر پٹخنے کے بعد کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا پھر سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''جی فرمایئے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

عموماً جب کوئی کلائنٹ مجھ سے ملنے آتا ہے تو نگاہوں کے تبادلے کے بعد رسمی علیک سلیک کا مرحلہ طے ہوتا ہے پھر گفتگو کی نوبت آتی ہے۔ لیکن اس عورت کے انداز و اطوار نے ہیلو ہائے کی گنجائش پیدا ہی نہیں ہونے دی۔ اس کے اسٹائل کو دیکھتے ہوئے میں بھی یکدم اندر سے کھنچ سا گیا تھا۔ میرے استفسار کے جواب میں اس نے کہا۔

''وکیل صاحب! کیا نام ہے آپ کا؟''

میں نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔ ''مرزا امجد بیگ!''

''ہاں، بیگ صاحب!'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں بولی۔ ''خدمت تو میں آپ کی کروں گی اور وہ بھی آپ کی ڈیمانڈ کے مطابق لیکن پہلے یہ معلوم ہو جائے، آپ کس قسم کے وکیل ہیں؟''

اس کا انداز طبیعت کو مکدر اور خیالات کو پراگندہ کر دینے والا تھا۔ تاہم میں نے اپنی

ناگواریت کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ پبلک ڈیلنگ سے متعلق افراد کا ہر مزاج اور فطرت کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے لہٰذا بہت زیادہ صبر و برداشت کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔

میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''آپ کو کس قسم کا وکیل درکار ہے؟''

''ایسا'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ ''جو فیس اپنی مرضی کی لے اور کام میری مرضی کے مطابق کرے۔'' اس نے ایک لمحے کا توقف کرتے ہوئے یہ اضافہ بھی کر دیا۔ ''اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنے کام کا ماہر بھی ہو۔ یعنی عدالت میں اپنے کلائنٹ کو کامیابی بھی دلا سکتا ہو۔''

''تو پھر میں یہی کہوں گا خاتون!'' میں نے گمبھیر آواز میں کہا۔ ''آپ ایک غلط جگہ پر آ گئی ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' اس نے بھنوئیں اچکائیں۔

''مطلب یہ ہے کہ میں آپ کے مطلوبہ وکیل کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔'' میں نے دو ٹوک الفاظ میں وضاحت کر دی۔ ''آپ کی بیان کردہ بہت سی خصوصیات مجھ میں نہیں پائی جاتیں۔''

''میں سمجھی نہیں، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''میں اپنے موکل کو کامیابی دلانے کے لئے عدالت میں اپنی بہترین صلاحیتوں کو ضرور آزماتا ہوں لیکن جہاں تک کیس پکڑنے اور کام کرنے کا تعلق ہے، وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔''

''آپ سمجھائیں گے تو ضرور سمجھ میں آئے گا۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''میں نے آپ کی بہت تعریف سن رکھی ہے اور میرا خیال ہے، میں غلط جگہ پر نہیں آئی۔ آپ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کرنے کے ہنر سے واقف ہیں۔''

بات ختم کرتے ہی وہ معنی خیز انداز میں خفیف سا مسکرائی تو مجھے معلوم ہوا، وہ مسکرانا بھی جانتی ہے۔ اب وہ پہلے والی اکھڑ مزاج اور افلاطون عورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کے بدلے ہوئے انداز سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اسے اپنے چہرے کے تاثرات کو تبدیل کرنے میں ملکہ حاصل تھا۔ میں نے نہایت ہی صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''اگر واقعی کسی نے ان الفاظ میں میری تعریف کی ہے کہ میں سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کرنے کا فن جانتا ہوں تو یقیناً ایسا قصیدہ گو میرا کوئی بدخواہ ہی ہو گا۔ بہرحال'' میں نے

تھوڑا توقف کیا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید کہا۔

''کام میں اپنی مرضی اور طریقے سے کرنے کا عادی ہوں اور فیس طے کرتے وقت میں کلائنٹ کی جیب اور استطاعت سے زیادہ کیس کی نوعیت کو دیکھتا ہوں ...... اور طے شدہ فیس حاصل کرنے کے بعد میں سیاہ کو سیاہ اور سفید کو سفید ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر میری بات آپ کی سمجھ میں آ گئی ہو تو اپنے مسئلے کے بارے میں تفصیلاً بتائیں۔''

میں نے رف پیڈ کو اپنے سامنے رکھتے ہوئے قلم سنبھال لیا۔ ''سب سے پہلے تو آپ مجھے اپنا نام بتائیں؟''

بات ختم کرتے ہی میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا تو وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''نادرہ بیگم ...... لوگ مجھے مسز ہارون بھی کہتے ہیں۔ ہارون کا انتقال ہوئے چند سال ہو گئے ہیں لیکن بہر حال، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''فرق نہیں پڑتا'' کے الفاظ اس نے ایسے ادا کئے تھے جیسے اس کا اشارہ انتقال کی بجائے اپنے شوہر کی طرف ہو۔

نادرہ بیگم کی عمر پچپن سے متجاوز تھی۔ صحت نہ زیادہ اچھی اور نہ زیادہ خراب۔ وہ اس وقت فیروزی رنگ کی کام دار بنارسی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ عمر کو کم کرنے کے لئے اس نے اچھا خاصا میک اپ بھی تھوپ رکھا تھا۔ قیمتی ساڑھی، عمدہ میک اپ کے علاوہ کم و بیش آدھا کلوگرام سونا بھی اس کے جسم پر لدا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ ''لدا'' کا لفظ اگرچہ معیوب محسوس ہوتا ہے مگر نادرہ بیگم نے اپنی شخصیت کو دھانسو بنانے کے لئے جس انداز میں حد سے زیادہ زیورات پہن رکھے تھے ان کو دیکھتے ہوئے فوری طور پر یہی لفظ ذہن میں ابھرتا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی آٹھ (انگوٹھوں کو چھوڑ کر) انگلیوں میں نصف درجن سے زیادہ جڑاؤ طلائی انگوٹھیاں موجود تھیں۔ وہ مجھ سے بات کرتے ہوئے اپنی ایک ایسی ہی انگوٹھی سے کھیل بھی رہی تھی جس میں کم از کم آٹھ قیراط کا آبی نیلم جڑا ہوا تھا۔ الغرض اس کی ایک ایک ادا اور جھلک سے امارت ٹپکتی تھی۔

میری نگاہ اس کے سراپا کا احاطہ کر چکی تو میں نے کہا۔ ''اب آپ اپنا مسئلہ بھی بتا دیں۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

''مسئلہ میرا نہیں بلکہ راجا کا ہے۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔

''اور یہ راجا کون ہے؟''

''اوہ ...... شاید میں آپ کو بتانا بھول گئی، راجا میرا بیٹا ہے ...... اکلوتا بیٹا!''

''شاید نہیں بلکہ یقیناً آپ نے ابھی تک مجھے کسی راجا، مہاراجا کے بارے میں نہیں بتایا۔ خیر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے اسی کے انداز میں بے پروائی سے شانے اچکائے اور کہا۔ ''راجا اگر آپ کا بیٹا ہے تو اس کا مسئلہ آپ ہی کا مسئلہ ہوا ناں!''

''اوں ...... آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں بولی۔ لیکن اس تائید میں مصلحت کی آمیزش تھی۔ وہ اس سلسلے میں کسی بحث میں نہیں الجھنا چاہتی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''اب یہ بھی بتا دیں، آپ کا اکلوتا بیٹا کس نوعیت کے مسئلے سے دوچار ہے؟ آپ اسے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے کر آئیں؟''

''ساتھ اس لئے نہیں لا سکی کہ وہ اس وقت پولیس کسٹڈی میں ہے۔''

''اوہ!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

نادرہ بیگم نے کہا۔ ''راجا کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ بہت بے وقوف ہے۔ آج کل کے لڑکوں کی طرح اس میں عیاری اور چالاکی نہیں ہے۔''

اس نے مبہم انداز میں جملہ مکمل کیا تو میں نے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔ ''تو کیا پولیس نے راجا کو محض اس لئے گرفتار کیا ہے کہ وہ چالاک اور عیار نہیں، آپ بھی کیسی عجیب بات بتا رہی ہیں۔''

''اوہ، آپ سمجھے نہیں۔'' وہ گڑبڑا گئی۔ ''میں آپ کو یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ راجا اپنی بے وقوفی کے سبب پولیس کے ہاتھ لگا ہے۔ اگر وہ اپنی عقل کی بجائے میرے مشوروں پر عمل کرتا تو آج اس مصیبت میں گرفتار نہ ہوتا۔''

نادرہ بیگم یا مسز ہارون نے اب تک اپنے مسئلے کے بارے میں جو کچھ بھی بتایا تھا، اس کا سر پیر میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ میں درحقیقت ایک کوفت میں مبتلا ہو گیا اور قدرے کھردرے لہجے میں اس سے براہ راست پوچھ لیا۔

''مسز ہارون! پولیس نے آپ کے بیٹے کو کب اور کہاں سے گرفتار کیا ہے؟''

''آج سہ پہر پانچ بجے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''وہ اس وقت اپنی ایجنسی میں بیٹھا تھا۔''

''آپ کا بیٹا راجا کس قسم کی ایجنسی چلاتا ہے؟''

اس نے بتایا۔ ''شہر کے کاروباری علاقے میں ''راجا ٹریولز'' کے نام سے ہماری ایک ٹریول ایجنسی ہے۔ اس کے علاوہ تھوڑا بہت ریکروٹنگ کا کام بھی چلتا رہتا ہے۔ ویسے ہم مختلف قسم کے ٹورز بھی ارینج کرتے ہیں۔ میرا بیٹا راجا ان تمام امور کو دیکھتا ہے۔''

وہ جن ذمے داریوں کا ذکر کر رہی تھی وہ کسی بے وقوف آدمی کے بس کا روگ نہیں تھا۔ عیار نہ سہی مگر ان تمام کاموں سے نمٹنے کے لئے انسان کا چالاک اور سمجھ دار ہونا بہت ضروری ہے۔ میں نے یہ بات نادرہ بیگم سے بھی پوچھ لی۔

''ماشاء اللہ! آپ کے بیٹے راجا نے تو نہایت ہی اہم ذمے داری اٹھا رکھی ہے اور آپ اسے پتہ نہیں کیا کیا کہہ رہی ہیں۔ بے وقوف ......''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر سوالیہ نظر سے اسے دیکھا تو وہ بوکھلا گئی۔ جلدی سے بولی۔ ''وہ دراصل، میں نے کسی اور وجہ سے اسے بے وقوف کہا تھا۔ خیر، میں آپ کو بعد میں تفصیل سے بتاؤں گی۔ فی الحال فوری نوعیت کا مسئلہ یہ ہے کہ راجا کو پولیس سے چھڑانا ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے، کل اسے عدالت میں پیش کر کے ریمانڈ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی...... میں چاہتی ہوں، آپ اس کوشش کو ابتدائی مرحلے پر ہی ناکام بنا دیں۔ بعد کی بعد میں دیکھ لیں گے۔''

نادرہ بیگم ایک ایسی عورت تھی جسے صرف اپنی کہنے کا شوق تھا، دوسروں کی سننے سے اسے قطعی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں راجا کے بے وقوف ہونے کے حوالے سے گھما پھرا کر اسے جس طرف لایا تھا وہ ایک پل وہاں نہیں ٹھہری تھی بلکہ کنی کاٹ کر دوسری جانب نکل گئی تھی۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی اور ..... اسی بات نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ یقیناً کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ موجود تھی۔

جب کوئی شخص اپنے بیان میں کسی قسم کی ملاوٹ کرتا ہے، حقائق کو چھپاتا ہے یا بگاڑ کر پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے، متعلقہ موضوع سے بدک کر کہیں اور پہنچ جاتا ہے یا غیر متعلق امور کو زیر بحث لے آتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے، وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ڈاکٹر اور وکیل سے جھوٹ بولنے والا شخص ہمیشہ نقصان میں رہتا ہے۔

میں نے چند لمحات تک نادرہ بیگم کی آنکھوں میں دیکھا پھر اسے مقصد کی طرف لاتے ہوئے ضروری سوال کیا۔ ''پولیس نے آپ کے بیٹے کو کیوں گرفتار کیا ہے؟''

''وہ دراصل ایک چھوٹی سی غلطی ہو گئی تھی۔'' وہ متذبذب انداز میں بولی۔

''پولیس کو ..... یا راجا کو؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا مطلب ہے روبی کو ..... یا شاید راجا کو .....؟'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔

''یہ روبی کہاں سے آ گئی؟'' میں نے تعجب خیز انداز میں سوال کیا۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کی اور قدرے سنبھلے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''ٹھہریں،

میں آپ کو ترتیب سے بتاتی ہوں۔'' وہ چند لمحات کے لئے متوقف ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

''بیگ صاحب! قصہ کچھ یوں ہے کہ آج دوپہر راجا کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ ایک لڑکی بھاگ کر سڑک پار کر رہی تھی کہ راجا کی گاڑی کی لپیٹ میں آ گئی۔ اس لڑکی کا نام روبی ہے۔ میں نے راجا اور روبی کے حوالے سے غلط فہمی والی بات اسی لئے کی تھی۔ مجھے تو یہ ایکسیڈنٹ ایک غلط فہمی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ملک کا دستور بھی نرالا ہے! آئے روز سڑکوں پر جتنے بھی حادثات ہوتے ہیں، ان کا ذمہ دار عموماً گاڑی والوں کو ہی ٹھہرایا جاتا ہے۔''

بات ختم کرتے کرتے اس کا لہجہ خاصا زہریلا ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی زبان کھلوانے کے لئے دانستہ تائیدی انداز میں کہا۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں سمجھ سکتا ہوں، اس حادثے میں بھی سراسر قصور روبی ہی کا ہو گا۔ اس نے دوڑ کر سڑک عبور کرنے کی کوشش کی اور راجا کی گاڑی سے ٹکرا گئی۔ اندازے کی غلطی روبی سے ہوئی یا راجا سے، بہرحال اس حادثے کے جرم میں پولیس نے راجا کو گرفتار کر لیا۔''

''اب آپ سمجھے ہیں میری بات کو۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔ ''آپ نے میرے بیٹے کو چھڑانا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''راجا کی گرفتاری یہ ظاہر کرتی ہے، اس حادثے میں روبی کو شدید نقصان پہنچا ہے ورنہ ایسے مواقع پر عموماً پولیس پیدا گیری کے بعد حادثے کے ذمہ دار کو چھوڑ دیتی ہے۔''

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''روبی شدید زخمی ہو کر ہسپتال پہنچی ہے۔''

''کیا راجا حادثے کے بعد جائے وقوعہ پر رک گیا تھا؟''

وہ خجالت آمیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''نہیں ......''

اس کے مختصر اور نامکمل جواب نے بڑی وضاحت سے مجھے بتا دیا کہ وہ اپنے بیٹے کی غلطی سے پوری طرح آگاہ تھی۔ اصولی طور پر حادثے کے بعد راجا کو اپنی گاڑی روک کر صورتِ حال کا جائزہ لینا چاہئے تھا۔ جائے واردات سے حادثے کے ذمہ دار شخص کا فرار اس کے جرم کی سنگینی میں اضافے کا موجب تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''پولیس کو کیسے پتہ چلا، وہ حادثہ راجا کی گاڑی سے رونما ہوا تھا؟''

''روبی نے ہسپتال پہنچنے کے بعد ڈاکٹر کو راجا کا نام اور گاڑی کا نمبر بتا دیا تھا۔'' نادرہ

بیگم وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''ایمرجنسی وارڈ میں پولیس والے تو موجود ہوتے ہی ہیں۔ ڈاکٹر نے پولیس والوں کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ اس کے بعد پولیس نے سرگرمی دکھائی اور پانچ بجے کے قریب راجا کو اس کی ایجنسی میں سے گرفتار کر لیا۔''

نادرہ بیگم کی وضاحت نے میرے اندر ایک تجسس جگا دیا، میں نے اضطراری لہجے میں سوال کیا۔ ''حادثے کا شکار ہونے والی لڑکی روبی کے بیان سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے، وہ آپ کے بیٹے کو اچھی طرح جانتی ہے ورنہ وہ اس کا نام اور گاڑی کا نمبر کیسے بتا سکتی ہے؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ شکست خوردہ لہجے میں بولی۔ ''روبی کچھ عرصہ پہلے راجا کی ٹریول ایجنسی میں کام کر چکی ہے۔''

''اوہ!'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''یہ تو خاصا گمبھیر معاملہ نظر آ رہا ہے۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ روبی کو دیکھنے کے لئے ہسپتال گئی تھیں؟''

''ہاں، گئی تھی۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ کی اس سے کوئی بات ہوئی؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

''وجہ؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''وہ مکمل بے ہوشی میں ہے۔''

''مکمل بے ہوشی میں اس نے ڈاکٹر کو حادثے کے ذمہ دار کے بارے میں کیسے بتا دیا؟''

نادرہ بیگم نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''دو جملے ادا کرنے کے بعد ہی وہ بے ہوش ہوئی ہے۔ لگتا ہے، وہ میرے بیٹے کو پھانسنے کی نیت ہی سے ہسپتال پہنچی تھی۔ اس کے مختصر سے بیان نے راجا کو مصیبت میں ڈال دیا ہے۔''

نادرہ بیگم کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اس حادثے کا قصور وار سراسر روبی کو سمجھ رہی ہو۔ نہ صرف قصور وار بلکہ اس کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا، راجا کو پولیس کے چکر میں ڈالنے کے لئے روبی نے دانستہ حادثے کی فضا پیدا کی تھی۔ ابھی تک اس کیس کے حوالے سے نادرہ نے مجھے جو کچھ بتایا تھا اس میں جگہ جگہ پر تضاد پایا جاتا تھا۔ پہلے اس نے کہا۔ یہ حادثہ ایک غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ اب زور اس بات پر تھا کہ روبی راجا کو پھانسنے کے لئے جان بوجھ کر اس کی گاڑی کے آگے آئی تھی۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر یہ معاملہ سنگین صورت اختیار کر جاتا

تھا۔ کیونکہ نادرہ کے مطابق، روبی کچھ عرصہ پہلے راجا کی ٹریول ایجنسی میں کام بھی کر چکی تھی۔ وہ شدید زخمی حالت میں ہسپتال پہنچی تھی اور ڈاکٹر کو راجا اور اس کی گاڑی کے بارے میں بتا کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ یہ صورتِ حال معاملے کی سنگینی کو کئی گنا بڑھا دیتی تھی۔ اس بارے میں سوچتے ہوئے میرے ذہن میں ایک فوری خیال نے سر اٹھایا...... کہیں یہ اقدامِ قتل کی واردات تو نہیں!

''کس سوچ میں ڈوب گئے بیگ صاحب؟'' نادرہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

اس نے خاصی بے تکلفی سے مجھے ''بیگ صاحب'' کہہ کر مخاطب کیا تو میں اس عورت کے حوالے سے اور زیادہ محتاط ہو گیا۔ جس ماں کا اکلوتا بیٹا پولیس کی حراست میں ہو، وہ اس موقع پر ایسی بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کر سکتی۔ اس کے انداز سے کوئی بڑی گڑبڑ جھلکتی تھی۔ بے تکلفی، بے فکری سے پیدا ہوتی ہے اور وہ موقع نادرہ کے بے فکر ہونے کے لئے ہرگز ہرگز مناسب نہیں تھا!

میں نے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں آپ ہی کے مسئلے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

''مجھے یقین ہے، آپ نے راجا کو اس مصیبت سے نکالنے کا کوئی راستہ تلاش کر لیا ہو گا؟''

''کوشش کر رہا ہوں۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔

اس نے میری میز پر رکھے ہوئے اپنے پیور لیدر بیگ کی طرف ہاتھ بڑھایا پھر اس کی زپ کھول کر پچاس والے نوٹوں کا ایک پیکٹ باہر نکال لیا۔ اس پیکٹ پر بینک کی مخصوص سلپ اور مُہر لگی ہوئی تھی جس کا مطلب تھا پیکٹ میں سے ابھی ایک بھی نوٹ نکالا نہیں گیا۔ وہ پورے پانچ ہزار روپے والی گڈی تھی۔ نادرہ وہ گڈی میری طرف بڑھاتے ہوئے خالص کاروباری انداز میں بولی۔

''یہ ٹوکن رکھ لیں، باقی بعد میں دیکھیں گے!''

اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کسی وکیل کے دفتر میں نہیں بلکہ کسی اسٹیٹ ایجنسی میں بیٹھی ہو اور کسی جائیداد کی خرید کے سلسلے میں مجھے بیعانہ دے رہی ہو۔ میں نے نوٹوں کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا تو اس نے وہ گڈی میرے سامنے میز پر رکھ دی۔

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں فیس طے کئے بغیر کسی کلائنٹ سے رقم نہیں پکڑتا اور یہ ٹوکن وکن یہاں نہیں چلتا مسز ہارون!''

وہ بدستور بے تکلفی سے بولی۔ ''بیگ صاحب! آپ کیس کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے فیس کا تعین کرتے ہیں۔ میں نے تو صرف پانچ ہزار کی انٹری دی ہے۔ فیس کے بارے میں تو آپ مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کریں۔ آپ بہت چوٹی کے وکیل ہیں، ظاہر ہے آپ کی فیس اس رقم سے کہیں زیادہ ہوگی!''

میں نے نوٹوں والا وہ پیکٹ اٹھا کر اپنی میز کی دراز میں رکھا اور دوٹوک انداز میں کہا۔ ''یہ رقم میرے پاس آپ کی امانت ہے۔ اگر کسی وجہ سے میں نے اس کیس میں ہاتھ نہ ڈالا تو یہ روپے آپ کو واپس مل جائیں گے۔''

''ایسی باتیں نہ کریں بیگ صاحب!'' وہ بے تکلفی کا انداز جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''میرے راجا کو آپ ہی نے اس مصیبت سے چھٹکارا دلانا ہے۔''

میں نے گفتگو کو اصل موضوع کی طرف لاتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ''راجا اس وقت کس تھانے میں بند ہے؟''

اس نے متعلقہ تھانے کا نام بتایا اور بولی۔ ''میں ابھی وہیں سے آرہی ہوں۔''

''پولیس والے اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟'' میں نے برسبیل تذکرہ پوچھ لیا۔

''ادھر میں نے معاملہ سیٹ کرلیا ہے۔'' وہ آواز دبا کر رازدارانہ انداز میں بولی۔

میں نے الجھن بھری نظر سے اُسے دیکھا۔ ''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''بیگ صاحب! آپ ان رشوت خور پولیس والوں کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔'' وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میں نے تھانے دار کی مٹھی گرم کر کے اسے اس بات کے لئے آمادہ کرلیا ہے کہ وہ راجا پر بہت ہی ہلکی دفعہ لگائیں گے۔ لہٰذا عدالت سے اسے چھڑانا بہت آسان ہوگا۔''

اس کیس میں ہلکی اور بھاری دفعہ کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ حادثے کا شکار ہونے والی لڑکی نے جو مختصر سا بیان دیا تھا وہ کیس کی نوعیت اور حادثے کی سنگینی کو واضح کرتا تھا۔ اگر اس سلسلے میں نادرہ نے واقعی کسی پولیس والے کی مٹھی گرم کی تھی اور اس نے نادرہ کو یقین دلایا تھا کہ وہ راجا پر کوئی آسان دفعہ لگائے گا تو پھر اس کا یہی مطلب تھا، نادرہ کو بے وقوف بنا کر ایک بھاری رقم بٹور لی گئی تھی، جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔

میں نے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی اس خوش گمان عورت سے کہا۔ ''جب آپ نے رقم کھلا کر پولیس کو اپنے حق میں ہموار کر ہی لیا ہے تو پھر آپ میرے جیسے بھاری فیس والے وکیل کے چکر میں کیوں پڑتی ہیں؟ یہ کام تو کوئی اپرنٹس وکیل بھی آسانی سے کرلے گا۔'' میں ایک

لمحے کو متوقف ہوا پھر قدرے تلخ لہجے میں کہا۔ ''بلکہ اگر پولیس والے چاہتے تو اس معاملے کو رفع دفع بھی کرسکتے تھے، خاص طور پر اس صورت میں کہ آپ رقم خرچ کرنے کے سلسلے میں کنجوس نہیں ہیں۔''

میرے آخری جملے نے اسے خوش کر دیا۔ اور یہ خوشی اس سے چھپائے نہ چھپی۔ اپنی دریا دلی کے حوالے سے چند جملے سننے کے بعد اس نے کہا۔ ''میں کوئی رسک لینے کو تیار نہیں ہوں بیگ صاحب! لہٰذا کسی رنگروٹ وکیل کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ راجا کا یہ کیس آپ ہی ڈیل کریں گے اور جہاں تک پولیس والوں کی بات ہے تو میں نے اس سلسلے میں کوشش کر کے دیکھ لی ہے۔''

وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوئی تو میں نے پوچھ لیا۔ ''پھر انہوں نے کیا جواب دیا؟''

''وہ کہتے ہیں، دعا اور دوا دونوں کی ضرورت ہے!'' نادرہ نے معنی خیز انداز میں بتایا۔ ''میں دعا کرآئی ہوں، دوا آپ کریں گے بیگ صاحب! تھانے دار نے مجھے بتایا، راجا کو وہ چھوڑنے کی پوزیشن میں نہیں رہے۔ روبی نے جب ڈاکٹر کو راجا اور اس کی گاڑی کے بارے میں بتایا تو اس وقت ایک دو اور افراد بھی وہاں موجود تھے لہٰذا اس کیس کو دبایا نہیں جا سکتا۔ راجا کو عدالت ہی سے بری کروایا جا سکتا ہے ..... اور یہ کام آپ کریں گے۔'' بات ختم کرتے ہی وہ امید بھری نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں سمجھ گیا، پولیس والوں نے اپنی جیب گرم کر کے اسے ٹرخا دیا تھا۔ راجا پولیس کسٹڈی میں تھا اور اگر وہ اسے اگلی صبح عدالت میں پیش کرنے کا ارادہ رکھتے تھے تو اس کا ایک ہی مطلب تھا، وہ ریمانڈ لینے کی کوشش کریں گے تاکہ اس کیس کی تحقیق ہو سکے کہ وہ اتفاقی حادثہ تھا یا اقدام قتل۔ مجھے یقین تھا، روبی کے بیان کی روشنی میں اس واقعے کو اتفاقی حادثہ ثابت کرنا آسان نہیں تھا لہٰذا یہی کہا جا سکتا تھا، پولیس نے نادرہ کو وعدۂ فردا پر ٹہلا کر اپنا اُلّو سیدھا کرلیا تھا!

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں دفتر سے اٹھنے کے بعد سیدھا تھانے جا کر آپ کے بیٹے سے ملاقات کروں گا۔ اس کے بعد دیکھتے ہیں کیا صورت سامنے آتی ہے۔''

''یہ کیس آپ ہی کو ڈیل کرنا ہے بیگ صاحب!'' وہ اصراری لہجے میں بولی۔

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، دیکھتا ہوں۔''

وہ اپنی گولڈن چین والی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولی۔ ''آپ کب تک دفتر سے

الجھیں گے؟"

میں نے کہا۔"جب بھی فارغ ہو جاؤں۔ باہر انتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو نمٹانا ضروری ہے۔"

اس نے ایک مرتبہ پھر اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری جانب بڑھا دیا پھر بولی۔"آپ راجا سے ملاقات کر لیں تو مجھے گھر کے نمبر پر فون کر لیجئے گا۔ میں آپ کی کال کا بڑی شدت سے انتظار کروں گی۔" آخری جملہ اس نے ایک مخصوص انداز میں ادا کیا تھا۔

میں نے اس کے ادا و انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے وزیٹنگ کارڈ پر نگاہ دوڑائی۔ وہ "راجا ٹریولز" کے حوالے سے نادرہ بیگم کا تعارفی کارڈ تھا جس میں اس کا عہدہ چیف ایگزیکٹو کا تھا۔ میں نے کارڈ پر سے نظر ہٹا کر اس کی طرف دیکھا تو اس نے کہا۔

"دراصل یہ ٹریول ایجنسی ہارون نے اپنی زندگی میں قائم کی تھی۔ راجا بھی اپنے باپ کے ساتھ کام کرتا تھا لیکن ہارون کے انتقال کے بعد ساری ذمہ داری اس کے کندھوں پر آ گئی۔ لیکن اللہ کا شکر ہے ہمیں کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ہارون نے کام کو اس طرح سیٹ کر رکھا تھا کہ راجا کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ میں عملاً ایجنسی کے کسی کام میں نہیں ہوں، بس راجا کے اصرار پر میں نے یہ اعزازی عہدہ قبول کر لیا ہے۔"

اس کا اشارہ "چیف ایگزیکٹو" والے عہدے کی طرف تھا۔ میں نے مذاق کے رنگ میں کہہ دیا۔"مگر اس پر کہیں لکھا ہوا نہیں؟" میں نے وزیٹنگ کارڈ کو اسے دکھاتے ہوئے کہا۔

"میرے نام کے نیچے لکھا ہوا تو ہے!" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔

میں نے کہا۔"ہاں، چیف ایگزیکٹو لکھا تو دکھائی دے رہا ہے!"

"پھر؟" اس کی الجھن دوچند ہو گئی۔

میں نے اسی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔"اس عہدے کے ساتھ "اعزازی" کہیں لکھا نظر نہیں آ رہا۔"

وہ بے ساختہ مسکرا دی پھر بڑی لگاوٹ سے بولی۔ "بیگ صاحب! آپ بڑا معیاری مذاق کرتے ہیں۔ آپ کی اس بات نے مجھے خاصا محظوظ کیا ہے۔"

"کمال ہے، میں نے ایک سنجیدہ بات کی ہے اور آپ اسے مذاق سمجھ رہی ہیں۔" میں نے قدرے شکایتی لہجے میں کہا۔

وہ ایک مرتبہ پھر دل آویز انداز میں مسکرائی اور بولی۔"یہ پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ مذاق ہے۔"

"شاید آپ کو معلوم نہیں، مختلف رسائل و جرائد کے ادارتی صفحے پر اسی قسم کی ایک پوسٹ ہوتی ہے جہاں بڑے واضح حروف میں "مدیر اعزازی" لکھا ہوتا ہے۔ اس عہدے کا حامل شخص بھی عملاً پرچے کے کسی کام میں نظر نہیں آتا لیکن بہرحال، نہایت ہی پابندی کے ساتھ اس کا نام ادارتی پینل میں موجود رہتا ہے۔ آج تک یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ آیا وہ شخص اس پرچے کے لئے باعث اعزاز ہوتا ہے یا پھر اس کی عزت و توقیر پرچے کی رہین منت!"

"یہ بات واقعی مجھے معلوم نہیں تھی۔" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔"دراصل میں رسائل وغیرہ نہیں پڑھتی ہوں۔ میں نے سنا ہے، ہمارے ملک کے رسائل میں بڑی فضول اور بے ہودہ کہانیوں کو شائع کیا جاتا ہے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے بڑی رسانیت سے کہا۔"جس طرح ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اسی طرح ہمارے ملک میں شائع ہونے والے تمام رسائل و جرائد غیر معیاری نہیں ہیں۔ معیاری رسائل کا مطالعہ بہت مفید اور ضروری ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ مجھے چند معیاری رسائل کے نام بتایئے گا۔" وہ سرسری لہجے میں بولی۔"میں انہیں ٹرائی کر کے دیکھوں گی۔"

اس کے عدم دلچسپ انداز کو دیکھتے ہوئے میں نے روا روی میں کہہ دیا۔"میں آپ کو بتاؤں گا!" پھر میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اسے تھما دیا اور کہا۔"رکھ لیں۔ اس پر میرے گھر اور آفس کے فون نمبرز موجود ہیں۔"

اس کے بعد وہ میرے دفتر سے رخصت ہو گئی۔

❋❋❋

راجا کا پورا نام جاوید راجا تھا۔ عمر لگ بھگ تیس سال رہی ہو گی۔ قد پانچ فٹ دس انچ، جسم مائل بہ فربہی اور شکل و صورت اوسط درجے کی۔ اس نے اپنی آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا جس کا نمبر تین سے اوپر کا تھا۔ میں آزمودہ کار طریقے اپنا کر اس سے ملاقات کرنے حوالات تک پہنچ گیا۔

میں نے اسے مخاطب کیا تو اس نے بیزاری سے میری طرف دیکھا۔ وہ اس وقت حوالات کے ٹھنڈے فرش پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''میرا نام مرزا امجد بیگ ہے۔ میں ایک ایڈووکیٹ ہوں۔ تمہاری والدہ نے مجھے تمہارا وکیل مقرر کیا ہے۔''

''اوہ، وکیل صاحب!'' یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے وہ بڑی وارفتگی سے آگے بڑھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ مجھ سے بغل گیر ہونے کا ارادہ رکھتا ہو لیکن حوالات کی آہنی سلاخوں نے اس کے ارمانوں کا ستیاناس کر دیا۔

بہرحال اس نے سلاخوں میں سے ہاتھ گزار کر مجھ سے پُر جوش مصافحہ کیا اور جذباتی لہجے میں بولا۔ ''ممی نے مجھ سے کہا تھا، وہ کسی وکیل سے میرے سلسلے میں بات کریں گی۔ پھر پولیس والے مجھے چھوڑ دیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''راجا! پولیس والے جس کو پکڑ لیتے ہیں اسے پھر عدالت سے چھڑایا جاتا ہے۔ تمہیں اپنی آزادی کے لئے تھوڑا صبر کرنا پڑے گا۔''

''مگر ممی نے کہا تھا، فکر و پریشانی والی کوئی بات نہیں؟''

''تمہاری ممی نے بھی کچھ غلط نہیں کہا تھا۔'' میں نے معتدل لہجے میں کہا۔ ''وہ تمہاری رہائی کے لئے ہر کوشش کر رہی ہیں۔ تم صبر کا دامن تھامے رکھو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

وہ قدرے مطمئن ہوتے ہوئے بولا۔ ''ممی نے مجھے بتایا ہے، تھانے والوں نے ان سے معاملہ طے کر لیا ہے، عدالت کے مسائل کو آپ دیکھ لیں گے۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے امید بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''وکیل صاحب! آپ مجھے عدالت سے رہا کروا لیں گے نا؟''

''میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس کے لئے میری ایک شرط ہو گی۔''

''ہاں ہاں، جلدی بتائیں۔ آپ کس شرط کی بات کر رہے ہیں؟'' وہ دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔

میں جواب دینے سے پہلے گہری نگاہ سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ وہ مجھے کہیں سے بھی بے وقوف نظر نہ آیا تاہم میں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ وہ عدم اطمینان کا شکار تھا۔ اس کے اندر مجھے اعتماد کا فقدان نظر آیا اور میرا خیال ہے، اس کی شخصیت اور ذات کی یہ کمی مسز ہارون کی ''مہربانی'' ہی کا نتیجہ تھی۔ اکلوتی اولاد کو بگڑنے میں دیر نہیں لگتی اور اس بگاڑ میں عموماً والدین ہی کا ہاتھ ہوتا ہے۔ پیار لاڈ میں وہ بچے کی جن عادات کو سراہ رہے ہوتے ہیں، بعد میں وہ ایک بڑے وبال کی صورت میں نمودار ہوتی ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے، کھلاؤ سونے کا

نوالہ، دیکھو شیر کی نظر سے!

جاوید راجا کی شخصیت میں مجھے جو خامی نظر آئی وہ یقیناً اس کے والدین ہی کی دین تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''شرط بہت معمولی نوعیت کی ہے!'' وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔ میں نے تھوڑے توقف کے بعد اضافہ کیا۔ ''وعدہ کرو، میں تم سے جو بھی سوال کروں، تم اس کا بالکل درست جواب دو گے!''

''ٹھیک ہے، وعدہ!'' وہ جلدی سے بولا۔ ''اس کے بدلے میں آپ بھی وعدہ کریں کہ مجھے اس جھمیلے سے نکالنے کی پوری کوشش کریں گے!''

''کوشش کرنے کا میں پہلے ہی وعدہ کر چکا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''بہرحال اس مرتبہ پھر وعدہ کرو!'' وہ منتظر نگاہ سے مجھے تکنے لگا کہ میں اس سے کوئی سوال کروں۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہاری ممی تمہیں بے وقوف کیوں سمجھتی ہیں؟''

''پتہ نہیں، کیا بات ہے۔'' وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ''میں تیس سال سے اوپر کا ہو گیا ہوں مگر وہ اب بھی مجھے ایک ننھا منا بچہ ہی سمجھتی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں، میں زندگی کے ہر شعبے میں ان کی انگلی پکڑ کر چلوں!''

''کیا تم اپنی ممی کے مشوروں پر عمل نہیں کرتے ہو؟''

''کرتا ہوں جناب! بالکل کرتا ہوں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

میں نے غیر محسوس انداز میں اسے گھسنا شروع کیا۔ ''تمہاری ممی نے مجھے بتایا ہے، اگر تم اپنی عقل استعمال کرنے کی بجائے ان کے مشوروں پر عمل کرتے تو آج اس مصیبت میں گرفتار نہ ہوتے۔ وہ اس حادثے کو کسی غلط فہمی کا نتیجہ بھی کہہ رہی تھیں۔'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر پوچھا۔ ''حادثہ بھلا کسی اتفاق کا نتیجہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اور یہ بھی بتاؤ، تم نے اپنی ممی کی ایسی کون سی بات نہیں مانی جس کے نتیجے میں تمہیں حوالات کا منہ دیکھنا پڑا؟''

میرے پے در پے سوالات نے اسے بری طرح بوکھلا دیا۔ ''پتہ نہیں، ممی نے ایسی باتیں کیوں کی ہیں!'' پھر وہ متذبذب لہجے میں بولا۔ ''ہو سکتا ہے، ایسا ہی ہوا ہو۔ ممی غلط تو نہیں کہہ سکتی ہیں نا!''

''میں تمہاری رائے جاننا چاہتا ہوں۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

نادرہ بیگم کی باتوں میں مجھے دروغ گوئی اور حقائق پوشی کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔ جاوید راجا سے میں اس قسم کے تنقیدی سوالات محض اس لئے کر رہا تھا کہ اس کیس کو پکڑنے سے پہلے اپنی تسلی کرلوں۔ ویسے ابھی تک میں یہ کیس لینے کے حق میں نہیں تھا۔

جاوید راجا نے سوال کے جواب میں کہا۔ ''میرا خیال ہے ممی نے آپ کو جو کچھ بھی بتایا ہے وہ ٹھیک ہے۔ ان سے بڑا میرا کوئی خیر خواہ نہیں ہوسکتا۔''

''گویا زندگی کے معاملے میں تمہاری اپنی کوئی رائے نہیں ہے؟'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''واقعی، تم ابھی تک اپنی ممی کی انگلی پکڑ کر چل رہے ہو!''

وہ بے ساختہ اپنے دائیں ہاتھ کو گھورنے لگا۔ اس نے مذکورہ ہاتھ کی مٹھی بڑے ڈھیلے ڈھالے انداز میں بند کر رکھی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے تصور میں اپنی ممی کی انگلی تھام رکھی ہو!

میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''مسٹر جاوید راجا! اس کا مطلب ہے گویا تم اپنے وعدے سے پھر رہے ہو؟''

''میں نے بخدا آپ سے کوئی غلط بیانی نہیں کی وکیل صاحب!'' وہ پریشان ہو کر ملتجیانہ انداز میں بولا۔

''اوکے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''میں تمہاری بات کو ہی دُرست مان لیتا ہوں۔'' پھر لمحاتی توقف کے بعد میں نے اضافہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ''اب تم ذرا سوچ کر مجھے بتاؤ، یہ حادثہ کیسے پیش آیا؟ ہم سردست تمہاری ممی کے خیالات کا ذکر گول کر دیتے ہیں۔''

ایک لمحے کی بھی سوچ بچار میں پڑے بغیر اس نے جلدی سے جواب دیا۔ ''میں گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے بالکل صحیح رخ پر جا رہا تھا کہ وہ اچانک سامنے آ گئی۔ میں نے اسے بچانے کی پوری کوشش کی لیکن میں اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا...... اور وہ حادثہ ہو گیا۔''

میں نے پوچھا۔ ''وہ اچانک کہاں سے تمہارے سامنے آ گئی تھی؟ کیا وہ یکایک آسمان سے ٹپکی تھی؟''

''وہ اندھا دھند دوڑتے ہوئے روڈ کراس کر رہی تھی۔'' وہ بات کو نبھاتے ہوئے بولا۔ ''بس مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ اچانک ہی میری گاڑی کے سامنے آ گئی ہو۔''

''ہوں'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''اس سے تو یہی

لگتا ہے روبی اس حادثے کی ذمہ دار ہے۔ تمہارا کوئی قصور نہیں۔'' میں نے بے خبری میں اس کی گھسائی جاری رکھی اور کہا۔ ''تمہاری جگہ اگر کوئی اور بھی گاڑی والا ہوتا تو روبی اسی طرح حادثے کا شکار ہو جاتی۔''

''بالکل...... بالکل......'' وہ جلدی سے بولا۔ ''پتہ نہیں، لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ انتہائی مصروف سڑکوں پر آنکھیں بند کر کے بھاگنے لگتے ہیں...... اور جب کوئی حادثہ ہو جاتا ہے تو پولیس والے گاڑی کے مالک کو پکڑ کر تھانے میں بند کر دیتے ہیں۔ پتہ نہیں ہمارے ملک سے یہ اندھیرا کب ختم ہو گا؟''

''بہت جلد یہ اندھیرا چھٹنے والا ہے!'' میں نے گمبھیر اور معنی خیز انداز میں کہا۔

اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور وہ ہونقوں کی طرح مجھے تکنے لگا۔

میں نے کرید اور ٹٹول کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر راجا! آئی ایم سوری، تمہاری ممی کا ذکر کئے بغیر بات آگے نہیں بڑھ سکتی۔ حالانکہ تھوڑی دیر پہلے میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں کہ تمہاری ممی کو فی الحال ہم ڈسکس نہیں کریں گے۔ تم......''

''کوئی بات نہیں وکیل صاحب!'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ''آپ ممی کا ذکر ضرور کریں۔ میری زندگی کا کوئی ایسا معاملہ نہیں جس میں ممی موجود نہ ہوں۔ وہ میرے لئے بہت اہم ہیں۔''

میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور پوچھا۔ ''تمہاری امی کی زبانی مجھے پتہ چلا ہے کہ بے ہوش ہونے سے پہلے ہسپتال میں روبی نے ڈاکٹر کو تمہارے اور گاڑی کے نمبر کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے وہ تمہیں اچھی طرح جانتی ہے؟''

''جانے گی کیسے نہیں، وہ میری ایجنسی کی ایک معمولی ملازم ہے!'' اس نے گردن اکڑاتے ہوئے کہا۔

جاوید راجا کے جواب نے مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی ممی نے مجھے بتایا تھا، روبی کچھ عرصہ پہلے راجا کی ٹریول ایجنسی میں کام کر چکی ہے۔ ''کام کر چکی ہے'' کا سیدھا سیدھا یہ مطلب نکلتا تھا، اب وہ وہاں ملازمت نہیں کرتی۔ مگر راجا نے جس انداز میں جواب دیا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا وہ تا حال ملازم ہے۔ اتنے بڑے تضاد سے یہی ظاہر ہوتا تھا، اس پورے معاملے میں حد سے زیادہ گڑبڑ پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے ایسا انداز اختیار کیا کہ راجا کو محسوس نہ ہو کہ میں اس معاملے کی تہہ میں اتر چکا ہوں۔ ''جاوید! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

"تمہاری ممی کا کہنا ہے، روبی نے کچھ عرصہ پہلے تمہاری ایجنسی کی ملازمت چھوڑ دی تھی لیکن تم بتا رہے ہو، وہ تمہاری ایجنسی کی ایک معمولی ملازم ہے؟"

اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے، وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ "کک...... کیا واقعی ممی نے یہ بات کی ہے؟"

"تو کیا میں تم سے جھوٹ بولوں گا؟" میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے کہا۔

وہ نگاہ چرا کر دوسری طرف دیکھنے لگا پھر اپنی پیشانی کو مسلتے ہوئے بیزاری سے بولا۔ "پتہ نہیں، میرے دماغ کو کیا ہو گیا ہے۔ ابھی ایک ماہ پہلے ہی تو میں نے اسے ملازمت سے نکال دیا تھا۔ شاید اس واقعے نے میری یادداشت کو بھی متاثر کیا ہے ورنہ...."

"ورنہ...... تمہاری ممی غلط نہیں ہو سکتیں۔" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "اگر انہوں نے کہا ہے، روبی کچھ عرصہ پہلے ایجنسی کی ملازمت چھوڑ چکی ہے تو یہی بات درست ہے۔ ہے ناں؟"

"جج...... جی ہاں۔" وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ "بالکل...... بالکل یہی بات ہے۔"

اب اس میں کسی شک و شبہے کی گنجائش باقی نہ رہی تھی کہ وہ حادثہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت پیش آیا تھا اور اس سازش کے بنیادی کردار جاوید راجا اور اس کی ڈیئرسٹ ممی نادرہ بیگم تھے۔ یہ حقیقت کھل جانے کے بعد تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ میں راجا کو بچانے کے لئے اس کیس میں ہاتھ ڈالتا، تاہم میں نے راجا کی تسلی کے لئے محض اتنا کہہ دیا۔

"تم آرام سے اس حوالات میں یہ رات تو گزار لو۔ صبح اللہ بہتر کرے گا۔"

وہ ناک چڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہاں آرام و سکون کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجھے نہیں امید کہ میں آج رات ایک پل کے لئے بھی سو سکوں گا۔"

"کوئی بات نہیں راجا۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "دکھ اور پریشانی بھی زندگی کا ایک روپ ہے۔ اسے ہنسی خوشی ویل کم کہنا چاہئے۔ لگتا ہے، تمہاری پوری زندگی راحتوں اور آسائشوں میں گزری ہے۔"

وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "یہ میری لائف کا پہلا اپ سیٹ ہے۔"

"فکر نہ کرو۔" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "اس اپ سیٹ کے بعد تمہاری لائف بالکل سیٹ ہو جائے گی۔ تمہاری ممی "سیٹ اپ" بنانے کی پوری کوشش کر رہی ہیں۔"

وہ سمجھا، شاید میں اس کی ممی کی جدوجہد کو سراہ رہا ہوں۔ میں نے اسے خوش فہمی میں مبتلا رہنے دیا اور کسی بھی کاغذ پر کسی بھی نوعیت کے دستخط لینے کی میں نے ضرورت محسوس نہیں کی، حتیٰ کہ میں نے اپنا بریف کیس کھولنا بھی گوارا نہ کیا۔

میں جانے کے لئے مڑنے لگا تو اس نے ایک مرتبہ پھر حوالات کی سلاخوں میں سے ہاتھ باہر نکالا۔ وہ مجھ سے رخصتی مصافحہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے نرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ بڑی مضبوطی سے میرے ہاتھ کو تھام کر جذباتی لہجے میں بولا۔

"وکیل صاحب! میں نے آپ سے بڑی توقعات باندھ لی ہیں۔"

اسی وقت عقب سے ایک کانسٹیبل کی کھردری آواز ابھری۔ "آپ ہماری نوکری تیل کرنے کے چکر میں کیوں پڑے ہیں؟ تھوڑا بہت عدالت کے لئے بھی بچا لیں۔ کیا سب کچھ یہیں پوچھ لیں گے؟"

بات ختم کرتے ہوئے وہ ہمارے نزدیک پہنچ گیا۔ یہ وہی "ضرورت مند" کانسٹیبل تھا جسے میں نے بابائے قوم کی جھلک دکھا کر حوالاتی سے علیحدگی میں ملاقات کے لئے ہموار کیا تھا۔ اس دوران وہ حالات کے دوسرے سرے پر دروازے کے پاس کھڑا رہا تھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اگر ہماری بات سے تمہاری نوکری تیل ہوتی ہے تو ناراض ہونے کے بجائے تمہیں خوشی کا اظہار کرنا چاہئے۔ نوکر سے بہتر ہے، آدمی تیل والا ہو جائے۔ تم جانتے ہو، تیل والے ملک کتنے آسودہ ہیں؟"

میں نے سوالیہ انداز میں بات ختم کی تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ بڑے واہیات لہجے میں بولا۔ "وکیل صاحب! آپ بڑا مشکل مخول کرتے ہیں۔ ادھر انچارج صاحب نے میرا خون پی رکھا ہے۔"

"اچھا!" میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہارے انچارج صاحب کب سے خون نوش ہو گئے؟"

"او جی، سمجھا کریں ناں!" وہ ٹپٹا کر بولا۔ "میں نے اس جہنم کی آگ کو تھوڑا بہت ٹھنڈا کرنے کے لئے آپ کو حوالاتی سے تنہائی میں بات چیت کرنے کا موقع دے دیا۔" اس نے اپنے پاپی پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ادھر انچارج صاحب اس بات پر خفا ہیں۔ وہ آپ کو فوراً بلا رہے ہیں۔"

اس کانسٹیبل کی توند غیر معمولی طور پر ابھری ہوئی تھی۔ جب اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جہنم کی آگ کا ذکر کیا تو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی گناہ کو پروان چڑھانے

کے لئے مٹھی چاپی کر رہا ہو۔ میں نے تمسخرانہ انداز میں اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

''چلو بھئی، تمہارے انچارج صاحب سے بھی مل لیتے ہیں۔''

کانسٹیبل مجھے تیار دیکھتے ہوئے واپسی کے لئے مڑا تو میں نے الوداعی نظر سے راجا کو دیکھا اور حوالات سے باہر آ گیا۔

میں نے انچارج کے کمرے میں قدم رکھا تو اس نے چونک کر میری جانب دیکھا اور قدرے حیرت سے بولا۔ ''بیگ صاحب! آپ......؟''

''کیوں، آپ کسی اور وکیل کی توقع کر رہے تھے؟''

''نن...... نہیں۔'' وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''آئیں بیٹھیں، تشریف رکھیں۔''

میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''آپ نے ملزم سے ملاقات کر لی، ادھر کی کیا خبریں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

مذکورہ تھانے دار مجھے اچھی طرح جانتا تھا اس لئے انسانیت سے پیش آ رہا تھا۔ ورنہ ہما شما وکیل کو تھانے والے زیادہ لفٹ نہیں کراتے۔ میں نے معتدل انداز میں کہا۔

''جناب! آپ نے اسے مہمان بنایا ہے، خبریں بھی آپ ہی کو معلوم ہوں گی۔''

''مجھے تو بندہ بچتا ہوا نہیں لگتا۔'' وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔

اس کی بات سن کر مجھے حیرت ہوئی۔ میں اس کے برخلاف جواب کی توقع کر رہا تھا۔ نادرہ بیگم نے بڑے دعوے سے کہا تھا، اس نے تھانے دار کی مٹھی گرم کر کے معاملہ فٹ کر لیا ہے۔ پولیس اس کے بیٹے کو پورا فیور دے گی۔ بس مجھے عدالت میں اس کی بریت کے لئے تھوڑا زور مارنا ہو گا۔ مگر تھانے دار اپنے منہ سے راجا کے نہ بچنے کی بات کر رہا تھا۔ یہاں پر ایک اچھا خاصا تضاد پیدا ہو گیا تھا۔

میں نے لمحے بھر میں ذہن میں حالات کا تقابلی جائزہ لیا اور چہرے سے اپنی سوچ کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ پھر تھانے دار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس بندے نے ایسا کیا کر دیا ہے جو آپ کو اس کے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی؟'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''یہ سیدھا سیدھا اقدام قتل کا کیس ہے۔''

''اچھا، وہ کیسے؟'' میں ایک دم انجان بن گیا۔

اس نے رازدارانہ لہجے میں بتایا۔ ''ملزم نے دانستہ اس لڑکی کو اپنی گاڑی سے کچلنے کی کوشش کی ہے۔ لڑکی نے ڈاکٹر سے کچھ اس قسم کی باتیں کی ہیں۔''

''میں نے تو سنا ہے زخمی حالت میں ہسپتال پہنچنے والی روبی نے ڈاکٹر کو صرف اتنا بتایا

ہے کہ راجا کی گاڑی سے حادثہ پیش آیا ہے یا زیادہ سے زیادہ اس نے گاڑی کے نمبر کا ذکر کیا ہے۔'' میں نے نہایت ہی محتاط انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

وہ بولا۔ ''اس کے علاوہ بھی بہت سی اہم باتیں ڈاکٹر اور روبی کے درمیان ہوئی ہیں جو سراسر ملزم کے خلاف جاتی ہیں۔''

''کیا شدید زخمی روبی کے پاس اتنی مہلت تھی کہ وہ ڈاکٹر سے قصے کہانیاں کر سکتی۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے سنا ہے وہ راجا اور اس کی گاڑی کے بارے میں بتا کر بے ہوش ہو گئی تھی اور میرا خیال ہے اسے ابھی تک ہوش نہیں آیا۔''

''اپنی معلومات کو اپ ڈیٹ رکھا کریں وکیل صاحب!'' وہ اپنی مونچھ کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ کا پیشہ بڑا خطرناک ہے۔ ذرا سی کوتاہی تخت کو تختے میں بدل دیتی ہے۔''

میں نے محسوس کیا کہ اس کا انداز لحہ بہ لحہ روکھا ہوتا جا رہا تھا۔ ایک بات کا مجھے یقین تھا، نادرہ بیگم نے اس کی اچھی خاصی ''خدمت'' کی ہو گی۔ اصولی طور پر اسے مجھ سے کھل مل کر بات کرنا چاہئے تھی کیونکہ موجودہ واقعات کے حوالے سے ہم ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ مبینہ منصوبے کے مطابق ہم دونوں نے مل کر جاوید راجا کی جان چھڑانا تھی مگر تھانے دار کے تیور بتاتے تھے وہ کسی اور ہی موڈ میں ہے۔

میں نے جب محسوس کیا کہ وہ پتے چھپا کر کھیلنے کی کوشش کر رہا ہے تو میں بھی انجان بن کر اسے گھسنے میں مصروف ہو گیا۔ میں نے اپنی باتوں سے ہر چند یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ نادرہ بیگم سے میری کس نوعیت کی بات ہو چکی ہے۔

میں تھانے دار کو بدکتے دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر ایک خول میں چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔ میری جگہ اگر کوئی اپرنٹس رنگروٹ ہوتا تو وہ اس سے کھل کر بات کر سکتا تھا۔ میری پیشہ ورانہ کامیابیوں سے اکثر لوگ خائف رہتے تھے۔ اور خاص طور پر پولیس والے تو میرے سامنے زبان کھولتے ہوئے ہزار بار سوچتے تھے۔ ان کا مشترکہ خیال یہ تھا کہ میں معمولی سی بات پر کیس کا پانسہ پلٹ سکتا ہوں۔ اس تھانے دار کی مجبوری کو مجھ سے زیادہ اور کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔

میں نے اس کے چٹکی لیتے ہوئے کہا۔ ''جناب! اگر میری معلومات اپ ڈیٹ نہیں ہیں تو آپ ہی کچھ مہربان ہو جائیں۔ اگر آپ مجھے کچھ اس سلسلے میں بتا دیں گے تو کوئی قیامت نہیں آ جائے گی۔''

''انسان کو اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے خود محنت کرنا چاہئے۔'' وہ رکھائی سے

بولا۔
''او کے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا، پھر اضافہ کیا۔ ''میرا خیال آپ سے بہت مختلف ہے۔''
اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''وہ خیال بھی بتا دیں۔''
''میں آپ کی طرح بخل سے کام نہیں لوں گا۔'' میں نے ایک گہری چوٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے راجا بڑی آسانی سے چھوٹ جائے گا۔''
جب منافقت ہی گفتگو کا وسیلہ ٹھہری تو پھر کنجوسی کس بات کی۔ جھوٹ کی فصل کو جھوٹ کی درانتی ہی سے کاٹا جاتا ہے!
''یہ آپ کی خوش فہمی ہے۔'' وہ حقارت بھرے لہجے میں بولا۔ ''شاید آپ کو معاملے کی سنگینی کا اندازہ نہیں اس لئے بڑے آرام سے یہ بات کہہ رہے ہیں۔''
میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔ ''آپ پتہ نہیں، کون سی سنگینی کی بات کر رہے ہیں۔ یہ تو معمولی سے ایکسیڈنٹ کا معاملہ ہے۔ میں نے تو قتل کے ملزموں کو بغلیں بجاتے ہوئے رہا ہوتے دیکھا ہے، راجا تو اس کیس سے ایسے نکلے گا جیسے مکھن کے اندر سے بال۔''
وہ بے یقینی سے دیدے پھاڑ کر مجھے تکنے لگا۔
میں نے کہا۔ ''انچارج صاحب! آپ کو میری کون سی بات پر حیرت ہو رہی ہے؟''
''بیگ صاحب! آپ تو اتنے دعوے سے راجا کی رہائی کی بات کر رہے ہیں جیسے پولیس چوڑیاں پہنے بیٹھی ہو۔'' وہ تمسخرانہ انداز میں بولا۔
''بابائے قوم جیب میں پہنچ کر بڑے بڑوں کو چوڑیاں پہنا دیتے ہیں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''پولیس کس قطار شمار میں ہے۔''
''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔
میں نے کہا۔ ''کیا مطلب بھی مجھے ہی سمجھانا ہوگا؟''
''آپ بڑی اُکھڑی اور اُلجھی ہوئی باتیں کر رہے ہیں۔''
''آپ سلیس اُردو میں بیان کر رہے ہیں ناں!'' میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔
اس نے لمحہ بھر کو ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''پہلے آپ نے کہا کہ راجا اس معمولی سے کیس سے باآسانی چھوٹ جائے گا، پھر آپ ملزم کی بے بسی کی کہانی سنانے میں لگ گئے۔ اگر ہم نے ملزم کو اتنی آسانی سے چھوڑنا ہوتا تو گرفتار

کر کے حوالات ہی میں کیوں ڈالتے!''
''اس قسم کی ڈرامے بازی کی بھی تو ضرورت ہوتی ہے!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''تاکہ مصیبت زدہ شخص کے لواحقین کی جیب کو ہلکا کیا جا سکے۔''
''آپ ہم پر رشوت کا الزام لگا رہے ہیں!'' وہ تڑخ کر بولا۔ ''پہلے بھی آپ نے کرنسی نوٹوں کے سلسلے میں بابائے قوم کا ذکر کیا ہے۔''
''آپ کا کیا خیال ہے، میرا دعویٰ بے بنیاد ہے؟'' میں نے تمسخرانہ انداز میں استفسار کیا۔
''بالکل...... سراسر بے بنیاد۔'' وہ قطعیت سے بولا۔ ''ہم نے راجا کے سلسلے میں اس کی ماں سے ایک دھیلا بھی نہیں لیا۔''
اس نے راجا کی ماں کا حوالہ دیا تو مجھے یقین ہو گیا، وہ نادرہ بیگم سے ایک تگڑی رقم بٹور چکا ہے۔ میں نے ملزم کے لواحقین کا ذکر کیا تھا۔ اگر اس نے واقعی ایک پیسہ وصول نہ کیا ہوتا تو وہ خاص طور پر اس کی ماں کا تذکرہ نہ کرتا۔ میں نے اس کے چہرے کا نقاب اتارنے کی غرض سے کہا۔ میرا انداز بڑا مبہم تھا۔
''آپ کے انکار سے کیا فرق پڑتا ہے انچارج صاحب! وہ مجھے پانچ ہزار ایڈوانس میں دے گئی ہے اور اس کا دعویٰ ہے، دس ہزار آپ کو دینے کے بعد وہ میرے پاس پہنچی تھی۔ آپ ہی نے اسے کسی وکیل کی خدمات حاصل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔''
''کیا آپ مسز ہارون کی بات کر رہے ہیں؟''
میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور کہا۔ ''جی ہاں!''
''یہ بڑی جھوٹی عورت ہے!'' وہ بے ساختہ برہمی سے بولا۔
''کس سلسلے میں وہ جھوٹی ہے انچارج صاحب؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
وہ بات بدلتے ہوئے بولا۔ ''کچھ نہیں، کچھ نہیں۔ میں کچھ اور سمجھا تھا۔''
''آپ بالکل ٹھیک سمجھے ہیں انچارج صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب پردے سے باہر آ جائیں۔ میں تو سارے پتے سامنے رکھ کر کھیل رہا ہوں۔ جب میں نے نادرہ بیگم سے پانچ ہزار روپے وصول کرنے کا اقرار کر لیا ہے تو آپ بھی دس ہزار کی وصولی کی رسید دے دیں۔ یہ مت بھولیں کہ اس وقت ہم ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ ہمیں آپس کے پیشہ ورانہ اختلافات کو بھلا کر اپنے مقصد پر نظر رکھنی چاہئے۔ کیا سمجھے آپ۔''

میں نے لفظ ''مقصد'' پر خصوصی زور دیا تو وہ یک دم سنجیدہ ہو گیا پھر اس نے چہرے کا نقاب اتار پھینکنے کے بعد کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ سے کوئی معاملہ کرتے ہوئے بڑا محتاط رہنا پڑتا ہے۔ پتہ نہیں، کس وقت آپ کون سا داؤ مار جائیں۔ بہرحال! اب مجھے یقین ہو گیا ہے، آپ ہمارے ساتھ ہیں۔''

''تو گویا آپ نادرہ بیگم سے دس ہزار روپے وصول کرنے کا اقرار کرتے ہیں؟''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے قطعیت سے بولا۔ ''اس سلسلے میں میرا موقف اب بھی وہی ہے۔ وہ عورت سراسر جھوٹ بول رہی ہے۔ پانچ دے کر دس بتا رہی ہے۔''

''اوہ!'' میں نے ایک طویل سانس خارج کی۔ ''پھر تو وہ واقعی جھوٹ بول رہی ہے۔ یا ہو سکتا ہے ...'' میں نے سوچنے والے انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا اور سرسری لہجے میں کہا۔ ''ہو سکتا ہے مجھے سننے میں غلطی ہو گئی ہو۔ نادرہ بیگم نے پانچ ہزار کہا ہو اور میں نے دس ہزار سمجھا ہو!''

تھانے دار نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو، بیگ صاحب! آپ بڑے چالاک ہو۔ چور، چوری سے جاتا ہے مگر ہیرا پھیری سے نہیں ... آپ نے بھی مجھ سے رشوت کی رقم اگلوانے کے لئے ایک جھوٹ کا سہارا لیا ہے۔ تاہم اس نے زبان سے ایک لفظ ادا نہ کیا، خاموش نظر سے محض مجھے گھور کر رہ گیا۔

میں نے دوستانہ فضا کو قائم و دائم رکھنے کی غرض سے کہا۔ ''ویسے کتنی عجیب بات ہے انچارج صاحب! نادرہ بیگم نے ایک ہی مقصد کے لئے دو پارٹیوں کو پانچ پانچ ہزار کی رقم ادا کی مگر آپ تک پہنچنے والی رقم رشوت کہلائے گی اور مجھے ملنے والے پانچ ہزار روپے فیس میں شمار ہوں گے۔''

وہ جلے بھنے انداز میں بولا۔ ''رشوت اور پولیس کو عوام نے اس طرح ایک دوسرے سے نتھی کر دیا ہے کہ اگر ہم کسی شخص سے اپنی دی ہوئی رقم بھی واپس لیتے ہوئے دیکھ لئے جائیں تو یہی سمجھا جاتا ہے، ہمیں رشوت دی جا رہی ہے۔''

''آپ عوام کے اس عمومی تاثر کو ختم کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟''

''آپ جیسے تجربہ کار وکیل اگر ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جائیں تو ایسی کوشش کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے!'' وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''دیکھتے ہیں، آج کے بعد کیا ہوتا ہے۔''

... میں نے سنجیدہ لہجے میں تھانے

دار سے پوچھا۔ ''تعاونِ باہمی کے بارے میں پھر کبھی تفصیل سے بات کریں گے۔ ابھی تو آپ مجھے یہ بتائیں، اس کیس کی کیا صورتِ حال ہے؟''

میں نے تھانے دار کو یقین دلا دیا تھا کہ اس کیس میں، میں پوری طرح اس کے ساتھ ہوں لہٰذا وہ بھی ڈھکا چھپا انداز ترک کر کے پٹڑی پر آ گیا تھا، نہایت ہی سادگی سے بولا۔

''صورت حال بہت واضح ہے۔ ہم رسمی سی کارروائی کے لئے کل صبح راجا کو عدالت میں پیش کریں گے۔ آپ اپنے زورِ خطابت پر اس واقعے کو اتفاقی حادثہ ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ تھوڑی جرح بحث کے بعد عدالت اس فیصلے پر پہنچے گی کہ راجا کو ایک معقول جرمانے کے بعد بری کر دیا جائے۔ اللہ اللہ، خیر سلا۔ اس طرح ہم نے نادرہ بیگم سے جو رقم وصول کی ہے، وہ بھی حلال ہو جائے گی۔'' اس نے بڑے بھونڈے انداز میں ایک آنکھ دبائی اور مزید کہا۔ ''ہم اپنی طرف سے راجا کو سزا دلوانے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کریں گے۔ دوسری طرف جب آپ جیسا تجربہ کار اور ماہر وکیل ہو گا تو راجا کے چھوٹنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔''

''ہوں۔'' میں نے تھانے دار کو غلط فہمی میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات تو آپ کی بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن ایک بات میرے ذہن میں کھٹک رہی ہے۔''

اگرچہ وہ یہی ظاہر کر رہا تھا کہ پتے کھول کر کھیل رہا ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا، پتے کے پیچھے پتے چھپے ہوں۔ میں اس کے پتوں کی تعداد سے آگاہ نہیں تھا لہٰذا اس کی سوچ کو حیلے بہانے ہی سے سمجھ سکتا تھا۔ میری بات کے جواب میں اس نے جلدی سے پوچھا۔

''کون سی بات آپ کے ذہن میں کھٹک رہی ہے؟''

''اگر روبی کے ورثاء نے اس معاملے کو اچھالنے کی کوشش کی تو پھر کیا ہو گا؟''

''وہ بہت ہی کمزور اور گئی گزری پارٹی ہے۔'' تھانے دار بے پروائی سے بولا۔ ''ان میں اتنا حوصلہ نہیں کہ وہ اقدام قتل کا سہارا لے کر راجا کو کوئی بڑی سزا دلوانے کی کوشش کریں۔ وہ لوگ اسی پر خدا کا شکر ادا کریں گے کہ روبی کی جان بچ گئی اور اگر انہوں نے زیادہ ہی تین پانچ کرنے کی کوشش کی تو ان کا مناسب علاج کر دیا جائے گا۔'' بات ختم کرتے کرتے اس کا لہجہ خاصا سفاک ہو گیا تھا۔

تھانے دار کی بات سن کر مجھے تشویش ہوئی۔ میں نے اپنے تاثرات کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا اور گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''مثلاً کس قسم کا علاج؟''

''شاید آپ کو دوسری پارٹی کے پس منظر سے پوری طرح واقفیت نہیں ہے!''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے روبی کے خاندانی پس منظر سے واقعی کوئی آگاہی نہیں۔''

''میں بتاتا ہوں۔'' وہ دونوں ہاتھ میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''زخمی ہونے والی لڑکی روبی کی فیملی صرف تین افراد پر مشتمل ہے۔ یعنی روبی، اس کی ماں اور اس کا بیمار باپ!'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''روبی شدید زخمی ہو کر ہسپتال میں پڑی ہے، اس کا باپ علیم الدین ٹی بی کی آخری اسٹیج پر ہے۔ علاوہ ازیں وہ دمے کا بھی مریض ہے۔ وہ کافی عرصے سے صرف بستر کا ہو کر رہ گیا ہے۔ آ جا کر روبی کی ماں نزہت باقی بچتی ہے۔ بوڑھی نزہت سلائی وغیرہ کا کام کر کے گھر کے مسائل کو حل کرنے کے لئے کوشاں رہتی ہے۔ ان حالات میں ....''

وہ سانس لینے کے لئے متوقف ہوا، پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ ہی بتائیں، کس کے بس میں ہے کہ وہ کیس کو اٹھانے کے لئے عدالتوں کے چکر کاٹے۔ کم از کم یہ کام نزہت کے بس کا تو نہیں ہے۔ میں روبی اور اس کے والدین کے لئے دل میں ہمدردی رکھتا ہوں اسی لئے میں نے وہ علاج والی بات کی ہے۔''

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ میں نہیں جانتا تھا، وہ آگے کیا کہنے کا ارادہ رکھتا ہے اس لئے میں بھی چپ ہی رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

''میں نے مسز ہارون سے اس سلسلے میں بات کی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کے کیس میں بڑی کشادہ دلی کا ثبوت دے رہی ہے۔ اگر روبی کی ماں نے زیادہ شور مچانے کی کوشش کی تو سکہ رائج الوقت سے اس کا منہ بند کر دیا جائے گا۔''

وہ چند سیکنڈ کے لئے متوقف ہوا پھر عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''بیگ صاحب! آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں، عدالتوں کے چکر کاٹنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، سوائے جوتے گھسنے اور جیب پھٹنے کے۔ جب تک آپ جیسے کسی قابل وکیل کا ساتھ نہ ہو، اپنا حق وصول کرنا بھی ممکن نہیں۔ چلو، نزہت کو تھوڑی بہت رقم مل جائے گی تو اس کے بہت سے گھریلو مسائل حل ہو جائیں گے۔ میرا خیال ہے، یہ بات اس کی سمجھ میں آ جائے گی۔''

تھانے دار کے ہمدردی جتانے کے انداز سے مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ یہ دنیا بڑی خرابے کی جا ہے اور اس خرابے کا سبب، اس میں بسنے والے انسان ہی ہیں۔ اکثر لوگ مفاد پرست، خود غرض اور بے حس ہوتے ہیں۔ وہ مطلب برآری کے لئے ایسی مکاری دکھاتے ہیں کہ ان کا عمل بڑا نیک اور مثبت نظر آنے لگتا ہے۔ دیکھنے والے یہی سمجھتے ہیں

کہ ان سے زیادہ کوئی ہمدرد اور انسان دوست ہو نہیں سکتا۔ اس طرح وہ دوسرے سے ہمدردی جتا کر اپنا اُلو سیدھا کر لیتے ہیں ...... تھانے دار بھی کچھ اسی قسم کی نیکی کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

میں نے تھانے دار سے پوچھا۔ ''کیا روبی کا باقاعدہ بیان لیا گیا ہے؟''

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بتایا۔ ''ابھی تک وہ ہوش ہی میں نہیں آئی۔''

''عدالت اس سلسلے میں سوال کر سکتی ہے۔ خصوصاً اس صورت میں کہ بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے ڈاکٹر کو راجا اور اس کی گاڑی کے بارے میں بتایا تھا؟''

وہ بے پروائی سے بولا۔ ''عدالت جب پوچھے گی تو دیکھ لیں گے!''

میں اپنی مطلوبہ معلومات حاصل کر چکا تو جانے کے لئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''ٹھیک ہے، مجھے اجازت دیں۔'' میں نے الوداعی مصافحے کے لئے اس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کل صبح عدالت کے کمرے میں ملاقات ہو گی، دو مخالف دھڑوں کے روپ میں۔''

اس نے بڑی گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا اور معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''دو ایسے مخالف دھڑے جن کا مقصد ایک ہی ہو۔''

''ہاں، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

اگلے ہی لمحے میں تھانے دار کے کمرے سے نکل کر اپنی گاڑی کی جانب بڑھ رہا تھا۔

❋❋❋

میں نے اپنی گاڑی کو اس ہسپتال کے باہر روک دیا جہاں کے ایمرجنسی وارڈ میں روبی زیر علاج تھی۔ اس ہسپتال کے بارے میں، میں نے نادرہ بیگم سے تفصیلاً معلومات حاصل کر لی تھیں لیکن میں نے ایسا کوئی ارادہ ظاہر نہ کیا کہ میں روبی سے ملنے ہسپتال جاؤں گا۔ اور تھانے دار کو بھی میں نے اس سلسلے میں کوئی بھنک نہیں دی تھی۔ تاہم میں نے اپنے دفتر سے روانہ ہوتے وقت یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ راجا کے ''انٹرویو'' کے بعد میں مذکورہ ہسپتال جا کر روبی کو ایک نظر ضرور دیکھوں گا۔ راجا سے ہونے والی ملاقات اور تھانے دار کے عزائم جان لینے کے بعد تو یہ اور بھی ضروری ہو گیا تھا کہ متاثرہ پارٹی کی خبر گیری کی جائے!

اس وقت رات کے دس بجنے والے تھے۔ میں نے اپنے کوٹ اور ٹائی کو اتار کر گاڑی کی عقبی نشست پر ڈال دیا۔ بریف کیس کو بھی گاڑی کے اندر ہی رہنے دیا اور دروازے لاک کر کے ہسپتال کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ ایمرجنسی وارڈ تک رسائی حاصل کرنے میں مجھے

کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ڈیوٹی ڈاکٹر سے مجھے معلوم ہو گیا کہ روبی کو کہاں رکھا گیا ہے۔ میں سیدھا اسی طرف بڑھ گیا۔

وہ ایک بڑا سا ہال تھا جہاں کم وبیش پچیس بیڈ لگے ہوئے تھے اور ان میں سے کوئی بھی خالی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں ان بیڈز کے درمیان سے گزرتے ہوئے ''سی۔ تھرٹین'' تک پہنچ گیا۔ مجھے بتایا گیا تھا، روبی کو سی۔ تھرٹین پر رکھا گیا ہے۔

روبی کی آنکھیں بند تھیں۔ لگ بھگ پورا سر سفید بینڈیج میں چھپا ہوا تھا۔ اس کے سینے تک سفید چادر کھنچی ہوئی تھی لہٰذا میں اندازہ نہ لگا سکا کہ سفید شیٹ کے نیچے زخموں اور چوٹوں کی کیا پوزیشن ہے، البتہ بائیں بازو پر کہنی کے قریب پلاسٹر چڑھا ہوا تھا جو کسی خطرناک فریکچر کی نشان دہی کر رہا تھا۔ اس کے دائیں بازو میں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ اسٹینڈ پر لگی ہوئی ڈرپ کے اندر موجود لیکوئیڈ کے رنگ سے اندازہ ہوا کہ گلوکوز میں کسی قسم کے انجکشن وغیرہ بھی شامل کیے ہوئے تھے۔ روبی کے جسم کا جتنا حصہ کھلا ہوا تھا اس سے مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی۔

ایک بات کی مجھے حیرت ہوئی، ایمرجنسی وارڈ کے آس پاس کوئی پولیس والا دکھائی نہیں دے رہا تھا حالانکہ وہاں ہمہ وقت کسی نہ کسی کو موجود رہنا چاہیے تھا تاکہ ہوش میں آتے ہی روبی کا بیان قلم بند کیا جا سکے۔ حادثے کے شکار شخص کے بیان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ روبی نے راجا کے بارے میں ڈاکٹر کو جو کچھ بتایا تھا، وہ ناکافی تھا لیکن لگتا تھا کہ تھانے دار نے راجا کے ساتھ خاص رعایت برتنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسی لئے وہ روبی کے بیان کو کوئی خاص اہمیت نہیں دے رہا تھا اور میرے خیال میں وہ اپنے فرائض سے غفلت برتنے کا مرتکب ہو رہا تھا جس کے لئے اس پر کوئی بڑی مصیبت بھی آ سکتی تھی! میں یہ سوچتے ہوئے مضروب لڑکی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

روبی کے بیڈ کے نزدیک ہی لوہے کی بینچ پر ایک سانولا سا خوش شکل نوجوان بیٹھا تھا۔ وہ بلاشبہ ایک ہینڈسم شخص تھا۔ میری معلومات کے مطابق والدین کے سوا روبی کا اس دنیا میں اور کوئی نہیں تھا لہٰذا میں توقع کر رہا تھا کہ اس کے بیڈ کے قریب اس کی ماں نزہت سے میری ملاقات ہو گی۔ اس پُرکشش نوجوان کو دیکھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی۔

میں نے سرسری انداز میں روبی کا جائزہ لینے کے بعد جب سوالیہ نظر سے اس نوجوان کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں میرے لئے بھی ایک استفسار جھلک رہا تھا۔ وہ میری آمد کو بھی غیر متوقع محسوس کر رہا تھا۔ میں اپنا کوٹ اور ٹائی گاڑی میں چھوڑ آیا تھا، لہٰذا مجھے بہ حیثیت

وکیل تو پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے اس نوجوان کی حیرت دور کرتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میرا نام امجد ہے۔ میں روبی کے باپ کا ایک دیرینہ دوست ہوں۔''

''اوہ!'' وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر مصافحے کے لئے میری جانب ہاتھ بڑھا دیا۔

''میں نے پہلے آپ کو کبھی نہیں دیکھا امجد صاحب؟'' اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

''میں کراچی سے باہر گیا ہوا تھا۔'' میں نے سرسری انداز میں بتایا پھر اس سے پوچھا۔ ''اور تم کون ہو؟''

''میرا نام فیصل ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے روبی کی طرف دیکھنے کے بعد سوالیہ نظر سے فیصل کو دیکھا تو وہ قدرے نروس ہو گیا، پھر تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''مم...... میں روبی کا کزن ہوں۔''

اس کے لہجے کی لڑکھڑاہٹ نے مجھے بتا دیا، وہ دروغ گوئی سے کام لے رہا تھا مگر میں نے مزید کوئی سوال کر کے اسے کسی امتحان میں ڈالنا مناسب نہیں سمجھا۔ اگر میں اس سے کہتا کہ روبی کے کسی کزن سے میں واقف نہیں ہوں تو مجبوراً اسے بھی میری طرح بہانہ کرنا پڑتا کہ... وہ کراچی سے باہر گیا ہوا تھا...... یا پھر اسی نوعیت کی کوئی اور توجیہہ!

''نزہت کہاں ہے؟'' میں نے فیصل نامی اس نوجوان سے پوچھا۔

''آنٹی ذرا کینٹین تک گئی ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے روبی کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''اس کی کیا صورتِ حال ہے؟''

''صورتِ حال خاصی گمبھیر ہے۔'' وہ فکرمندی سے بولا۔ ''شدید چوٹیں آئی ہیں روبی کو۔ کم از کم ڈیڑھ دو مہینے تو اسے بستر پر ہی رہنا ہو گا۔''

میرے استفسار پر اس نے مزید بتایا کہ روبی کے سر کے عقبی حصے میں سب سے خطرناک چوٹ آئی تھی جس کی وجہ سے اس کی کھوپڑی چٹخ گئی۔ ڈاکٹروں کو سر میں بارہ ٹانکے لگانا پڑے ہیں۔ وہ بڑی مشکل سے خون روکنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ بائیں بازو میں کہنی کے قریب فریکچر ہوا تھا۔ اسی طرح دائیں ٹانگ میں پنڈلی کی ہڈی بھی ٹوٹی تھی۔ فیصل نے بتایا کہ پنڈلی پر بھی پلاسٹر چڑھا دیا گیا۔ اس کے علاوہ وہ پسلیوں میں بھی اچھی خاصی ضربیں لگی تھیں۔ سڑک پر گھسٹنے کے سبب چہرے پر جو خراشیں آئیں، وہ بھی معمولی نوعیت کی نہیں تھیں۔ الغرض وہ ٹوٹ پھوٹ کر زندہ بچ گئی تھی۔

وہ روبی کی شکست و ریخت کی تفصیل بتا چکا تو میں نے پوچھا۔ ''ڈاکٹر نے اس کے

بارے میں کیا کہا ہے؟''

''ڈاکٹر نے اس کی حالت خطرے سے باہر بتائی ہے تاہم روبی کو کم از کم ایک ہفتے تک ہسپتال میں رہنا ہوگا۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ سر والی چوٹ کی وجہ سے روبی کی یادداشت بھی متاثر ہوئی ہے۔ وہ نہیں جانتی، اس کے ساتھ کیا پیش آیا ہے!''

میں نے فیصل سے پوچھا۔ ''تم کب سے یہاں ہو؟''

''حادثے کی اطلاع ملتے ہی میں آنٹی کو لے کر ہسپتال آ گیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''تب سے یہیں پر ہوں۔''

''اس دوران روبی کو ہوش آیا تھا؟''

''میں نے تو اسے ہوش میں نہیں دیکھا۔'' وہ روبی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ابھی تو خیر اسے دواؤں کے زیر اثر بھی رکھا گیا ہوگا۔ ویسے اس کی یادداشت والا معاملہ خاصا تشویش ناک ہے!''

فیصل کی اس بات نے مجھے چونکا دیا۔ میری معلومات کے مطابق روبی نے ہسپتال پہنچ کر ڈاکٹر کو راجا اور اس کی گاڑی کے بارے میں بڑے واضح الفاظ میں بتایا تھا، اس کے بعد وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اگر واقعی اس کی یادداشت کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی تو صورت حال مزید گمبھیر ہو جاتی تھی۔

میں نے فیصل سے روبی کے ابتدائی بیان کا ذکر کیا تو اس نے کہا۔ ''یہ بات میرے سننے میں بھی آئی ہے۔ روبی کی نشان دہی پر پولیس نے اس حادثے کے ذمہ دار کو گرفتار کر لیا ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے، راجا نامی اس شخص کو کل صبح عدالت میں پیش کیا جائے گا۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بڑے ہی زہریلے انداز میں بولا۔

''میں تو کہتا ہوں، راجا جیسے سفاک درندوں کو عبرت ناک سزا ملنی چاہئے۔ یہ لوگ انسانی جان کو ایک کھلونے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔''

فیصل کے لہجے کی تندی نے مجھے بتا دیا کہ وہ راجا کے لئے اپنے دل میں نفرت کا آتش فشاں چھپائے بیٹھا تھا۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''تم فکر نہ کرو، قصوروار کو قرار واقعی سزا ملے گی۔ وہ پولیس کی کسٹڈی میں ہے۔''

''پولیس!'' اس نے یک لفظی جملہ بول کر خاموشی اختیار کر لی۔

اس ایک لفظ پر مشتمل جملے میں اس نے پولیس پر اپنے عدم اعتماد کا اعلان کر دیا تھا۔ میں نے ایک نئے زاویے سے اسے کریدا۔

''برخوردار! تمہاری باتوں سے میں نے اندازہ لگایا ہے، تم راجو کو اچھی طرح جانتے ہو؟''

''بہت اچھی طرح جانتا ہوں جناب!'' وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔ ''وہ ایک فراڈ ٹریول ایجنٹ ہے۔ اس نے روبی کو قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرا بس چلے تو میں......''

اس نے نفرت انگیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں تھا کہ وہ آگے کیا کہنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کے جذبات نے مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر دیا۔ راجا کے لئے اس کی نفرت میں ایک خاص قسم کی تپش موجود تھی، وہ تپش جو رقیب روسیاہ کے لئے ہوا کرتی ہے!

نفرت اور محبت بڑے عجیب جذبات ہیں۔ اپنے انداز و اطوار میں یہ ایک دوسرے کے لئے سوا سیر ثابت ہونے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کے بغیر چین بھی نہیں پڑتا اس لئے آس پاس ہی موجود رہتے ہیں اور بعض اوقات ایک کے اندر سے دوسرا جنم لیتا ہے۔ ہم جس شے کو پسند کرتے ہیں، اسے نقصان پہنچانے والے سے ہمیں نفرت محسوس ہونے لگتی ہے۔ اسی طرح جو شخص ہمارے لئے قابل نفرین ہو، اس کی مخالفت کرنے والا ہمیں اپنا سا لگنے لگتا ہے، ہمیں اس سے محبت ہو جاتی ہے۔ فیصل کے ساتھ بھی کچھ اسی نوعیت کا معاملہ معلوم ہوتا تھا۔

میں نے اس نوجوان کی آنکھوں میں روبی کے لئے محبت اور چاہت کے جو جذبات نوٹ کئے، وہ راجا سے اس کی نفرت اور عداوت کو سمجھنے کے لئے کافی تھے۔

میں اس کے قریب گیا اور اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ ''تم فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ روبی کو اس حالت میں پہنچانے والے شخص کو بہت بڑی قیمت چکانا پڑے گی، اس کھلی دہشت گردی کی!''

فیصل نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بے یقینی سے پوچھ بیٹھا۔ ''کیا آپ واقعی علیم الدین انکل کے کوئی دیرینہ دوست ہیں؟''

''میں ہر مظلوم کا دوست اور ہر ظالم کا دشمن ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس میں دیرینہ اور حالیہ کی کوئی تخصیص نہیں۔''

وہ متعجب نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔

اسی وقت ایک پستہ قامت سانولی سی عورت ہمارے قریب آ گئی۔ اس کی عمر لگ بھگ پچاس سال رہی ہوگی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ نزہت کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

فیصل کی آواز نے میرے دل کی گواہی کا عملی ثبوت پیش کر دیا۔ اس نے مذکورہ عورت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''نزہت آنٹی! یہ امجد صاحب ہیں۔'' اس نے اتنا کہنے کے بعد میری جانب اشارہ بھی کر دیا۔ ''انکل کے کوئی بہت ہی پرانے دوست ہیں۔ آپ تو انہیں جانتی ہوں گی؟''

نزہت نے اجنبی نظر سے مجھے دیکھا اور نفی میں گردن ہلا دی۔

فیصل کے چہرے پر اُلجھن کی لکیریں نمودار ہو گئیں۔

میں نے صورتِ حال کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''آپ مجھے اس لئے نہیں پہچان پا رہی ہیں کہ اس سے پہلے آپ نے کبھی مجھے دیکھا ہی نہیں۔ بہرحال......'' میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں روبی کے سلسلے میں آپ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ آپ میرے ساتھ ذرا باہر آئیں۔''

نزہت کی آنکھوں میں مجھے لمحاتی تذبذب نظر آیا پھر وہ میرے ساتھ باہر جانے کے لئے آمادہ ہو گئی۔ اس نے قدم اٹھانے سے پہلے تشکرانہ نظر سے فیصل کو دیکھا اور بولی۔

''بیٹا! تم روبی کا خیال رکھنا۔''

''جی آنٹی!'' فیصل نے فرمانبرداری سے صرف اتنا کہا اور روبی کی طرف دیکھنے لگا۔

میں نزہت کے ساتھ وارڈ سے باہر نکل آیا۔ باہر آ کر اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے اپنا تعارف کرانے کے بعد نہایت ہی مختصر اور موزوں الفاظ میں اسے صورتِ حال کی سنگینی سے آگاہ کر دیا۔ جب اسے یہ پتہ چلا کہ پولیس بھی رشوت لے کر راجا کا ساتھ دے رہی ہے تو پہلے تو اسے یقین نہیں آیا۔ جب بات اس کی سمجھ میں آ گئی تو گہری تشویش نے اسے گھیر لیا۔

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، کیا کروں۔'' وہ پریشان لہجے میں بولی۔ ''اس واقعے نے میرے حواس مختل کر کے رکھ دیئے ہیں۔ آپ مجھے ایک ہمدرد انسان لگتے ہیں اور قانون وغیرہ کو بھی جانتے ہیں۔ آپ ہی کوئی مفید مشورہ دیں!''

میں نے کہا۔ ''پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ راجا نے روبی کو اپنی گاڑی سے کچلنے کی کوشش کیوں کی؟ جب تک اس کے جرم کا محرک سامنے نہیں آئے گا، میں آپ کو کوئی راست مشورہ نہیں دے سکوں گا۔ آپ کو یہ اندازہ تو ہو گیا ہو گا، یہ اقدامِ قتل کی ایک واردات ہے؟''

''اچھی طرح اندازہ ہے۔'' وہ پُر وثوق انداز میں بولی۔ ''لیکن میں توقع کر رہی تھی، وار

راجا کی ماں کی طرف سے ہو گا۔ فیصل مجھے اس سلسلے میں بہت کچھ بتاتا رہتا تھا۔ راجا کی ماں روبی سے شدید نفرت کرتی ہے اور اس کی کوشش رہی ہے کہ راجا، روبی کو ملازمت سے نکال دے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ راجا اس قسم کی حرکت کرے گا۔''

''وہ پہلی کوشش میں ناکام ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور اگر وہ صاف بچ نکلا تو آئندہ بھی ایسی کوشش ضرور کرے گا۔ حالات و واقعات سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے، وہ بچ نکلے گا!''

میرا انداز پُر سوچ ہو گیا۔

''پھر...... پھر مجھے کیا کرنا چاہئے؟'' وہ بے حد فکر مندی سے بولی۔

میں نے کہا۔ ''پہلے آپ مجھے بتائیں، آپ کی بیٹی روبی اور ایجنسی کے مالک راجا میں کس قسم کا تعلق تھا؟ نادرہ بیگم روبی کو کیوں سخت ناپسند کرتی تھی؟ اور راجا، روبی کی جان کا دشمن کیوں ہو گیا؟ میری معلومات کے مطابق روبی اس ایجنسی میں ایک معمولی ملازم تھی۔ ملازم اور مالک کی دشمنی سمجھ میں نہیں آتی!'' میں ایک لمحے کے لئے سانس لینے کو رکا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''اس کے بعد میں آپ کو بتاؤں گا، ان حالات میں آپ کو کیا کرنا چاہئے!''

نزہت نے میرے متعدد سوالات کے جواب میں جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا:

روبی کی خواہشات حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھیں۔ اس کی ابتدائی زندگی غربت اور عسرت میں گزری تھی لیکن تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے حالات کو بدلنا چاہتی تھی اور اس تبدیلی کے لئے اسے کسی ایسے سہارے کی ضرورت تھی جو انتہائی دولت مند اور مضبوط ہو۔ وہ قطرہ قطرہ دریا بنانے کی قائل نہیں تھی بلکہ پورے سمندر ہی کو اٹھا کر گھر میں لانا چاہتی تھی۔ بی کام کرنے کے بعد وہ ملازمت کے لئے گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ بیمار باپ اور بوڑھی ماں اس کا راستہ نہ روک سکے۔ گھر میں پیسے آنے کی امید نے ان کی زبانوں پر قفل ڈال دیئے تھے۔ گھر میں آسودگی لانے کے لئے پیسہ بہت ضروری ہے۔ اور پیسہ کمانا کوئی آسان کام نہیں۔ روبی تھوڑا تھوڑا کما کر زندگی میں آسانیاں لانے کے لئے برسوں انتظار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن جیک پاٹ کے لئے اسے کوئی راہ نظر نہیں آتی تھی۔ پھر جب راجا نے اس میں خصوصی دلچسپی لینا شروع کی تو اسے اپنی منزل دو گام پر کھڑی دکھائی دینے لگی۔ اگر وہ راجا سے شادی کرنے میں کامیاب ہو جاتی تو اس کے سارے دلدر دور ہو جاتے۔ راجا کے پاس وہ سب کچھ تھا جو اس کی خواہش تھی۔ اگر راجا اس سے شادی کر لیتا تو اس کی زندگی میں بہار آ جاتی۔ صدیوں کا سفر لمحوں میں کٹتا نظر آیا تو اس نے دو گام کا فاصلہ

خود طے کر کے اپنی منزل کو حاصل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

اس دوران فیصل نے روبی پر گہری نظر رکھی ہوئی تھی۔ وہ اس کے حالات میں پیدا ہونے والی اس تبدیلی کے بارے میں نزہت کو بتاتا رہا اور نزہت نے ماں ہونے کے ناتے، بیٹی کو سمجھانے کی اپنی سی کوشش کر ڈالی لیکن روبی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ کچھ عرصہ تک یہ معاملہ یونہی چلتا رہا۔ پھر حالات میں کوئی گڑ بڑ پیدا ہوگئی۔ کھلی کھلی اور خوش رہنے والی روبی ایک دم مرجھا گئی۔ اب وہ ہر وقت خاموش اور اداس رہنے لگی۔ ماں نے اس کی دل گرفتگی کا سبب جاننے کی کوشش کی تو کچھ حاصل نہ ہوا۔ تاہم اس دوران وہ بدستور ملازمت پر جاتی رہی۔ اس کی اُداسی اور پژمردگی کا سبب کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

چند روز بعد فیصل نے نزہت کو جو رپورٹ دی وہ خاصی تشویش ناک تھی۔ نادرہ بیگم کو روبی اور راجا کے تعلقات کا علم ہوگیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے سے سخت ناراض ہوئی اور اس پر دباؤ ڈالا کہ وہ پہلی فرصت میں روبی کو ملازمت سے نکال دے۔ نادرہ بیگم روبی سے شدید نفرت کرنے لگی کیونکہ وہ راجا کی شادی کسی اونچے گھرانے میں کرنے کی خواہاں تھی۔ روبی کے بارے میں نادرہ کا خیال یہ تھا کہ راجا بے وقوفی میں نالی کے کیڑے سے اٹھکیلیاں کرنے میں لگا ہوا ہے۔ یہ اس کی کلاس نہیں!

روبی، راجا کی ایجنسی کی ایک مفید ورکر تھی۔ اس نے ماں کے حکم پر روبی کو فوری طور پر ملازمت سے برخاست تو نہ کیا تاہم اس کی طرف سے ایک دم کھنچ گیا۔ راجا اپنی زندگی کے ہر معاملے میں ماں کی انگلی پکڑ کر چلنے کا عادی تھا۔ وہ نادرہ بیگم کی مخالفت میں نہیں جا سکتا تھا۔ ماں کے فرمان پر وہ روبی کی طرف سے بالکل ہٹ گیا۔ روبی، راجا کے معاملے میں پوری طرح سنجیدہ تھی۔ راجا کے لئے یہ سب کچھ کھیل تماشے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا مگر اس کا یہ رویہ روبی کے لئے بڑا اذیت ناک ہوگیا۔ پتہ نہیں، ان دونوں میں کیا شکوے شکایات ہوئیں! ابھی یہ کشیدہ صورت حال چل ہی رہی تھی کہ یہ واقعہ پیش آ گیا جس کے سبب روبی ہسپتال کے بستر پر بے ہوش پڑی تھی۔ جو لوگ اپنی آنکھوں میں حد سے زیادہ وسیع خواب سجا لیتے ہیں اور کسی کی نہیں سنتے انہیں بالآخر ایک روز بہت شدید دھچکا پہنچتا ہے۔ حقیقت سے نگاہ چرانے سے حقیقت بدل نہیں سکتی۔

روبی کے ساتھ بھی کچھ اسی نوعیت کا سانحہ گزرا تھا۔

نزہت کی پوری کتھا سننے کے بعد میں نے کہا۔ ''آپ کا بھتیجا فیصل مجھے خاصا معقول اور سلجھا ہوا نوجوان لگا ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے، وہ اپنے دل میں روبی کے لئے ہمدردی

کے جذبات رکھتا ہے۔''

وہ ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''وکیل صاحب! کیا بتاؤں، اب تو وہ زمانہ آ گیا ہے کہ اپنوں سے غیر زیادہ کام آتے ہیں۔''

''غیر!'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا آپ کا اشارہ فیصل کی طرف ہے؟''

نزہت نے بڑی رسانیت سے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے کہا۔ ''لیکن اس نے تو مجھے بتایا ہے، وہ روبی کا کزن ہے؟''

''فیصل ہمارے محلے میں رہتا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اس سے ہماری کوئی رشتے داری تو نہیں لیکن اس نے ہمیشہ اپنوں سے زیادہ ہمارا خیال رکھا ہے۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے توصیفی انداز میں اضافہ کیا۔ اس توصیف میں ایک طرح کا افسوس بھی پنہاں تھا۔

''بہت ہی سمجھ دار اور فرمانبردار بچہ ہے۔ لیکن پتہ نہیں، یہ بات روبی کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی!''

روبی کی آنکھیں تو آسمان پر چمکنے والے ستاروں پر لگی ہوئی تھیں، زمین پر کھلنے والے گلاب اس کی نگاہ میں کیونکر آ سکتے ہیں۔ البتہ میں بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ گیا کہ نزہت کے ایک جملے کے کوزے میں حقائق کے کتنے بڑے نیل کو بند کر دیا گیا تھا!

''اوہ، یہ بات ہے!'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

نزہت نے پوچھا۔ ''اب آپ مجھے کیا مشورہ دیتے ہیں ..... پوری صورت حال آپ کے سامنے ہے۔''

''میرے خیال میں راجا کو بچ کر نہیں جانا چاہئے۔'' میں نے کہا۔ ''اس کا جرم سنگین نوعیت کا ہے۔ قتل عمد کا اقدام اگر عدالت میں ثابت ہو جائے تو مجرم کو کم از کم دس سال کی سزا ہو سکتی ہے۔''

وہ الجھن زدہ انداز میں بولی۔ ''مگر عدالت میں راجا کے جرم کو کیسے ثابت کیا جائے؟ آپ نے بتایا ہے، پولیس نے راجا کی رہائی کے لئے نادرہ بیگم سے اچھی خاصی رقم کھا لی ہے۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر بولی۔ ''حالانکہ فیصل بھی اس بات پر زور دے رہا ہے کہ کسی بھی صورت راجا کی جان نہیں چھوٹنی چاہئے۔ اس نے مجھے پیشکش کی ہے کہ اس سلسلے میں اگر میں کوئی اعتراض نہ کروں تو وہ کسی قابل وکیل کی خدمات حاصل کرنا چاہتا ہے اور وہ

..... ہر قسم کا خرچہ بھی اٹھانے کو تیار ہے۔"

"اس کا مطلب ہے وہ نوجوان واقعی آپ لوگوں سے مخلص ہے۔" میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "اس کا مشورہ خاصا معقول ہے۔ آپ کو مخالف پارٹی کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہئے۔ مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانا کارِثواب ہے۔"

وہ مطمئن انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "ٹھہریں، میں فیصل کو آپ کے پاس بھیجتی ہوں۔ آپ اس سے بات کرلیں۔ یہ قانونی معاملات میری سمجھ میں نہیں آئیں گے۔"

ٹھیک پانچ منٹ بعد فیصل میرے سامنے کھڑا تھا۔ روبی کے بستر سے وہاں تک پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ ایک منٹ لگ سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا، نزہت نے باقی وقت فیصل کو میرے بارے میں بتانے پر صرف کیا ہوگا۔

"ہیلو امجد صاحب!" اس نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ایک مرتبہ پھر مجھ سے مصافحہ کیا۔ "آنٹی نے بتایا ہے، آپ ایک وکیل ہیں اور روبی والے معاملے میں خاصی دلچسپی لے رہے ہیں!"

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم سے زیادہ نہیں برخوردار!"

میرا انداز ایسا چبھنے والا تھا کہ وہ کھسیانا سا ہو کر رہ گیا۔

میں نے اسے کسی خجالت سے بچانے کے لئے ہنگامی موضوع پر گفتگو شروع کر دی۔ "اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ مجھے روبی سے گہری ہمدردی پیدا ہوگئی ہے۔ اسی لئے میں نے راجا کی وکالت کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ کل میں نادرہ بیگم کی رقم اسے واپس لوٹا دوں گا۔"

اس کے بعد میں نے اپنا جامع تعارف کرایا اور فیصل کو اس تمام گفتگو کا خلاصہ سنایا جو اب تک میرے، نادرہ بیگم، راجا اور تھانے دار کے درمیان ہوئی تھی۔ وہ پوری توجہ سے میری بات سنتا رہا۔ اس دوران اس کے چہرے کے تاثرات میں نمایاں تبدیلی رونما ہوتی رہی۔ جب میں خاموش ہوا تو وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

"بیگ صاحب! مجھے جس وکیل کی تلاش تھی، وہ آپ ہی ہیں۔ آپ ایک ہمدرد اور انسان دوست وکیل ہیں۔ میں آپ کی فیس اور دیگر عدالتی اخراجات اٹھانے کو تیار ہوں۔ روبی کے کیس کو آپ ڈیل کریں۔"

اس نوجوان کے جذبے نے مجھے متاثر کیا۔ وہ روبی کو چاہتا تھا اور اسی چاہت میں وہ

راجا کو کڑی سے کڑی سزا دلوانے کا خواہاں تھا۔ جب اس نے میری فیس و دیگر اخراجات برداشت کرنے کی بات کی تو میں اس سے پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"فیصل! تم کرتے کیا ہو ..... میرا مطلب ہے، تمہارا ذریعۂ معاش کیا ہے؟"

اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ "آپ فکر نہ کریں بیگ صاحب! میں آپ کی فیس اور دیگر خرچے برداشت کرنے کی سکت رکھتا ہوں۔ روبی کے کسی معاملے کے لئے تو میں بڑی سے بڑی قربانی بھی دے سکتا ہوں!" بات کے اختتام پر اس کا لہجہ خاصا جذباتی ہوگیا۔

آج کل ایسے نوجوان ناپید ہوتے جا رہے ہیں جو کسی کی خاطر کچھ کر گزرنے کا عزم رکھتے ہوں۔ اکثر تو اس امید پر چاروں طرف نگاہ دوڑاتے رہتے ہیں کہ ان کی زندگی میں آنے والی لڑکی اتنی مضبوط ہو کہ پھر ان کی زندگی میں کوئی معاشی مسئلہ باقی نہ رہے۔ آنے والی اسے گھر کے اندر اور باہر دونوں محاذوں پر بھرپور مالی مدد دے اور اس کے روز و شب آرام و آسائش سے بسر ہوں۔ بڑا واہیات سا ٹرینڈ چل نکلا ہے!

میں نے فیصل کی طرف ستائشی نظر سے دیکھا اور کہا۔ "میں تمہارے جذبات کی سچائی کو سمجھ سکتا ہوں۔" پھر اس کے اطمینان کی خاطر کہا۔ "میں نے وہ سوال اس لئے کیا تھا کہ تمہاری مصروفیات کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔"

اس نے مجھے بتایا کہ وہ سائٹ کی ایک ٹیکسٹائل مل میں ٹیکسٹائل ڈیزائنر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا اور وہاں سے اسے خاصی معقول تنخواہ ملتی تھی۔ فیصل ہر حوالے سے روبی کے لئے موزوں تھا۔ اسے نظر انداز کر کے روبی کا راجا کی طرف لپکنا سراسر حماقت اور بے وقوفی تھی۔ وہ اپنی طویل و عریض خواہشات کے حصول کے لئے ایک ایسی ڈگر پر قدم رکھ بیٹھی تھی جہاں تاریکی اور تباہی کے سوا دور دور تک اور کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

میں نے فیصل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ویسے تو یہ ایک پولیس کیس ہے۔ اصولی طور پر سرکاری وکیل کو روبی کی حمایت میں بول کر انصاف کا تقاضا پورا کرانے کے لئے زور مارنا چاہئے لیکن پولیس کے حالیہ رویے سے یہی بات سمجھ میں آ رہی ہے کہ سرکاری وکیل کوئی قابل ذکر کارکردگی نہیں دکھائے گا۔"

"پھر!" فیصل کی آنکھوں میں دنیا بھر کی تشویش سمٹ آئی۔

میں نے اس کا شانہ تھپتھپایا اور تسلی بخش لہجے میں کہا۔ "فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے وکیل والی جو بات کی ہے وہ کوئی فارمولا نہیں۔ قانون کی طرف سے ایسی کوئی پابندی نہیں۔ اگر کسی پارٹی کو وکیل سرکار پر بھروسہ نہ ہو تو وہ اپنے کیس کی پیروی کے لئے

کسی پرائیویٹ وکیل کی خدمات بطور وکیلِ استغاثہ حاصل کرسکتا ہے۔ استغاثہ کی طرف سے میں روبی کا کیس لڑنے کو تیار ہوں۔''

فیصل کی آنکھوں میں امید کے دیے سے روشن ہو گئے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ بیگ صاحب!''

''ان شکریہ جات کے چکر میں وقت ضائع کرنا مناسب نہیں۔'' میں نے خاصے دوستانہ انداز میں کہا۔''جب میں نے تمہاری روبی کا وکیل بننا قبول کرلیا ہے تو کیوں نہ اسی لمحے سے کام شروع کر دیا جائے۔ آؤ میرے ساتھ......''

''تمہاری روبی'' ایسے الفاظ نے فیصل کو ایک انوکھی خوشی سے نہال کر دیا۔ وہ یہ پوچھنا بھی بھول گیا کہ میں اسے اپنے ساتھ کہاں لے جارہا ہوں۔ وہ کسی سحر زدہ معمول کے مانند میرے ہمراہ چلتا رہا اور ہم اس ہسپتال کے انچارج ڈاکٹر کے پاس پہنچ گئے۔

''میرا نام مرزا امجد بیگ ہے۔'' میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے انچارج ڈاکٹر سے کہا۔''میں ایک وکیل ہوں اور آپ کے ایمرجنسی وارڈ میں موجود ایک شدید زخمی لڑکی کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی، فرمائیں؟'' وہ سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔''آپ نے اس لڑکی کا کیا نام بتایا ہے؟''

''ابھی تک تو میں نے اس کا نام نہیں بتایا۔'' میں نے قدرے بدمزہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''بہرحال، اس بدنصیب کا نام روبی ہے۔ لگ بھگ ڈھائی بجے دوپہر اسے شدید زخمی حالت میں ہسپتال میں لایا گیا تھا۔ یہ ایک روڈ ایکسیڈنٹ کا کیس ہے۔''

''ہاں، ہاں ......'' اسے فوراً یاد آ گیا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔''ہم نے اسے انتہائی ضروری ٹریٹ منٹ دے دیا ہے۔ اس بے چاری کے جسم کی بہت ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے۔ اس وقت وہ مسکّن ادویات کے زیر اثر ہے لیکن اللہ کا شکر ہے، ڈاکٹروں کی بروقت کوشش کے نتیجے میں وہ خطرے سے باہر آ چکی ہے۔ پانچ چھ روز بعد اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے ڈسچارج کر دیا جائے گا۔''

وہ ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔ جب اس کی زبان تھمی تو میں نے کہا۔''یہ سب تو مجھے بھی معلوم ہے ڈاکٹر صاحب! میں ابھی اسے دیکھ کر آ رہا ہوں۔''

''تو پھر آپ مجھ سے کیا جاننا چاہتے ہیں؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔''ڈاکٹر صاحب! یہ ایک پولیس کیس ہے اور واقعات وشواہد اقدام قتل کی طرف اشارہ کر رہے ہیں لیکن ابھی تک زخمی لڑکی کا بیان ریکارڈ نہیں کیا گیا۔ ایسی صورت

میں تو اس کا بیان اسی وقت ہو جانا چاہئے تھا جب اسے ہسپتال لایا گیا تھا۔''

اس ڈاکٹر کو شاید بھولنے کی عادت تھی، میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے سنجیدہ اور سوچنے والے انداز میں کہا۔''آپ نے اپنا کیا نام بتایا تھا......؟''

''مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں تو بیگ صاحب!'' وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔''ہم اپنے فرائض سے غافل نہیں ہیں۔ جب وہ زخمی لڑکی ہمارے ہسپتال میں لائی گئی اور اٹینڈ کرنے والے ڈاکٹر کو اس نے گاڑی اور گاڑی کے مالک کے بارے میں بتایا تو ہم نے سب سے پہلے پولیس ہی سے رابطہ کیا تھا۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ ہماری نشان دہی پر ہی پولیس نے حادثے کے ذمہ دار شخص کو گرفتار کیا ہے......''

''مجھے یہ بات معلوم ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ بولا۔''روبی کے اب تک بیان ریکارڈ نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ وہ اس دوران زیادہ تر بے ہوش ہی رہی ہے۔ جب تک اس کی صحت اجازت نہیں دے گی، ہم کسی قسم کے انٹرویو کے لئے کسی شخص کو اس کے قریب نہیں جانے دیں گے۔''

''بجا فرمایا آپ نے۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔''لیکن موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر کسی ذمہ دار پولیس والے کو ہمہ وقت ہسپتال میں رہنا چاہئے تھا۔ روبی کو کسی بھی وقت ہوش آ سکتا ہے۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں، ایک کانسٹیبل تک ادھر نظر نہیں آ رہا!''

انچارج ڈاکٹر کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔''اس سلسلے میں آپ متعلقہ پولیس والوں سے جا کر استفسار کریں۔ یہ ہمارے فرائض کا حصہ نہیں۔ ہم نے اپنی ذمہ داری بہ طریق احسن نبھائی ہے۔''

''آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب!'' میں نے بڑی رسانیت سے کہا۔ ''آپ مجھے اس ڈاکٹر سے تو ملوا سکتے ہیں، روبی نے جسے گاڑی کے مالک اور نمبر کے بارے میں بتایا تھا؟''

ڈاکٹر نے بتایا۔''اس کا نام اسد اللہ ہے لیکن وہ اپنی ڈیوٹی آف کر کے جا چکا ہے۔ مجھے افسوس ہے، میں اس سے آپ کی بات نہیں کروا سکتا۔''

''آپ ڈاکٹر اسد اللہ کا فون نمبر تو مجھے دے سکتے ہیں۔''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔''آپ ایسا کریں کہ اپنا رابطہ نمبر یہاں چھوڑ جائیں۔ میں ڈاکٹر اسد سے آپ کو فون کروا دوں گا۔''

اس کی احتیاط کو دیکھتے ہوئے میں نے زیادہ ضد نہیں کی اور اپنا وزیٹنگ کارڈ اسے دے کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ فیصل، ڈاکٹر سے گفتگو کے دوران بالکل خاموش رہا تھا۔ کوریڈور میں قدم رکھتے ہی اس کی زبان کھل گئی۔

''بیگ صاحب! میرے لئے کیا ہدایات ہیں؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''تمہارا کام کل سے شروع ہوگا۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔''فی الحال تم اپنی آنٹی کو میرے پاس لے آؤ۔ میں چند اہم کاغذات پر مدعی کی حیثیت سے اس کے دستخط لینا چاہتا ہوں تاکہ عدالت میں کسی قسم کی رکاوٹ پیش نہ آئے۔''

ایک لمحہ کے توقف سے میں نے کہا۔''تم نزہت کو یہیں ٹھہرنے کے لئے کہنا، میں گاڑی میں سے اپنا بریف کیس لے کر آرہا ہوں۔''

وہ اثبات میں سر ہلا کر وارڈ میں داخل ہو گیا تو میں اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

میں بریف کیس لے کر واپس آیا تو نزہت کوریڈور میں ایک دیوار کے ساتھ بچھی سنگی بینچ پر موجود تھی۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا اور ضروری کاغذات پر اس کے دستخط لے لئے۔ وہ میری کارروائی سے خاصی مطمئن دکھائی دیتی تھی۔ میں جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا تو وہ میرا بے حد شکریہ ادا کرنے کے بعد بولی۔

''ٹھہریں، میں فیصل کو بھیجتی ہوں۔ وہ آپ کو گاڑی تک چھوڑ آئے گا۔''

اس کی فرمائش پر میں ایک سنگی ستون کے قریب ٹھہر گیا۔ تھوڑی دیر بعد فیصل وارڈ سے نکلا اور بڑے احترام سے اس نے میرے ہاتھ سے بریف کیس لے لیا۔ ہم پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے گاڑی تک پہنچے۔ جب میں گاڑی میں بیٹھنے لگا تو میں نے محسوس کیا، وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر تذبذب کا شکار تھا۔

''ہاں بولو برخوردار! کیا مسئلہ ہے؟'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔''بیگ صاحب! میں نے اس کیس کا ذمہ تو اٹھالیا ہے لیکن ابھی تک آپ کی فیس ادا نہیں کی۔ وہ دراصل، اس وقت میری جیب میں ''

''اس وضاحت کی ضرورت نہیں فیصل!'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔''میں تمہاری حالت اور مجبوری کو سمجھ رہا ہوں۔ ایک بات یاد رکھو! کوئی بھی مقدمہ جیتنے کے لئے جیب میں رقم سے زیادہ دل میں جذبے کا ہونا ضروری ہے اور تمہارا دل اس معاملے میں خاصا زرخیز ہے!'' ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میری فیس کہیں بھاگی نہیں جا رہی۔ تم کل صبح عدالت کے وقت سے پہلے میرے دفتر آجانا۔ تم سے اور بھی بہت سی ضروری باتیں کرنی ہیں۔ فیس والا معاملہ بھی اسی وقت نمٹا لیں گے۔''

وہ ممنونیت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ''ٹاٹا'' کرنے والے انداز میں ہاتھ ہلایا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

جب میں اپنے گھر میں داخل ہوا تو رات کے ساڑھے گیارہ کا وقت تھا۔ میں نے گاڑی کو پورچ میں کھڑا کیا اور اس سے باہر آیا ہی تھا کہ میری سماعت سے فون کی مخصوص گھنٹی کی آواز ٹکرائی۔ مذکورہ گھنٹی گھر کے اندرونی حصے میں بج رہی تھی۔

جب میں فون والے کمرے میں پہنچا تو فون خاموش ہو گیا۔ اس زمانے میں کالر آئی ڈی کی سہولت مہیا نہیں تھی لہٰذا محض گھنٹی کی آواز پر فون سیٹ کو دیکھ کر یہ اندازہ قائم نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کس کا فون ہوگا۔ میں چینج کرنے کے لئے واش روم میں گھس گیا۔

میں لباس تبدیل کر کے واش روم سے نکلا تو فون کی گھنٹی نے استقبال کیا۔ میں نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا اور کان سے لگا کر مخصوص انداز میں کہا۔''ہیلو!''

دوسری طرف سے نادرہ بیگم کی آواز سنائی دی۔''ہیلو بیگ صاحب! آپ کہاں تھے؟ میں ایک گھنٹے سے آپ کو ٹرائی کر رہی ہوں۔''

''آئی ایم سوری۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''میں ابھی ابھی گھر میں داخل ہوا ہوں۔''

''تھانے سے نکلے ہوئے تو آپ کو لگ بھگ دو گھنٹے ہو گئے ہیں!'' وہ حیرت بھرے لہجے میں بولی پھر مذاق کے رنگ میں کہا۔''آپ کا گھر تو کراچی ہی میں واقع ہے ناں؟''

''جی ہاں ... کراچی بھی اب اس حد تک پھیل چکا ہے کہ بعض اوقات ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہوئے ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی اور شہر کی طرف جا رہے ہوں۔'' میں نے عام سے لہجے میں کہا۔''بہر حال، میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں کہیں رک گیا تھا۔''

''آئی سی!'' وہ ایسے انداز میں بولی جیسے اس نے میری بہت بڑی خطا معاف کر دی ہو، پھر پوچھنے لگی۔''کیا آپ کے گھر میں اور کوئی نہیں ہوتا؟ ایک بار بھی کسی نے فون اٹینڈ نہیں کیا۔''

''یہ ایک اتفاق ہے۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔

''خیر!'' وہ فروعی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اصل موضوع پر آ گئی۔ بڑی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ ''تھانے دار صاحب نے مجھے آپ کے فیصلے سے آگاہ کر دیا ہے۔''

''کون سا فیصلہ؟'' میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

''کمال ہے!'' وہ قدرے بلند آواز میں بولی۔ میری سماعت تک پہنچنے والی اس کی آواز کے والیم میں تو کوئی فرق نہیں پڑتا تاہم الفاظ پر ڈالے جانے والے زور سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ تقریباً چیخ پڑی ہو گی۔ ''آپ نے کوئی دس بیس فیصلے تو کرنے نہیں تھے۔'' پھر ذرا توقف کے بعد بولی۔ ''میں راجا کے کیس کی بات کر رہی ہوں۔ آپ نے وہ کیس لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے ناں؟''

میں نے سپاٹ لہجے میں اس کی خوش گمانی کے غبارے میں سے ہوا نکالتے ہوئے کہا۔ ''تھانے دار صاحب نے آپ سے سراسر غلط بیانی کی ہے۔ میں نے ایسا کوئی فیصلہ صادر نہیں کیا۔''

میں دیکھ تو نہیں سکتا تھا تاہم اس بات کا مجھے بخوبی اندازہ تھا، نادرہ بیگم پر جھنجلاہٹ اور حیرت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہوں گے۔ وہ کسی بھی صورت میری طرف سے ایسے جواب کی توقع نہیں کر رہی ہو گی۔

''بیگ صاحب!'' اس کی الجھن زدہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''میں اس وقت مذاق کے موڈ میں بالکل نہیں۔''

''یو آر رائٹ۔'' میں نے گہری سنجیدگی میں کہا۔ ''میں بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ کیونکہ ہمارے درمیان مذاق یا بے تکلفی والا کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔''

''کیا آپ نے تھانے دار کے سامنے کیس لینے کے سلسلے میں رضامندی ظاہر نہیں کی؟'' اس کے لہجے میں جارحیت شامل ہو گئی۔

میں بھی اسے آئینہ دکھانے کے موڈ میں تھا۔ ''ہرگز نہیں!'' میں نے قطعیت سے کہا۔

چند لمحے دوسری جانب خاموشی رہی پھر اس نے غصیلے لہجے میں استفسار کیا۔ ''راجا کا کیس نہ لینے کا سبب کیا ہے؟''

''میں یہ سبب بتانے کا پابند تو نہیں مگر آپ کی خواہش پوری کرتے ہوئے مجھے خوشی ہو گی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ وکالت میرا پیشہ ضرور ہے لیکن اس پیشے سے روزی کماتے ہوئے میں جائز و ناجائز کا بہت خیال رکھتا ہوں۔ آپ

کے پانچ ہزار روپے میری میز کی دراز میں بطور امانت رکھے ہیں۔ جب جی چاہے، دفتری اوقات میں وہ رقم آپ واپس لے سکتی ہیں۔''

''وہ تو میں لے ہی لوں گی۔'' وہ برہمی سے بولی پھر پوچھا۔ ''آپ کے ذہن میں اچانک جائز و ناجائز کا کیڑا کیوں کلبلانے لگا؟''

''اس میں اچانک والی کوئی بات نہیں مسز ہارون!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے آپ کو اپنے پیشے کا وہ اصول بتایا ہے جس پر میں اول روز سے کاربند ہوں۔ اگر مجھے چوروں، ڈاکوؤں اور دیگر جرائم پیشہ افراد کے کیس پکڑنا ہوتے تو ہر روز عدالتوں کے چکر کاٹنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس قسم کے ایک کیس سے سال بھر کی روٹیاں نکل آتی ہیں۔ جرائم پیشہ افراد منہ مانگی فیس دیتے ہیں جس میں ہزاروں اور لاکھوں کا کوئی حساب نہیں ہوتا!''

دوسری جانب یقیناً نادرہ کی حالت ایسی ہو گئی ہو گی جیسے گرم توے پر بیٹھ گئی ہو۔ وہ بولی تو تپش الفاظ کے ذریعے مجھ تک بھی پہنچ گئی۔ غصے میں وہ اُردو کو بھول کر انگریزی پر اتر آئی تھی۔ ''وہاٹ ڈو یو مین؟'' اس نے چلا کر کہا۔

''یہ سیدھا سیدھا اقدام قتل کا کیس ہے۔'' میں نے متحمل انداز میں کہا۔ ''آپ کے صاحب زادے نے دانستہ روبی کو اپنی گاڑی سے کچلنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو اس کی خوش قسمتی ہے کہ بچ گئی آئی ایم سوری، میں آپ کے بیٹے کو بچانے کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ نے مجھ سے جو ان گنت جھوٹ بولے ہیں ان کی قلعی کھل چکی ہے۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ریلی، آئی مین اٹ!''

وہ غضب ناک انداز میں پھنکاری۔ ''اس کا مطلب ہے، آپ مخالف پارٹی سے جا ملے ہیں؟''

''پارٹیوں سے ملنا اور بچھڑنا میرے پیشے کا تقاضا ہے۔'' میں نے کسی قسم کے غصے کا اظہار کیے بغیر مبہم انداز میں کہا۔ ''آپ کی خوشی کی خاطر میں یہ پیشہ ترک کر کے آلو پیاز کا ٹھیلا لگانے سے تو رہا!''

میرے دھیمے اور نوکیلے انداز نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ وہ بھڑک کر بولی۔ ''یو آر اے چیٹر!''

''پسند اپنی اپنی، خیال اپنا اپنا!'' میں نے اس کے غصے کو ہوا دیتے ہوئے معتدل لہجے میں کہا۔ ''اچھا ہوا، ابتدائی مرحلے میں ہی ہمارے راستے جدا ہو گئے۔ ورنہ آپ تو فرما ہی

چکی ہیں..... آئی ایم اے چیٹر!''

''آئی وال سی یو مسٹر بیگ!'' وہ دھمکی دینے والے انداز میں بولی۔

''یو آر آیٔٹ لبرٹی۔'' میں نے سادگی سے کہا۔

''دی بال از تھروان اِن یور کورٹ!''

''وی ول میل میٹ اِن دی کورٹ!''

اس نے یک لخت ٹیلی فونک سلسلہ منقطع کر دیا۔ مجھے یقین تھا، نادرہ بیگم نے ریسیور کو کچھ اس انداز میں کریڈل کیا ہوگا جیسے اسے میرے منہ پر مار رہی ہو!

پندرہ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ تھانہ انچارج کا فون آ گیا۔ ''بیگ صاحب! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟''

''میں نہیں جانتا۔'' میں نے سادہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے بھی بتائیں، کیا سن لیا آپ نے؟''

وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''ابھی ابھی مسز ہارون سے میری بات ہوئی ہے۔''

''اچھا!'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔

وہ بولا۔ ''نادرہ نے بتایا ہے، آپ نے اس کیس سے ہاتھ ہٹا لیا ہے۔''

''آپ نے بالکل درست سنا ہے جناب۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''دراصل میں آپ کی بات کا قائل ہو گیا ہوں۔''

''کیا مطلب، قائل ہو گیا ہوں؟''

''آپ نے وہاں تھانے میں فرمایا تھا کہ یہ حادثہ دراصل اقدامِ قتل ہے لہٰذا راجا کسی بھی صورت بچتا ہوا نہیں لگتا۔ میں بھی تحقیق و تفتیش کے بعد اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔''

''اچھا تو آپ نے اتنی جلدی تحقیق و تفتیش بھی کر لی؟'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

میں نے چوٹ کرنے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ''دراصل میرا تحقیق و تفتیش کا طریقۂ کار پولیس سے بہت مختلف ہے۔ اینی وے۔'' میں نے ایک لمحے کو توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک بات نوٹ کر لیں انچارج صاحب! اس کیس میں اب میں وکیلِ استغاثہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہوں۔''

''آپ بہت خطرناک ہیں بیگ صاحب!'' وہ سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''وہ تو ہے۔''

''آپ نے ہم سے تعاون کرنے کا وعدہ کیا تھا۔'' وہ شکایتی انداز میں بولا۔ ''یہ آپ وعدہ شکن کب سے ہو گئے؟''

میں نے بڑے واضح انداز میں کہا۔ ''میں اب بھی آپ سے بھرپور تعاون کو تیار ہوں۔ بہ شرط یہ کہ آپ اپنے فرائض سے غفلت نہ برتیں۔ وکیلِ استغاثہ اور پولیس کا بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو فیور دیتے ہیں۔''

''اب آپ ہمیں تھانے داری سکھائیں گے؟'' وہ ترشی سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''قبلہ! میں تو آپ کو تعلق داری سکھا رہا ہوں۔ آپ کو اپنا سمجھتے ہوئے ایک مفید مشورہ بھی دینا چاہتا ہوں، اگر آپ کی اجازت ہو تو۔''

''کوئی کسر رہ گئی ہو تو وہ بھی پوری کر لیں۔''

''آپ کی اس بداعتمادی کو دیکھ کر مجھے سخت افسوس ہو رہا ہے!''

''آپ کہیں، کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' وہ بے مروتی سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''آپ کل صبح راجا کو عدالت میں پیش کرنے والے ہیں لیکن ابھی تک آپ نے مضروب روبی کا بیان نہیں لیا۔ اس صورت میں آپ کی پوزیشن خاصی مشکوک اور کمزور ہو جائے گی۔''

میں ایک مخصوص انداز اختیار کرتے ہوئے تھانے دار کو غیر محسوس انداز میں اپنے شیشے میں اتارنے کی کوشش کر رہا تھا اور مجھے اس کوشش میں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہو رہی تھی۔ وہ تشویش ناک لہجے میں بولا۔

''یہ بات میرے ذہن میں بھی ہے لیکن میں کسی بے ہوش شخص کو بیان دینے پر کیسے مجبور کر سکتا ہوں؟'' اس کے لہجے سے برہمی اور بے چارگی ایک ساتھ جھلک رہی تھی۔

میں نے مصلحت کے پیشِ نظر سچ میں جھوٹ کی آمیزش کرتے ہوئے کہا۔ ''روبی کو وارڈ میں منتقل کیا جا چکا ہے۔ وہ لگاتار بے ہوشی میں نہیں ہے۔ وہ مسکّن ادویہ کے سبب گہری غنودگی میں ہے اور کسی وقت آنکھیں کھول کر ایک آدھ بات بھی کر لیتی ہے۔ میں آپ کے پاس سے اٹھ کر سیدھا ہسپتال ہی گیا تھا۔ میں نے روبی سے چند باتیں کی ہیں۔ وہ راجا پر قاتلانہ حملے کا الزام لگا رہی ہے۔ راجا نے دانستہ اسے اپنی گاڑی سے کچلنے کی کوشش کی تھی۔''

میں نے ایک لمحے کا توقف کیا تو ایئر پیس میں تھانے دار کی تشویش میں ڈوبی ہوئی گہری سانس لینے کی آواز ابھری۔ میں نے حصار کی دیوار میں ایک اور ردا چڑھاتے ہوئے کہا۔

''ادھر ہسپتال میں مجھے ایک بھی پولیس والا نظر نہیں آیا۔ روبی کو کسی وقت بھی ہوش آ سکتا

ہے۔ اگر آپ راجا کو عدالت میں پیش کرنے سے پہلے روبی کا بیان قلم بند کرلیں تو آپ کے لئے بہت سی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ ویسے آپ اپنی مرضی کے مختار ہیں۔ مشورہ دینا میرا فرض بنتا تھا کیونکہ عدالت کی نظر میں ہم اب ایک ہی پارٹی ہیں۔ میں سرکاری وکیل نہ سہی مگر وکیلِ استغاثہ تو ہوں۔ میرا خیال ہے، آپ میری بات کو اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے؟''

وہ پُرتفکر انداز میں گویا ہوا تو مجھے اندازہ ہوگیا، میری بات اس کی سمجھ میں بیٹھ گئی تھی۔ ''میں ابھی کسی ذمہ دار پولیس اہل کار کو ادھر ہسپتال میں متعین کرتا ہوں۔ آپ نے بڑا بروقت اشارہ دیا ہے۔''

''میرے ساتھ مل کر چلیں گے تو ایسے مفید اشارے موصول ہوتے ہی رہیں گے انچارج صاحب!'' میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''اب میں آپ سے اجازت چاہوں گا۔''

''وہ بہت برہم ہے۔'' تھانے دار نے زاویہ بدل کر کہا۔

میں سمجھ گیا، وہ نادرہ بیگم کا ذکر کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''لڑکے کی اماں کیا فرما رہی تھیں؟''

''وہ کسی بہت بڑے وکیل کی خدمات حاصل کرنے والی ہے۔'' تھانے دار نے بتایا۔ ''جو کل عدالت میں راجا کا ڈیفنس کرے گا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تو اس کا حق ہے لیکن میں دعوے سے کہتا ہوں، وہ اس سلسلے میں رقم برباد کرنے کے سوا کچھ نہیں کرے گی۔ وہ اگر کسی جج کو بھی وکیل کرے تو بھی میں راجا کو چھوٹنے نہیں دوں گا۔ اس نے بہت برا کیا ہے۔ اور برے کام کا انجام کبھی اچھا نہیں ہو سکتا!''

''وہ کہہ رہی تھی، آپ کو نہیں چھوڑے گی!''

''کیوں جناب! میں نے اس کی کون سی بکری چرا لی ہے؟'' میں نے حیرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''اس نے آج شام اس کیس کے سلسلے میں مجھے جو رقم دی تھی وہ دفتر میں میری میز کی دراز میں جوں کی توں رکھی ہے اور میں نے اس پر واضح کر دیا ہے، وہ جب چاہے اپنی رقم واپس لے سکتی ہے۔ میں کوئی کیس زور زبردستی سے پکڑنے کا پابند تھوڑی ہوں!''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔

میں نے برسبیل تذکرہ پوچھ لیا۔ ''آپ ان پانچ ہزار کا کیا کریں گے جو ''تعاون'' کے سلسلے میں نادرہ نے آپ کی خدمت میں پیش کئے تھے؟''

میں نے لفظ ''تعاون'' پر خاصا زور دیا تو وہ سرسری انداز میں بولا۔ ''پیسے تو خرچ کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ ادھر وہ رقم میری جیب میں پہنچی، اُدھر میں نے خرچ کر ڈالی۔''

اس کے زریں خیالات سے آگاہی حاصل ہونے کے بعد میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ ''اس کا مطلب ہے، آپ اسے ایک پیسہ بھی واپس نہیں کریں گے؟''

وہ بڑے معنی خیز انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''واپسی کا سوال تو اس وقت پیدا ہوگا ناں جب میں نے نادرہ سے کوئی رقم لی ہوگی!''

وہ پانچ ہزار روپے کی وصولی سے صاف منکر ہوگیا تو میں نے ہلکا سا طنز کرتے ہوئے کہا۔ ''ابھی جو آپ نے ''پیسے خرچ کرنے کے لئے ہوتے ہیں'' کا فلسفہ بیان کیا تھا، وہ کیا تھا؟''

''وہ تو میں نے بھائی بندی میں آپ سے بات کی ہے ناں!'' وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔ ''اور آپ بھی اب اس رقم کے ذکر کو فراموش کر دیں۔''

میں نے کہا۔ ''تھانے دار صاحب! میں تو بھائی بندی میں یہ قصہ فراموش کر دوں گا لیکن وہ اللہ کی بندی کسی صورت فراموش نہیں کرے گی۔'' میرا اشارہ نادرہ بیگم کی طرف تھا۔ ''وہ بھری عدالت میں آپ پر رشوت خوری کا الزام لگا سکتی ہے۔''

''لگانے دیں۔'' وہ بے پرواہی سے بولا۔ ''کون ہے جو ہمیں مرتشی نہیں سمجھتا۔ نادرہ کی چیخ و پکار پر عدالت کان نہیں دھرے گی۔ میں بڑے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں، اس نے ہلکی دفعہ لگانے کے لئے ہمیں رشوت کی پیش کش کی تھی لیکن ہم نے صاف انکار کر دیا۔ اور جب ہم راجا کو سزا دلوانے کے حق میں دکھائی دیں گے تو نادرہ کا دعویٰ خود بہ خود دم توڑ دے گا۔''

''ایک کہاوت ہے ..... بد اچھا بدنام برا!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ اس کہاوت کو استعمال کر کے بھی بڑے فائدے میں رہتے ہیں انچارج صاحب!''

میرے اس تبصرے کے جواب میں اس نے فون بند کر دیا۔

✲✲✲

عدالت میں قدم رکھنے سے پہلے میں عموماً تھوڑا وقت اپنے دفتر میں گزارتا ہوں۔

آئندہ روز جب میں دفتر پہنچا تو فیصل کو وہاں موجود پایا۔ میں نے گزشتہ رات ہسپتال میں اس سے کہا تھا کہ وہ صبح دفتر میں آکر مجھ سے ملے اس لئے اس کی آمد پر مجھے حیرت نہ ہوئی۔ میں نے رسمی علیک سلیک کے بعد اس سے روبی کے بارے میں پوچھا۔

اس نے بتایا۔"جب تک میں ہسپتال میں تھا، اسے باقاعدہ ہوش تو نہیں آیا تھا تاہم اس کی حالت تسلی بخش ہے۔ میں ساڑھے بارہ بجے گھر چلا گیا تھا۔ روبی کے پاس آنٹی رک گئی تھی۔"

"صبح تو ہسپتال کا چکر نہیں لگا؟" میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

"میں سیدھا آپ ہی کی طرف آیا ہوں۔" اس نے بتایا۔"یہاں سے فارغ ہونے کے بعد ہسپتال جاؤں گا تا کہ آنٹی نزہت تھوڑا آرام کر سکیں۔ دراصل یہ کام بھی ضروری تھا......"

جملہ ادھورا چھوڑ کر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔

میں بڑی توجہ سے اسے دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کچھ رقم میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔"بیگ صاحب! میں آپ کی فیس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور نہ ہی مجھے عدالت کے اخراجاتی معاملات سے واقفیت ہے۔ یہ دس ہزار روپے ہیں۔ فی الوقت یہی بندوبست ہو سکا ہے۔ میں راجا جیسے شیطان کو عبرت ناک سزا دلوانے کے لئے بائیک تو کیا، خود کو بھی فروخت کر سکتا ہوں۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور اس کے جذبے کی گہرائی سے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔"کیا تم نے اپنی بائیک بیچ کر یہ دس ہزار روپے حاصل کئے ہیں؟"

"مجبوری میں انسان کچھ بھی بیچ سکتا ہے بیگ صاحب!" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔"میں نے پندرہ ہزار کی بائیک کو دس ہزار میں نکال دیا ہے۔ میں نے فیس کے سلسلے میں آپ سے صبح کا وعدہ کیا تھا ناں!"

میں یک ٹک فیصل کو دیکھتا چلا گیا۔ وہ جو بھی قربانی دے رہا تھا، روبی کی خاطر دے رہا تھا۔ اس نے اگر بائیک رکھی ہوئی تھی تو اس کا یہی مطلب تھا، وہ بائیک اس کی ضرورت تھی۔ وہ اسی پر فیکٹری آتا جاتا ہوگا۔ اس نے اپنی آمد و رفت کے ذریعے کو ختم کر دیا تھا تا کہ روبی کو نقصان پہنچانے والا قرار واقعی سزا پائے۔ اس کے جذبے کی شدت کو دیکھ کر مجھے روبی کی عقل پر سخت افسوس بھی ہوا۔ وہ فیصل جیسے ہیرے کو نظر انداز کر کے راجا جیسے پتھر سے جبیں رگڑ رہی تھی!

میں نے بائیک کی فروخت کے سلسلے میں فیصل سے ایک لفظ نہ کہا۔ اس سے کچھ بھی کہنا اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کے مترادف ہوتا۔ ضروری ہدایات کے بعد میں نے اسے اپنے دفتر سے رخصت کر دیا تا کہ وہ بھی کچھ دیر آرام کر سکے۔ وہ میرے ساتھ عدالت جانے پر مصر تھا لیکن میں نے اس کے تیور دیکھتے ہوئے اس کو اجازت نہیں دی۔ وہ روبی کے سلسلے

میں حد سے زیادہ حساسیت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ راجا کو دیکھ کر وہ قابو میں نہیں رہے گا...... اور میں نہیں چاہتا تھا کہ فیصل کوئی ایسی حرکت کرے جس کے سبب وہ قانون کی گرفت میں آ جائے۔

راجا کی اصلی صورت اجاگر ہونے کے بعد روبی کو ایک مخلص اور مضبوط سہارے کی ضرورت تھی اور فیصل سے زیادہ مناسب اور موزوں سہارا اس دنیا میں اس کے لئے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا!

پولیس نے راجا کو عدالت میں پیش کر کے ایک ہفتے کا ریمانڈ حاصل کرنے کے لئے درخواست کی تو میں وہاں موجود تھا۔ تھانے دار کے تعاون کے بعد تمام مراحل بہ آسانی طے ہو گئے۔ ہم آگے پیچھے ہی عدالت میں پہنچے تھے۔ مجسٹریٹ کی آمد سے قبل مجھے تھانے دار سے دو باتیں کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔"ہسپتال کی طرف سے کیا رپورٹ ہے؟"

"روبی کی حالت خطرے سے باہر ہے تاہم ابھی تک اس کا بیان نہیں ہو سکا۔" اس نے بتایا۔"وہ اتنے ہوش میں نہیں آئی کہ اس سے سوال و جواب ممکن ہوں۔ بہرحال، میں نے ڈاکٹر سے رپورٹ بنوالی ہے جس میں روبی کو پہنچنے والے نقصان کی تفصیل موجود ہے۔"

"ویری گڈ!" میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

وہ بولا۔"آپ خوش نصیب ہیں کہ روبی نے آپ نے دو باتیں کر لیں۔"

روبی سے بات چیت کے سلسلے میں، میں نے تھانے دار سے جھوٹ بولا تھا لہٰذا گفتگو کا زاویہ بدلتے ہوئے میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی اور پوچھ لیا۔"نادرہ بیگم کہیں دکھائی نہیں دے رہی اور نہ ہی اس کا وہ قابل وکیل جس کے ذریعے وہ آج راجا کی ضمانت کرائے گی؟"

"شاید اسے عدالت میں پہنچنے میں دیر ہو گئی ہے!"

تھانے دار کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ نادرہ بیگم عدالت کے برآمدے میں نمودار ہوئی۔ نادرہ نے خوب صورت چوڑے بارڈر والی اورنج ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ بالوں کو جوڑے کی صورت میں سنبھال رکھا تھا۔ غیر ضروری میک اپ کے علاوہ حد سے زیادہ طلائی زیورات بھی اس کے بدن پر سجے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بن ٹھن کر کسی شاہی تقریب میں شرکت کرنے آئی ہو۔

اس کے پیچھے جو وکیل نظر آیا اسے میں نے فوراً پہچان لیا۔ وہ اسلم شیخ تھا۔ وہ خاصا

کامیاب وکیل تھا لیکن اس کی شہرت اچھی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ وہ بہت زیادہ معاوضے پر ہر قسم کے کیس پکڑ لیتا تھا۔ اسے اپنے مؤکل کو خواب دکھانے میں ملکہ حاصل تھا۔

مجھے تھانے دار کے ساتھ کھڑے دیکھا تو مسز ہارون نے ہم دونوں پر کھا جانے والی نگاہ دوڑائی اور اپنے وکیل کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ میں نے سرگوشیانہ انداز میں تھانے دار سے کہا۔

''اسلم شیخ اس سے اچھی خاصی رقم بٹورے گا۔ آپ کی تو محض پانچ......''

''جی ہاں...... جی ہاں......'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی جلدی سے بولا۔

اسی وقت مجسٹریٹ اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا اور ہماری چھیڑ چھاڑ کو بریک لگ گئے۔ مجسٹریٹ کیس کی صورت حال کا جائزہ لے چکا تو وکیل صفائی نے بولنا شروع کیا۔

''جناب عالی! یہ ایک سیدھا سادھا روڈ ایکسیڈنٹ ہے لیکن پولیس اسے بڑھا چڑھا کر پیش کر رہی ہے۔ میرا مؤکل سراسر بے قصور ہے لہٰذا اس کی درخواست ضمانت کو منظور کرتے ہوئے اسے رہا کر دیا جائے۔''

میں اپنی مخصوص سیٹ سے اٹھا اور کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''یور آنر! ڈیفنس کونسلر جس واقعے کو اتفاقی حادثہ قرار دے رہے ہیں وہ اقدام قتل کی ایک سنگین واردات ہے۔ حادثے کا شکار ہونے والی بدنصیب روبی ادھر ہسپتال میں، کسمپرسی کی حالت میں پڑی ہے۔ ابھی تک وہ بیان دینے کے قابل بھی نہیں ہو سکی۔''

پھر میں نے روبی کی ٹوٹ پھوٹ کی تفصیل بڑے دردناک انداز میں عدالت کے روبرو پیش کر دی اور آخر میں استدعا کی کہ راجا کی ضمانت منظور کرنا انصاف کے منافی ہوگا۔

مجسٹریٹ نے بھنویں اچکا کر میری طرف دیکھا۔ ڈاکٹر سے حاصل شدہ رپورٹ کا وہ مطالعہ کر چکا تھا۔ اس نے مجھ سے سوال کیا۔ ''بیگ صاحب! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ملزم کو روبی سے کیا دشمنی تھی جو آپ کے بیان کے مطابق، اس نے روبی کو اپنی گاڑی سے کچلنے کی کوشش کی؟''

''ضرور بتا سکتا ہوں جناب عالی! اور جب باقاعدہ عدالتی کارروائی کا آغاز ہوگا تو پوری تفصیل کے ساتھ بتاؤں گا بھی۔'' میں نے متاثر کن انداز میں کہا۔ ''یہ حادثہ ایک سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ ہے۔ روبی نے ہسپتال پہنچتے ہی ڈاکٹر کو اس حادثے کے ذمہ دار اور اس کی گاڑی کے بارے میں بتا دیا تھا۔ میں اس ڈاکٹر کو بھی وقت آنے پر عدالت میں پیش کر سکتا ہوں۔'' پھر میں نے اپنے بیان میں زور پیدا کرنے کے لئے مزید کہا۔ ''میں اس واقعے کے

ایک عینی شاہد کو بھی گواہی کے لئے عدالت میں پیش کر سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے ثبوت و شواہد ہیں جن سے ملزم کا جرم ثابت ہوتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہی کہ یہ شخص......'' میں نے ڈرامائی انداز میں کٹہرے میں کھڑے راجا کی جانب اشارہ کیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ شخص حادثے کے بعد جائے وقوعہ سے فرار ہو گیا تھا۔ اگر یہ کوئی اتفاقیہ حادثہ ہوتا تو اس کا اخلاقی فرض بنتا تھا کہ وہ گاڑی روک کر، حادثے کا شکار ہونے والے کی خبر لیتا اور فوری طبی امداد کے لئے اسے قریبی ہسپتال لے جاتا۔ مگر یہ تو وہاں سے ایسے غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ! پھر پولیس نے اس کی ایجنسی ہی سے اسے گرفتار کیا۔''

وکیل صفائی نے ضمانت کے حق میں بولنا شروع کیا۔ ''جناب عالی! ملزم راجا اس معاشرے کا ایک معزز شخص ہے۔ شہر کے کاروباری علاقے میں اس کی ایک بڑی ٹریول ایجنسی ہے لہٰذا اس کے کہیں بھاگنے یا روپوش ہونے کے امکانات نہیں ہیں۔ میں معزز عدالت سے ایک بار پھر درخواست کروں گا کہ مسٹر راجا کو ذاتی مچلکے پر رہا کر دیا جائے۔ وقت آنے پر میں ثابت کر دوں گا کہ یہ ایک اتفاقیہ حادثہ تھا جیسا کہ کراچی جیسے بڑے شہر کی مصروف سڑکوں پر آئے روز اس قسم کے حادثات پیش آتے رہتے ہیں۔ استغاثہ خواہ مخواہ اس واقعے کو بڑھا چڑھا کر پیش کر رہا ہے۔ میں معزز عدالت کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا مؤکل سراسر بے قصور ہے۔''

''یہ شخص بے قصور کیسے ہو سکتا ہے یور آنر!'' میں نے ایکیوزڈ باکس میں کھڑے راجا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس سے زیادہ سفاک اور قصور وار ملزم کوئی ہو ہی نہیں سکتا جو اپنے دفتر کی ایک مفید ورکر کو سڑک پر تڑپتا چھوڑ کر جائے واردات سے فرار ہو گیا۔ ملزم کا یہ فعل اس کے جرم پر دلالت کرتا ہے۔ راجا نے قتل عمد کے اقدام کا ارتکاب کیا ہے جناب عالی!''

''مفید ورکر!'' مجسٹریٹ نے چونک کر مجھے دیکھا اور الجھے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ روبی، ملزم کی ایجنسی میں ملازم ہے؟''

''آئی مین اٹ یور آنر!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''روبی لگ بھگ ایک سال سے راجا ٹریولز ایجنسی میں ملازمت کر رہی ہے۔ جو شخص پورے ایک سال سے جس صورت کو اپنی ایجنسی میں دیکھتا چلا آ رہا ہو، وہ اسی صورت کو روڈ پر خون میں لت پت چھوڑ کر گاڑی آگے کیسے بڑھا سکتا ہے۔ خاص طور پر جب وہ اسی کی گاڑی سے حادثے

کا شکار ہوئی ہو!'' میں نے تھوڑا توقف کر کے راجا کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا اور دوبارہ مجسٹریٹ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''یور آنر! اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں کہ یہ اقدامِ قتل کا ایک بین کیس ہے۔ تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ ''تھری زیرو سیون'' کے تحت یہ جرم ناقابلِ ضمانت ہے۔ لہٰذا میں معزز عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے ملزم کی درخواست ضمانت کو رد کر کے ملزم کا ریمانڈ جاری کر دیا جائے تاکہ پولیس جلد از جلد تفتیش مکمل کر کے اس مقدمے کا چالان پیش کر سکے۔'' میں نے ایک لمحے کا توقف کیا اور اپنی بات کو فائنل ٹچ دیتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! علاوہ ازیں ملزم راجا اور متاثرہ روبی کے باہمی تعلقات کی کہانی بھی بڑی غور طلب ہے اور اقدامِ قتل پر بھرپور روشنی ڈالتی ہے۔ یہ کہانی مناسب موقع پر میں معزز عدالت کو ضرور سناؤں گا۔''

مجسٹریٹ میرے اس انکشاف پر معنی خیز انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔

''جنابِ عالی! وکیلِ استغاثہ حقائق کو موڑ توڑ کر پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جبکہ میرا مؤکل اس سلسلے میں سراسر بے قصور ہے۔ یہ اقدامِ قتل نہیں بلکہ ایک اتفاقی حادثہ ہے۔''

''کیا آپ کے پاس ملزم کی ضمانت کی حمایت میں کہنے کے لئے کوئی نئی اور ٹھوس بات بھی ہے؟'' مجسٹریٹ نے وکیلِ صفائی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''یا آپ ایک ہی بات کو دہراتے جائیں گے؟''

وکیلِ صفائی نے متاملانہ انداز میں نادرہ بیگم کو دیکھا جو بڑے چاؤ سے اسے وکیل کر کے لائی تھی لیکن یہاں عدالت میں اس کی دال نہیں گل پا رہی تھی۔ میری نگاہ نادرہ کے چہرے کی طرف گئی تو وہاں مجھے پریشانی اور غصے کے ملے جلے تاثرات نظر آئے۔ وہ خاصی برہم دکھائی دیتی تھی۔

وکیلِ صفائی نے نادرہ پر سے نظر ہٹائی اور مجسٹریٹ کے استفسارات کا جواب دیتے ہوئے بولا۔

''جنابِ عالی! اس کیس کو میرے ہاتھ میں آئے ہوئے ابھی چند گھنٹے ہوئے ہیں۔ میں فوری طور پر اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

وکیلِ صفائی کے اس جملے نے نادرہ بیگم کو مایوس کر دیا۔ یہ ایک طرح سے ہتھیار پھینکنے

والی بات تھی۔ وہ بڑی بے دردی سے اپنے ہونٹوں کا سوا ستیاناس مارنے لگی۔ جھنجھلاہٹ اور بےبسی نے اسے پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

مجسٹریٹ نے وکیلِ صفائی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''وکیل صاحب! تو پھر بہتر یہ ہوگا کہ آپ اس کیس کے سلسلے میں ابھی سے مواد جمع کرنے میں لگ جائیں اور پولیس کو اپنا کام کرنے دیں۔''

اس کے بعد مجسٹریٹ نے ایک ہفتے کے ریمانڈ پر راجا کو پولیس کی تحویل میں دیتے ہوئے عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''دی کورٹ از اڈ جارنڈ!''

ہم عدالت کے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئے تو نادرہ بیگم کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے اس سے کہا۔ ''آپ کے پانچ ہزار میں ابھی دے دوں یا آپ بعد میں میرے دفتر تشریف لائیں گی؟''

اس نے گھور کر مجھے دیکھا اور دانت کچکچاتے ہوئے، کچا چبا جانے والے انداز میں بولی۔ ''مسٹر بیگ! تم سے میں بعد میں نمٹوں گی!''

''ایز یو وِش۔'' میں نے کندھے اچکائے اور ایک جانب بڑھ گیا۔

جب میں کورٹ کے کورٹ یارڈ میں پہنچا تو میں نے نادرہ بیگم کو وکیلِ صفائی کے ساتھ تیز لہجے میں بات کرتے ہوئے سنا۔ یقیناً وہ اسلم شیخ کی کلاس لے رہی تھی جس نے ایک تگڑی فیس کے بدلے میں بڑی ڈھیلی ڈھالی وکالت کی تھی۔

میں نے ان کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی گاڑی کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

✲✲✲

ایک ہفتے میں سات دن ہوتے ہیں۔ پولیس کو اپنی تفتیش مکمل کر کے عدالت میں چالان پیش کرنے کے لئے یہ مدت بہت کافی تھی کیونکہ راجا میں زیادہ مزاحمت کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ ماں کی انگلی پکڑ کر جوان ہوا تھا اور اس میں اعتماد کا اس قدر فقدان تھا کہ ذرا ذرا سی بات کے لئے اب بھی وہ ماں ہی کی طرف دیکھتا تھا۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ امان طلب نگاہ سے کیوں دیکھتا تھا، مقصد محض راجا کی شخصیت کی کجی و کمزوری کو ظاہر کرنا ہے۔

نادرہ بیگم اس کی نجات کے لئے جو حیلہ وسیلہ کر رہی تھی وہ راجا کی نظر سے اوجھل نہیں تھا اور وہ اس چارہ جوئی کے نتائج کو بھی ملاحظہ کر رہا تھا۔ [illegible] آج کی عدالتی کارروائی

نے پوری کر دی تھی۔

پھر اسی روز دوپہر کے بعد روبی بھی باقاعدہ ہوش میں آ گئی اس نے دو ڈاکٹروں کی موجودگی میں اپنا مختصر سا بیان قلم بند کروایا جس میں اس نے راجا کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے بتایا کہ اس نے دانستہ اسے اپنی گاڑی سے کچلنے کی کوشش کی تھی۔ روبی کے بیان میں بڑی طاقت تھی۔ راجا کے پاس مزاحمت کی گنجائش باقی نہ رہی۔ حالات و واقعات نے اسے اس بری طرح جکڑ لیا کہ وہ ہتھیار پھینکنے پر مجبور ہو گیا۔ جب اسے اپنے بچاؤ کی کوئی صورت دکھائی نہ دی تو پولیس کسٹڈی میں اس نے دوسرے روز اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ اس اقبالِ جرم میں حالات کے سنگین حقائق کے ساتھ ساتھ پولیس تفتیش کا بھی پورا ''ہاتھ'' تھا۔

میں نے عدالت میں اس واقعے کے جس عینی شاہد کا ذکر کیا تھا اسے پیش کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ویسے میں نے سوچ رکھا تھا اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں فیصل کو عینی شاہد کی حیثیت سے آگے بڑھا دوں گا۔ اس سلسلے میں، میں نے فیصل سے بات بھی کر لی تھی۔ وہ راجا کے لئے اپنے دل میں نفرت کا ایک طوفان سمیٹے بیٹھا تھا۔ اس نوعیت کی گواہی کے لئے وہ فوراً تیار ہو گیا تھا۔

راجا نے پولیس کی تحویل میں جو اقبالی بیان دیا اس میں اس نے اپنے جرم کا اقرار کرتے ہوئے بتایا تھا کہ روبی کی وجہ سے وہ بہت پریشان تھا۔ اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ اس سے نجات حاصل کر لے۔ تاہم اپنے اور روبی کے باہمی تعلقات کے حوالے سے اس نے سچ سے زیادہ جھوٹ کا سہارا لینے کی کوشش کی تھی اور یہ کوئی فکر والی بات نہیں تھی۔ میں عدالت کے کمرے میں سیاہ و سفید کو بڑی آسانی سے الگ کر کے دکھا سکتا تھا۔

ریمانڈ کی مدت ختم ہونے میں ابھی دو دن باقی تھے کہ تھانہ انچارج نے مجھے فون کیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد وہ مطلب کی بات پر آ گیا۔ اس کا انداز خاصا مبہم تھا۔

''بیگ صاحب! میں آپ کی طرح کوئی قانون دان تو نہیں لیکن اس سلسلے میں چند کتابیں تو میں نے بھی پڑھ رکھی ہیں۔''

''آپ کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہیں جناب!'' میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''قانون سے گہری واقفیت رکھے بغیر کوئی پولیس والا تھانہ انچارج کے عہدے تک کیونکر پہنچ سکتا ہے؟''

''آپ کی ذرہ نوازی ہے بیگ صاحب!'' وہ گھماؤ پھراؤ کو چھوڑ کر سیدھا ہو گیا۔ ''میں دراصل پی پی سی (پاکستان پینل کورٹ) کی دفعہ تین سو سات کے بارے میں آپ سے تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔''

''یہ دفعہ قتل کے اقدام کے سلسلے میں عائد کی جاتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''میرا خیال ہے، یہ دفعہ قابل راضی نامہ ہے۔'' وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔ ''آپ کیا کہتے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''آپ کا خیال بالکل درست ہے جناب! واقعی اس دفعہ کے تحت فریقین میں تصفیہ ہو سکتا ہے اور سزا کی صورت میں جرم ثابت ہونے پر مجرم کو دس سال کی قید بامشقت دی جاتی ہے۔''

تھانے دار کے استفسار نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ راجا کے خلاف مجسٹریٹ کی عدالت میں جو کیس زیرِ سماعت جانے والا تھا وہ بھی اسی دفعہ کے زیرِ اثر تھا۔ میں ایک لمحے میں اس کے مقصد کی تہ میں پہنچ گیا۔

جب کوئی ملزم ریمانڈ پر پولیس کی تحویل میں جاتا ہے تو یہ عرصہ پولیس کے لئے ایک گولڈن پیریڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ الزام شدہ پارٹی سے بڑی بڑی ڈیلز کرتے ہیں اور اپنے ہاتھ پاؤں بچاتے ہوئے جیب گرم کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ مجھے شک ہوا کہ نادرہ بیگم اور تھانے دار کے درمیان بھی کہیں کوئی ایسا معاملہ تو نہیں چل رہا!

''پھر کیا خیال ہے بیگ صاحب؟'' تھوڑے توقف کے بعد تھانے دار نے پوچھا۔ ''راضی نامہ میں ہماری پارٹی کا زیادہ بھلا نہیں ہے؟''

''کیا اس سلسلے میں نادرہ نے آپ سے رابطہ کیا ہے؟''

''ربط و ضبط دو دن سے چل رہا ہے۔'' اس نے بتایا تو میں نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے وہ اسلم شیخ کی کارکردگی سے مایوس ہو گئی ہے!''

''صورتِ حال ایسی ہے کہ کوئی بھی وکیل راجا کو سزا سے نہیں بچا سکتا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اور یہ سنگین حقیقت نادرہ نے محسوس کر لی ہے۔''

''ہوں!'' میں ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

وہ بولا۔ ''اگر ہم اس کیس کو آگے بڑھاتے ہیں تو راجا عدالت سے سزا پا کر چند سال کے لئے جیل چلا جائے گا۔ اس صورت میں روبی اور اس کے لواحقین کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچے گا۔ جب کہ انہیں ہر صورت میں ایک بڑا فائدہ پہنچنا چاہئے۔ آپ میری بات سمجھ رہے

ہیں نا! مجھے روبی سے گہری ہمدردی ہے۔"

میں اس کی بات کو واقعی بڑی اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ روبی سے زیادہ اپنے پیٹ سے ہمدردی کرنے کی کوشش میں تھا۔ وہ نادرہ بیگم سے پانچ ہزار روپے تو پہلے ہی وصول کر چکا تھا، اس ڈیل کے سلسلے میں اتنی ہی یا اس سے زیادہ رقم مزید بٹور سکتا تھا۔ میں نے اس کے خیالات جاننے کے لئے پوچھا۔

"اگر ہماری پارٹی راضی نامے کے لئے تیار ہو جاتی ہے تو نادرہ بیگم فراخ دلی میں کہاں تک جا سکتی ہے؟"

"دس ہزار تو اس نے اپنے منہ سے کہے ہیں!"

"یہ رقم بہت کم ہے۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "روبی ابھی ہسپتال میں ہے اور اسے اپنے قدموں پر کھڑا ہونے میں ڈیڑھ دو مہینے لگ جائیں گے۔ دس ہزار سے کہیں زیادہ تو اس کے علاج معالجے پر اٹھ جائیں گے۔ نادرہ بیگم حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر کیا ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہے؟" میں ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "روبی کو بھیک میں دس ہزار روپے نہیں چاہئیں تھانے دار صاحب!"

وہ فریق مخالف کی حمایت کرتے ہوئے بولا۔ "راجا کو سزا کی صورت میں تو عدالت روبی کو اتنی رقم بھی نہیں دلوا سکے گی۔"

میں نے سمجھ لیا کہ تھانے دار نے نادرہ سے ٹھیک ٹھاک رقم ہیٹ لی ہے۔ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میرا خیال ہے راجا کو عدالت سے سزا ہو ہی جانے دیں۔ پانچ دس ہزار اگر روبی کو نہیں ملیں گے تو وہ مر نہیں جائے گی۔"

"پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

"کم از کم پچاس ہزار!" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

"یہ تو بہت زیادہ ہوں گے۔" وہ تشویش ناک لہجے میں بولا۔ "وہ آپ کی اور میری خدمت بھی کرنا چاہتی ہے۔"

میں نے جلدی سے کہا۔ "مجھے تو معاف ہی رکھیں انچارج صاحب! البتہ، آپ جو بھی خدمت خاطر کروائیں گے اس پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔

"آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ان پچاس ہزار کے بدلے راجا کی زندگی کے کئی سال [illegible] سال میں اپنی ایجنسی سے جتنی رقم

کمائے گا، یہ پچاس ہزار تو اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہیں۔"

بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ مفاہمت آمیز انداز میں بولا۔ "ٹھیک ہے، میں نادرہ بیگم سے بات کر لیتا ہوں۔"

مجھے امید تھی، میں نزہت اور فیصل سے جو بھی بات کروں گا اور انہیں جو بھی سمجھانے کی کوشش کروں گا وہ اس سے انکار نہیں کریں گے۔ انہوں نے مجھے اپنا سچا ہمدرد اور خیر خواہ سمجھتے ہوئے سارے معاملے کو مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ میں جو بھی فیصلہ کرتا، وہ ان کے حق اور مفاد کے پیش نظر رکھتے ہوئے ہی کرتا۔

میں نے بڑے واضح انداز میں تھانے دار سے کہا۔ "انچارج صاحب! اگر میری بات نادرہ بیگم کی سمجھ میں آ جائے تو آپ کل اسے میرے دفتر میں لے آئیں.... رقم سمیت! میں روبی کی ماں نزہت کو بھی وہیں بلا لوں گا۔ لہٰذا نادرہ سے فائنل کرتے ہی آپ مجھے فون کرنا نہیں بھولیں گے!"

"او کے بیگ صاحب..... خدا حافظ!"

میں نے بھی "اللہ حافظ" کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

❊❊❊

آئندہ روز تھانے دار نادرہ بیگم کے ساتھ میرے دفتر میں موجود تھا۔ اس نے حسب وعدہ آج صبح ہی مجھے اس پروگرام سے آگاہ کر دیا تھا۔ میں نے فیصل کو فون کر کے نزہت کو اپنے ساتھ لانے کو کہہ دیا تھا اور وہ دونوں تھانے دار وغیرہ کے آنے سے پہلے میرے پاس پہنچ گئے تھے۔ فیصل، راجا کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچانے کے لئے بڑا بے چین تھا لیکن میرے سمجھانے پر وہ شانت ہو گیا۔ میں نے اسے حقائق کا سیدھا رخ دکھاتے ہوئے روبی کے باپ کی بیماری، اس کی ماں کی بے بسی اور خود روبی کے علاج کے سلسلے میں ہونے والے اخراجات کے بارے میں بتایا تو وہ میری بات سے اتفاق کرنے پر مجبور ہو گیا۔

اس حوالے سے نزہت نے بھی اس پر زور دیا تھا۔ "فیصل بیٹے! مقدمے بازی کر کے خواہ مخواہ دشمنی بڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ نادرہ بڑی کینہ پرور اور منتقم المزاج عورت ہے۔ اگر اس کا بیٹا جیل چلا گیا تو وہ ہمیں دیگر حیلوں وسیلوں سے تنگ کرنے کی کوشش کرے گی۔ میں اس طاقتور عورت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ابھی تو وہ اپنی مرضی سے صلح صفائی پر تیار ہوئی ہے، ہمیں وکیل صاحب کی بات مان لینی چاہئے۔"

میں اس کیس کو ایک اور پہلو سے بھی دیکھ رہا تھا۔ تھانے دار اس معاملے میں اپنی پیدا کے چکر میں پوری طرح اتو الو ہو چکا تھا۔ اگر نادرہ کی پیشکش کو ٹھکرا کر ہم تھانے دار کی متوقع آمدنی کا راستہ روک دیتے تو وہ بعد میں نزہت اور روبی کو کسی خفیہ ذریعے سے بھی پریشان کر سکتا تھا۔ اس معاملے کا آسان اور مناسب حل یہی تھا کہ وہ اپنا نقصان پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ایک معقول ہرجانہ وصول کر کے خاموشی اختیار کر جائے۔

اس روز میرے دفتر میں ایک گھنٹے کی میٹنگ کے بعد تمام معاملات طے ہو گئے۔ میں نے پکے کاغذ پر راضی نامے کی دستاویز تیار کر کے فریقین کے دستخط لے لئے۔ گواہوں کے سلسلے میں، میں نے فیصل اور اپنی سیکرٹری کا نام ڈال دیا۔ نادرہ بیگم اٹھ کر جانے لگی تو میں نے دراز میں سے اس کے پانچ ہزار روپے نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ آپ کی امانت میرے پاس رکھی تھی۔ وصول کر لیں۔''

''اس پر آپ کا حق ہے بیگ صاحب!'' وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

''میرا حق؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''میں تو اس کیس میں وکیلِ استغاثہ تھا۔''

تھانے دار نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔ ''رکھ لیں بیگ صاحب! نادرہ بیگم اپنے بیٹے کی نجات کے سلسلے میں مٹھائی کے لئے دے رہی ہیں۔''

نادرہ نے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ چاہے وکیلِ استغاثہ ہی سہی لیکن آپ کی وکالت سے مجھے بھی فائدہ پہنچا ہے۔ آپ ان پانچ ہزار کو ''راضی نامے'' کی فیس سمجھ کر رکھ لیں۔ اب ہمارے درمیان کوئی رنجش نہیں ہے۔''

یہ وہی نادرہ بیگم تھی جو چند روز پہلے فون پر مجھے خطرناک دھمکیاں دے رہی تھی اور وہ بھی انگریزی میں۔ انسان کو بدلتے ہوئے کتنی دیر لگتی ہے، اس کا اندازہ مجھے بخوبی ہو رہا تھا۔

جب میرے دفتر میں فیصل اور نزہت رہ گئے تو میں نے فیصل والے دس ہزار بھی دراز سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔

''یہ کیا بیگ صاحب؟'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ ''یہ رقم تو میں نے آپ کو فیس کی مد میں دی تھی!''

''میں نے اس کیس میں بہت تھوڑا کام کیا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اور اس کے لئے میں نادرہ بیگم سے فیس وصول کر چکا ہوں تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا

ہے ناں!''

''ہم...... مگر......'' وہ حیرت کی شدت سے ہکلاہٹ کا شکار ہو گیا۔

میں نے جلدی سے کہا۔ ''اگر مگر کچھ نہیں فیصل! میں صرف تم سے اس اسٹیمپ پیپر کی قیمت وصول کروں گا جس پر راضی نامہ تیار ہوا ہے۔ اس طرح دونوں پارٹیوں کی شرکت ہو جائے گی۔''

فرطِ جذبات سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ''بیگ صاحب! آپ بڑے عجیب و غریب وکیل ہیں۔''

''اور تم بھی کچھ کم عجیب و غریب محبت کرنے والے نہیں ہو۔''

اس نے خاموشی سے گردن جھکا لی۔

میں نے نزہت سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ کو معلوم ہے، فیصل نے ان دس ہزار روپے کا کہاں سے بندوبست کیا تھا؟''

''نہیں......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں نے حقیقت نزہت پر آشکار کی تو وہ محبت بھری عقیدت سے فیصل کو دیکھنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''نزہت بی بی! فیصل سے اچھا داماد آپ کو پوری دنیا میں کہیں نہیں ملے گا اور یہ بات آپ اپنی بیٹی کو بھی سمجھانے کی کوشش کریں۔''

روبی کی آنکھیں کھل گئی ہیں وکیل صاحب!'' نزہت ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''اسے صورتِ حال کا علم ہو گیا ہے۔ راجا سے شدید نفرت کرنے کی وجہ سے اس کے دل میں فیصل کے لئے جگہ پیدا ہو گئی ہے۔''

''چلیں اچھی بات ہے، اب اس جگہ کو وسعت فیصل خود دے لے گا۔'' میں نے پُر سوچ انداز میں کہا۔ ''کچھ لوگ شامتِ اعمال کے سبب نقصان اٹھاتے ہیں اور بعض شامتِ مال کی وجہ سے پریشانیوں میں گھر جاتے ہیں۔ روبی کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی خواہشات نے اسے یہ جھٹکا لگایا ہے۔ مجھے امید ہے وہ اس جھٹکے کے بعد سنبھل جائے گی۔''

''آپ اس راضی نامے کا کیا کریں گے؟'' فیصل نے پوچھا۔

میں نے بتایا۔ ''آئندہ پیشی پر میں اسے عدالت میں داخل کروں گا۔ مجسٹریٹ فریقین سے تصدیق کے بعد کیس خارج کر دے گا۔''

وہ دونوں مجھے دعائیں دیتے ہوئے دفتر سے رخصت ہو گئے۔

میں نے اس کیس میں جو بھی کردار ادا کیا، ممکن ہے بعض لوگوں کو اس پر اعتراض ہو۔

اعتراض کرنا ہر شخص کا حق ہے۔ لیکن جاتے جاتے یہ بھی بتاتا جاؤں کہ قانون کی بعض دفعات میں لچک رکھ کر انہیں قابل راضی نامہ محض اس لئے بنایا گیا ہے کہ حالات اور مواقع کی مناسبت سے متاثرہ پارٹی کو زیادہ فائدہ پہنچایا جا سکے۔

قانون سازی کوئی ذہنی کھیل نہیں۔ یہ انسانی نفسیات اور اس کی مجبوریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ترتیب دیا جاتا ہے۔ بشری کمزوریوں اور خامیوں سے انکار ممکن نہیں۔ میرا خیال ہے، میں نے روبی اور اس کے لواحقین کو ایک بڑا فائدہ پہنچا کر کچھ غلط نہیں کیا۔

آپ کیا فرماتے ہیں، بیچ اس مسئلے کے؟

(ختم شد)